تاریخ
دعوت وعزیمت
مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
جلد دوم
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات مجلس
۴۹

اُدعُ إلى سبيلِ ربِّك بالحكمةِ والموعظةِ الحسنةِ

تاریخ دعوت و عزیمت

حصۂ دوم

یعنی آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے سوانح حیات، ان کے صفات و کمالات، ان کی علمی و تصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی و اصلاحی کام اور ان کی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف، اور ان کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

۱۵واں ایڈیشن

۱۴۳۱ھ ۲۰۱۰ء

نا کتاب .... تاریخ دعوت وعزیمت (دوم)

نام مصنف .... مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

کتابت .... ظہیر احمد کاکوروی مرحوم

صفحات ۴۱۲

طباعت .... کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ

تعداد اشاعت ۱۰۰۰

قیمت۔

طابع وناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، فون: 0522-2741539

فیکس نمبر: 0522-2740806، ای۔میل: info@airpindia.com

فہرست مضامین

تاریخ دعوت وعزیمت حصۂ دوم

۳۔ غیر اسلامی ملل وفرق کی تردید اور ان کے عقائد ورسوم واثرات کا مقابلہ ۲۵۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

الحمد للہ کہ ناظرین کے سامنے "تاریخ دعوت وعزیمت" کا دوسرا حصہ پیش کرنے کی سعادت ومسرت حاصل ہو رہی ہے "الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات"۔

کتاب کی پہلی جلد میں پہلی صدی ہجری سے لے کر نویں صدی ہجری تک کی روداد اصلاح ودعوت تھی، شخصیتوں کے لحاظ سے سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر مولانا جلال الدین رومیؒ تک اصحاب دعوت و عزیمت کا تعارف اور ان کے مصلحانہ واولوالعزمانہ کارناموں کی تفصیل آگئی تھی۔

اس دوسری جلد میں حسب وعدہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی سوانح حیات اور ان کے تلامذہ اور ان کے دبستانِ فکر کے فضلاء کا تذکرہ ہے، ابتدائی خاکہ کے مطابق یہ جلد اس دور اور اس مدرسۂ فکر کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی، اور اسی انداز سے لکھنا شروع کیا تھا، یہاں تک کہ صرف شیخ الاسلام کے تذکرہ نے مسودہ کے تقریباً دو سو صفحات گھیر لئے، ابھی ان کے اصلاحی وتجدیدی کارناموں اور ان کے اثرات کا تذکرہ باقی تھا کہ پہلی جلد پر تبصرہ کرنے والوں میں سے بعض نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ اس زمانہ کی کم فرصتی اور اختصار پسندی کے پیشِ نظر کتاب میں اختصار سے کام لیا جائے اور کتاب کے پیمانہ کو کچھ محدود کر دیا جائے، اس کا تقاضا تھا کہ شیخ الاسلام کے تذکرہ میں بھی تلخیص وانتخاب سے کام لیا جائے، تاکہ اس جلد میں

دوسرے اصحاب "دعوت و عزیمت" کی جگہ نکل سکے، مصنف نے (جو اس دور کے رجحانات سے ناواقف نہیں) اس کا ارادہ بھی کیا، لیکن جب تذکرہ پر نظر ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ بہت کارآمد اور قیمتی مواد فراہم ہو گیا ہے، جو اپنی جگہ پر مفید اور ضروری ہے جس طرح بعض گوشوں سے اختصار کا مشورہ دیا گیا ہے، اسی طرح بعض اہلِ خلوص و اہلِ طلب نے تفصیل کا مطالبہ کیا ہے، اور بہت اصرار سے کہا ہے کہ اس باب میں قطعاً اختصار سے کام نہ لیا جائے، بالآخر طبیعت نے یہی فیصلہ کیا کہ اس حصہ کو یوں ہی رہنے دیا جائے اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کو قلمزد نہ کیا جائے کہ یہ علمی کام روز روز نہیں ہوتے، اور طبیعت کے نشاط و انبساط، فرصت کے لمحات اور قلم کی روانی کا کچھ بھروسہ نہیں، کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد اپنے اپنے ذوق کے مطابق لوگ خود انتخاب و تلخیص کا کام کر سکتے ہیں۔

اس دوسری جلد کی اشاعت کے موقع پر اس کی حسرت اور دلی قلق ہے کہ فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا شاہ حلیم عطا موجود نہیں جو اس سلسلہ کے سب سے بڑے قدرداں اور مؤید تھے، پہلی جلد شائع ہوئی تو سب سے زیادہ مسرت کا اظہار مولانا گیلانی نے فرمایا، کتاب کا لفظ لفظ ذوق و شوق سے پڑھا اور بڑے جوش و اثر کا خط لکھا، مرحوم اگرچہ (ہمارے علم میں) شیخ اکبر کے علوم کے ہندوستان میں بہت بڑے عارف و حامل تھے لیکن بایں ہمہ شیخ الاسلام کی امامت و عظمت کے قائل، ان کے بڑے مرتبہ شناس اور ان کی تصنیفات کے بڑے شائق تھے، یقین ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس حصہ کی اشاعت سے ان کو بڑی مسرت ہوتی۔

مولانا شاہ حلیم عطا نے زندگی گوشۂ گمنامی میں گزاری اور اہلِ علم نے بھی ان کو بہت کم جانا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس تختی برّ اعظم (ہندوستان و پاکستان) میں شیخ الاسلام اور ان کے تلامذہ کے علوم پر ان سے زیادہ کسی کو عبور نہ تھا، وہ ان کی تصنیفات و تحقیقات کا ایک زندہ دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تھے، اگرچہ پہلی جلد بھی ان کی رہنمائی و اعانت سے محروم نہیں رہی لیکن اس دوسری جلد میں تو ان کی وسیع

معلومات، ان کا قوی حافظہ اور ان کا قیمتی کتب خانہ مصنف کا مشیر و رفیق رہا ہے، اور اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں ان کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ شکر و اعتراف کے بلند سے بلند لفظ اس کے لئے کفایت نہیں کرتے اس دور آخر میں یہ دونوں بزرگ علمائے سلف کے علمی شغف و انہماک، وسعتِ نظر، ذوقِ مطالعہ اور علمی فنائیت کی یادگار تھے" غفر اللہ لھما ورفع درجاتھما"

قدیم مآخذ کے علاوہ اس حصہ کی تالیف میں مصری فاضل شیخ محمد ابو زہرہ کی کتاب "ابن تیمیہؒ" سے بڑی مدد ملی، اس کا اعتراف اور شکر واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ جلد اول کی طرح یہ جلد ثانی بھی ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں مقبول ہوگی، اور ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی۔

ابوالحسن علی

دائرہ شاہ علم اللہؒ۔ رائے بریلی

۱۷ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رح

شریعت کے ترجمان اور ایک ہمہ گیر مصلح کی ضرورت

الٰہیات و عقائد میں تفلسف و یونانیت اور متکلمین کی عقلی ظاہریت کے خلاف ایک ردِ عمل وہ تھا، جس کے علمبردار مولانا جلال الدین رومی تھے، یہ ایک خام و سطحی عقلیت کے مقابلہ میں ایک بلند تر عقلیت اور پختہ تر فکر و نظر کا مظاہرہ تھا، اور ایک نئے علم کلام کا افتتاح جس کی بنیاد قلب و نظر کی بلندی و پاکیزگی اور متکلم کے ذاتی تجربہ پر تھی، مولانا روم اپنے وقت کے ایک متبحر عالم اور کہنہ مشق متکلم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عارفِ قلب اور عاشق طبیعت عطا فرمائی تھی، فلاسفہ کی سخن سازیوں اور متکلمین کی موشگافیوں سے ان کی طبیعت سرد اور بیزار ہو چکی تھی، ایک صاحبِ یقین اور صاحبِ عشق کی صحبت اور ریاضت و مجاہدہ نے ان کو اس مقام تک پہنچا دیا، جہاں سے ان کو علم کلام کی ان معرکہ آرائیوں میں حقیقت کم، اور ذہانت و خطابت زیادہ نظر آئی، اس مقام پر پہنچ کر انھوں نے دینی حقائق کو اپنی زبان میں بیان کیا، اور ان کے ثبوت کے لئے وہ راستہ اختیار کیا جو حقیقت سے زیادہ قریب اور وجدان و تجربہ پر مبنی تھا۔

لیکن فلسفہ کی اس سرکشی اور علم کلام کی اس بے اعتدالی کے خلاف ایک ردِ عمل اور بھی ضروری تھا، جو سابق الذکر ردِ عمل کے مقابلہ میں کچھ کم حق بجانب نہ تھا، فلسفہ (الٰہیات) اور علم کلام کا موضوعِ بحث اللہ کی ذات و صفات کے مسائل تھے، شریعتِ اسلامیہ نے عقائد کے بارہ میں انسان کو تاریکی میں

نہیں چھوڑا، بلکہ چونکہ یہ شعبہ پوری زندگی، اعمال واخلاق اور صحیح تمدن ومعاشرہ کی بنیاد ہے، اس لئے اس نے تمام مذاہب سابقہ سے کہیں زیادہ اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات کے متعلق ایسی واضح، عام فہم اور فیصلہ کن تعلیم دی، جس کے بعد اس سلسلہ میں کسی محنت درد سری اور کسی قیاس آرائی کی ضرورت نہیں تھی، اس علم ویقین کا سرچشمہ اور ماخذ صرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے، انھوں نے جو کچھ کہہ دیا اور جتنا کہہ دیا، وہ حرفِ آخر ہے کہ وہی اس وراء الوراء ہستی اور اس کے ناقابلِ قیاس وبے مثال صفات کے عارف ہیں، فلسفہ کو اس موضوع پر گفتگو کرنے اور فریق بننے کا کوئی حق نہ تھا کہ اس کو اس علم کے مبادی اولیہ بھی حاصل نہ تھے اور نہ وہ معلومات جن کو ترتیب دے کر وہ مجہول تک پہنچا کرتا ہے، نہ یہاں کسی تجربہ اور تحلیل وتجزیہ کی گنجائش تھی، اور نہ اہلِ فلسفہ میں اس کی صلاحیت لیکن فلسفہ نے اپنے حدود سے تجاوز کیا، اور اس موضوع میں نہ صرف دخل دیا بلکہ اس کے مسائل وجزئیات میں اس وثوق وتحکّم اور اس تفصیل وتدقیق سے بحث کی اور اس تحلیل وتجزیہ سے کام لینا شروع کیا جو صرف ایک کیمیاوی معمل میں انجام دیا جاسکتا ہے۔

فلسفہ کے مقابلہ اور مذہب کی حمایت کے لئے علم کلام وجود میں آیا اور ایسا ہونا ضروری تھا لیکن اس میں رفتہ رفتہ خود فلسفہ کی روح گھس گئی، اور وہ ایک مذہبی فلسفہ بن کر رہ گیا، وہی اس کا موضوع، وہی طریقِ بحث واستدلال، اور وہی بنیادی غلطی کہ ذات وصفاتِ الٰہی اور ماوراءِ عقل مسائل کو عقل سے ثابت کیا جاسکتا ہے، وہی انبیاء علیہم السلام کی تعبیرات وتشریحات پر عدم قناعت، وہی محدود وناقص اور غلط فہمی پیدا کرنے والے یونانی اصطلاحات کا استعمال، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسائل سلجھنے اور بات مختصر ہونے کے بجائے زیادہ پیچیدگی اور طوالت پیدا ہوتی چلی گئی، اور ذات وصفات کے نہایت سادہ، موثر اور دل آویز بیان کے متوازی جس میں دلوں میں ایمان واذعان پیدا کرنے اور ہر زمانہ کے دماغوں کو تسکین دینے کی پوری صلاحیت تھی، اور وہ کتاب وسنت کے نصوص پر مبنی تھا، ایک طویل پرپیچ فلسفۂ الٰہیات اور ایک ضخیم "شرحِ عقائد" تیار ہوگئی جس پر باوجود فلسفۂ یونان کے حریف ومقابل ہونے کے یونانی فکر

کا اچھا خاصا اثر پڑ چکا تھا، اس صورتِ حال کے خلاف کتاب و سنت کی روح ہمیشہ احتجاج کرتی رہی، امت کا ایک اچھا خاصا گروہ ان فلسفیانہ تفصیلات اور متکلمانہ تاویلات کا مخالف رہا لیکن کتاب و سنت کی صحیح و مؤثر ترجمانی کے لئے ایک ایسے قوی الایمان، وسیع العلم اور دقیق النظر عالم کی ضرورت تھی جو "علیٰ وجہ البصیرۃ" اس پر ایمان راسخ رکھتا ہو کہ کتاب و سنت کے نصوص اور ذات و صفات کے بارہ میں اس کے بیانات و تعبیرات بالکل کافی و شافی ہیں، جو اپنی ذہانت و مطالعہ سے فلسفہ کے رگ و ریشہ سے واقف ہو چکا ہو، حکمائے یونان کے اقوال و خیالات اور ان کے مذاہبِ فکریہ کی علمی تنقید کرسکتا ہو اور ان کی بنیادی کمزوریوں سے واقف ہو، جو اپنے غور و فکر سے علم کلام کی تہ تک پہنچ چکا ہو، مذاہب و فرق اسلامیہ کے دقیق اختلافات سے واقف ہو، علم کلام کی پوری تاریخ اور اس کے ارتقاء پر اس کی نظر ہو، اور اس پورے مطالعہ و تجربہ سے اس کے اندر کتاب و سنت کے نصوص اور مسلکِ سلف پر صد درجہ کا وثوق و اعتماد اور اس کی حمایت و ترجمانی کا جوش اور عزم پیدا ہو چکا ہو اور وہ عقلی حیثیت سے بھی اس کی ترجیح اور اس کی برتری ثابت کرنے کے لئے بےچین ہو، پھر اس نازک اور عظیم الشان کام کے لئے اس کے پاس وہ تمام وسائل اور صلاحیتیں ہوں، جو اتنے بڑے کام کے لئے درکار ہیں، وہ اپنی ذکاوت، قوتِ استدلال، قوتِ بیانیہ، وسعتِ نظر، کثرتِ مطالعہ میں بھی ممتاز اور اپنے زمانہ کی سطح سے بلند ہو، اور ہر طرح سے اس خدمت کا اہل ہو۔

دوسری طرف اسلام اندرونی اور بیرونی حملوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا، عیسائیوں میں اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے اور اسلام پر اعتراضات کرنے کی نئی تحریک پیدا ہوئی تھی، صلیبیوں کے پے در پے حملوں اور شام و فلسطین و قبرص میں مغربی النسل عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی نے ان میں اس کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے علمی مقابلہ کریں، نبوتِ محمدیؐ پر اعتراضات اور اپنے مذہب کی ترجیح پر کتابیں تصنیف کریں، اس کا جواب دینے کے لئے بھی ایک ایسے عالم و متکلم کی ضرورت تھی جو مسیحیت اور دوسرے مذاہب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کر چکا ہو، صحفِ سماوی اور ان کی تبدیلیوں اور تحریفات پر

پوری نظر رکھتا ہو، مذاہب کے تقابل و موازنہ کا کام بڑی خوبی سے انجام دے سکتا ہو اور اسلام کی صداقت و برتری کو طاقتور و مؤثر علمی انداز میں ثابت کرسکتا ہو، اور حکمت و قوت کے ساتھ دوسرے مذہب کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے سکتا ہو۔

ان عیسائی مناظرین و مصنفین کے حملہ سے زیادہ خطرناک حملہ ایک نام نہاد "اسلامی فرقہ" باطنیہ کا تھا، جن کا مذہب اور جن کی تعلیمات مجوسی عقائد، افلاطونی تصورات اور خطرناک سیاسی اغراض کا عجیب و غریب مجموعہ تھا، یہ اور اس کی مختلف شاخیں (اسماعیلی، حشّاشی، دروزی، نُصَیری) مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم طاقتوں اور بیرونی حملہ آوروں کی ہمیشہ مدد کرتے رہے اور اکثر اوقات ان ہی کی تحریک و سازش سے اسلامی ملکوں پر بیرونی حملے ہوئے، شام و فلسطین پر صلیبی حملوں کے موقع پر انھوں نے صلیبیوں کا ساتھ دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب صلیبیوں کا شام پر تسلط ہوا تو انھوں نے ان باطنی فرقوں کے لوگوں کو اپنا معتمد و مقرّب بنایا، اور ان کو ان کی مدد کا صلہ دیا، زنگی اور ایوبی دورِ سلطنت میں یہ ہمیشہ سازشوں اور بغاوتوں میں مشغول رہے، آٹھویں صدی میں جب تاتاریوں نے شام پر حملہ کیا تو انھوں نے کھل کر تاتاریوں کا ساتھ دیا، اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا، اس کے علاوہ وہ مسلمانوں میں ہمیشہ ذہنی انتشار، دین سے بے اعتمادی اور بغاوت پھیلانے اور الحاد و بے دینی کی اشاعت میں منہمک رہتے تھے، اور مسلمانوں کے دینی قلعہ میں غنیم کے جاسوسوں کا کام کرتے تھے، اس سب کا تقاضا تھا کہ اس فرقہ پر علمی و عملی حیثیت سے کاری ضرب لگائی جائے، اس کے عقائد و اغراض کو بے نقاب کیا جائے، مسلمانوں کو ان کی طرف سے خبردار کردیا جائے، اور ان کی دشمنِ اسلام کارروائیوں پر ان کو قرار واقعی سزا دی جائے، یہ کام بھی وہی انجام دے سکتا تھا، جو اس فرقہ کی حقیقت و اسرار اور اس کے ماضی و حال اور اس کی تمام شاخوں اور اس کے تمام فرقوں کے عقائد و خیالات سے واقف ہو، ان کی علمی تنقید و تردید پر پوری قدرت رکھتا ہو، اس کے سینہ میں حمیّتِ اسلامی کا جوش اور ان دشمنانِ اسلام کے خلاف جذبۂ جہاد کارفرما ہو۔

اس سب کے علاوہ غیر مسلموں کے اختلاط، عجمی اثرات اور علماء کے تساہل و غفلت سے عوام میں مشرکانہ عقائد و اعمال پھیلے ہوئے تھے، توحید و دینِ خالص پر پردے پڑتے چلے جا رہے تھے، اولیاء اللہ و صالحین کے بارہ میں یہود و نصاریٰ کا سا غلو پیدا ہوتا جا رہا تھا، وساطت اور تقرب بالاولیاء کا عقیدہ راسخ اور "مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى"[1] کا جاہلی خیال مسلمانوں میں ابھر رہا تھا، غیر اللہ کی دہائی دینے اور "استغاثہ لغیر اللہ" تک میں بہت سے علماء تک کو کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی، انبیاء و صالحین کی قبور کے پاس وہ سب کچھ ہونے لگا تھا جس کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خطرہ تھا، اور جس سے پوری شدّت سے آپ نے منع کیا تھا، مسلمان غیر مسلموں اور ذمّیوں کے شعائر و خصوصیات اختیار کرنے اور ان کے مذہبی تہواروں اور میلوں میں شرکت اور ان کے رسوم و عادات اختیار کرنے میں تکلّف محسوس نہیں کرتے تھے، اس مشرکانہ جاہلیت کے خلاف جہاد کرنے اور توحید خالص کی طرف پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ دعوت دینے کے لئے ایک ایسے مجاہد عالم کی ضرورت تھی جس کا ذہن توحید و شرک کے فرق کو خوب سمجھتا ہو، جو جاہلیت کو اس کے تمام لباسوں اور مظاہر میں پہچان سکتا ہو جس نے توحید کی حقیقت کو متاخرین کی کتابوں، جاہل مسلمانوں کے تعامل، اور زمانہ کے رسم و رواج کے بجائے براہِ راست کتاب و سنت اور صحابۂ کرام کے عمل سے سمجھا ہو، جو عقیدۂ صحیح کے اعلان و اظہار میں حکومتوں کی مخالفت، اہلِ زمانہ کی عداوت، علماء کے اختلاف اور کسی طرح کی لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتا ہو، جو کتاب و سنت اور دین کے مستند اور اولین مآخذ اور قرونِ اولیٰ کے حالات پر غائر نظر اور کامل عبور رکھتا ہو، جو یہود و نصاریٰ کے انحراف ان کے مسخ و تحریف کی تاریخ، اور جاہلی قوموں کے ذہن و نفسیات سے پورے طور پر واقف ہو، اور جو مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم اور صدر اول کے عقیدۂ و عمل پر واپس لانے اور ان کو صحابۂ کرام اور ان کے جانشینوں کی روش اور مسلک پر دیکھنے کے لئے بے چین ہو۔

---

[1] ترجمہ (مشرکین) کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔ (الزمر-۳)

اہلِ تصوّف کے گروہ میں (مختلف تاریخی و علمی اسباب کی بنا پر) یونانی و ہندوستانی فلسفۂ اشراقیت کے اثرات دخیل ہو گئے تھے، اور اسلامی عقائد و افکار کے ساتھ اس طرح شیر و شکر ہو گئے تھے کہ ان کا سراغ لگانا مشکل تھا، افلاطونیتِ جدیدہ کی اشراقیت یا ہندوستان کا جوگ، حلول و اتحاد کا عقیدہ، وحدۃ الوجود کا مسلک، ظاہر و باطن کی سرحد بندی، رموز و اسرار، اور "علوم سینہ کا فتنہ"، کاملین و واصلین سے تکالیفِ شرعیہ کا سقوط اور احکامِ شریعت سے استثناء، یہ سب وہ عقائد و خیالات تھے، جو اہلِ تصوف کے ایک بڑے حلقہ میں مقبول و مسلّم تھے، اگرچہ ہر زمانہ کے محققین و راسخین ان عقائد فاسدہ کی تردید و انکار کرتے رہے، مگر تصوف کے ایک بڑے حلقہ کو اس پر اب بھی اصرار تھا، تصوف کی بعض شاخیں اور سلسلے شعبدہ بازی اور نظر بندی کی نیچی سطح تک اتر آئے تھے، ساتویں و آٹھویں صدی میں رفاعی سلسلہ اس بارہ میں خاص طور پر پیش پیش تھا، عوام اور بہت سے خواص ان مغالطوں کا شکار تھے، اس خطرہ کے سدّ باب اور شریعت کی حفاظت کے لئے بھی ایک صاحبِ یقین اور جری مصلح کی ضرورت تھی، جو اس گروہ کی شوکت و دبدبہ اور اس کے معتقدین و متوسلین کی تعداد و طاقت سے بے پروا و بے خوف ہو کر ان پر آزادانہ و دلیرانہ تنقید کرے اور ان کی غلطیوں اور مغالطوں کا پردہ چاک کرے۔

علمی و درسی حلقوں میں صدیوں سے ایک ایسا جمود طاری تھا کہ اپنے گروہ کے فقہی دائرہ سے سرِ مو قدم نکالنا جرم سمجھا جاتا تھا، قرآن و حدیث کو ان فقہی مسلکوں اور اپنے گروہ کے عمل کی عینک سے دیکھنے کا عام رواج تھا، فقہی اختلافات میں قرآن و حدیث کو حَکم بنانے کے بجائے قرآن و حدیث کو ہر حال میں ان کے مطابق کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، ترجیح و اختیارات فقہیہ کا دروازہ بھی عملاً بند تھا، زمانہ اور حالات کے تغیر کے ساتھ بہت سے نئے مسائل درپیش تھے جن میں فتویٰ دینے کے لئے اسلام کے پورے فقہی ذخیرہ پر وسیع نظر، کتاب و سنت پر عبور، قرونِ اولیٰ کے تعامل پر اطلاع اور

اصولِ فقہ سے گہری واقفیت کی ضرورت تھی، لیکن عرصہ سے علم و نظر اور مطالعہ محدود ہوتا چلا جا رہا تھا، قوائے فکریہ مضمحل ہو رہے تھے، اور کوئی عالم نئے مسائل کے استنباط کی جرأت نہیں کر رہا تھا، اسلامی قانون اور فقہ اپنا نمو اور ارتقاء کی صلاحیت کھو چکے تھے، اور قدیم فقہی ذخیرہ میں اضافہ ناممکن سمجھا جانے لگا تھا، اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے بھی ایک ایسے محدث و فقیہ اور اصولی کی ضرورت تھی، جو پورے اسلامی کتب خانہ اور اس کے علمی ذخیرہ کا جائزہ لے چکا ہو، قرآن و حدیث کا اس کو ایسا استحضار ہو کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہوں، حدیث کی اقسام اور اس کے مراتب اور اس کے مجموعوں پر اس کی ایسی نظر ہو کہ کہنے والے کہیں کہ جس حدیث کو یہ شخص نہیں جانتا وہ حدیث ہی نہیں، فقہاء کے اختلافات اور ان کے ماخذ و دلائل اس کو ہر وقت مستحضر رہیں، اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب اور ان کی جزئیات سے وہ ان مذاہب کے اہلِ درس و اہلِ فتویٰ سے زیادہ باخبر ہو، قوت استنباط اور ذاتی تحقیق کے ساتھ سلف کے دائرہ میں محدود اور ائمۂ مجتہدین کا مرتبہ شناس اور ان کا خوشہ چیں ہو، لغت میں محقق اور زبان کے معاملہ میں نقّاد اور مبصر ہو، نحو میں اس کو یہ درجہ حاصل ہو کہ ائمۂ فن و مصنفین نحو کی بے تکلف غلطیاں نکالتا ہو، اس کا حافظہ محدثین اولین کی یاد تازہ کرتا ہو، اس کی ذکاوت قدرتِ خداوندی کی ایک نشانی، اس کا علم فیاضِ ازل کی فیاضی کی ایک دلیل، اس کی ذات امتِ اسلامیہ کی مردم خیزی، درختِ اسلام کی شادابی اور علومِ اسلامیہ کی زندگی اور تازگی کا ثبوت ہو، اور اس حدیث کی تصدیق کہ۔

مثل امتی مثل المطر لا یدری اولہ	میری امت کی مثال بارش کی سی ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا
خیر ام آخرہ۔[1]	کہ اس کا ابتدائی حصہ زیادہ بہتر و بابرکت ہے کہ آخری حصہ

اس کے ساتھ وہ زندگی کے عملی میدان کا بھی شہسوار ہو، صاحبِ قلم بھی ہو اور صاحبِ سیف بھی، سلاطینِ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے اس کو باک نہ ہو، اور تاتاری جیسے خونخوار دشمن کے مقابلہ میں

[1] ترمذی عن انس بن مالک۔

لشکرِ اسلام کی قیادت کرنے سے اس کو عذر نہ ہو، درس کے حلقوں، کتب خانہ کے گوشوں، مسجد کی خلوتوں، مناظرہ کی مجلسوں سے لے کر جیل خانہ کی کال کوٹھری اور میدان کارزار تک اس کی یکساں پرواز اور فاتحانہ ترکتاز ہو، اور ہر جگہ اس کی ذات محترم اور اس کی امامت مسلّم ہو۔

آٹھویں صدی کے لئے ایک ایسے ہی مردِ کامل کی ضرورت تھی، جو زندگی کے تمام میدانوں کا مجاہد ہو، اور جس کی جدوجہد اور اصلاحات کسی ایک شعبہ میں محدود نہ ہوں، یہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی ذات تھی، جس نے عالمِ اسلام میں ایک ایسی علمی و عملی حرکت اور زندگی پیدا کر دی جس کے اثرات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی قائم ہیں۔

ابن تیمیہؒ کا زمانہ

ابنِ تیمیہؒ کا زمانہ بڑا پُر آشوب اور پُر از واقعات ہے، سیاسی، اجتماعی، اخلاقی، علمی اور دینی حیثیت سے یہ دور خاص اہمیت رکھتا ہے، ابن تیمیہؒ کی اصلاحی جدوجہد اور ان کے علمی و اصلاحی مزاج کو سمجھنے کے لئے اس ماحول کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، جس میں ان کا نشوونما ہوا، اور جس میں انھوں نے اپنا تجدیدی و اصلاحی کام انجام دیا۔

ابن تیمیہ بغداد کی تباہی کے پانچ[۵] برس بعد اور حلب اور دمشق میں تاتاریوں کے داخلہ کے کل تین[۳] برس بعد پیدا ہوئے، اس لئے یہ بات یقینی ہے کہ انھوں نے جب ہوش سنبھالا ہو گا تو ان اسلامی شہروں کی تباہی اور مسلمانوں کے قتل عام کی داستانیں اور تاتاریوں کے دہشت انگیز اور وحشیانہ مظالم کے واقعات بچہ بچہ کی زبان پر ہوں گے، اور اس کے چشم دید گواہ ہر جگہ موجود ہوں گے، وہ جب سات سال کے تھے تو خود ان کے وطن حرّان پر جو تاتاریوں کے مقبوضہ علاقہ (عراق) کے شمال اور دجلہ و فرات کے دوآبہ میں واقع ہے، تاتاریوں کا حملہ ہوا، اور بہت سے خاندانوں اور گھرانوں کی طرح ان کا خاندان بھی

تاتاریوں کے مظالم اور وحشیانہ سلوک سے بچنے کے لئے دمشق کی طرف روانہ ہوا، راستہ میں ہر جگہ تاتاریوں کی دہشت پھیلی ہوئی تھی، اس دہشت وپریشانی، بے امنی اور بے نظمی کی یاد ان کے غیر معمولی حافظہ سے کبھی محو نہیں ہوئی ہوگی، بڑے ہو کر انھوں نے اس تباہی وبربادی کے آثار ونشانات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے اور خود ان لوگوں کی زبان سے اس کی دردناک تفصیل سنی ہوگی، جنھوں نے یہ سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، اس لئے قدرتی طور پر ان کی حساس اور غیور طبیعت مسلمانوں کی اس بے بسی اور رسوائی سے متاثر ہوئی ہوگی، اور ان غارتگروں کے خلاف ان کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوا ہوگا۔

اسی کے ساتھ عینِ جالوت میں مسلمانوں کی شاندار فتح کا واقعہ ان کی ولادت سے صرف تین ۳ سال پہلے پیش آیا تھا، نیز الملک الظاہر بیبرس کی فتوحات ان کے بچپن کی باتیں تھیں اور مجلسیں ان کے تذکرہ سے گرم تھیں، اس سب سے ان کے قلب کو سکون اور تقویت حاصل ہوئی ہوگی اور ان واقعات سے ان کا حوصلہ بلند ہو گیا ہوگا۔

مصر کے مملوک سلاطین

مصر وشام پر ابنِ تیمیہؒ کی ولادت سے ۱۳ برس پہلے سے ممالیک (خاندانِ غلامان) کی حکومت تھی، یہ سلطان صلاح الدین کے خاندان کے آخری بادشاہ الملک الصالح نجم الدین ایوب (م ۶۴۷ھ) کے ترک غلام تھے، جن کو سلطان نے ان کی وفاداری اور بہادری کا تجربہ کرنے کے بعد مصر میں آباد کیا تھا، اور بحریہ[1] کے لقب سے مشہور رہیں، ان میں ایک فرد عزالدین ایبک الترکمانی نے ۶۴۷ھ میں الملک الصالح کے جانشین توران شاہ کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا، اور الملک المعز کا لقب اختیار کیا۔

---

[1] ان کی قیام گاہ دریائے نیل کے کنارہ واقع تھی، اس لئے بحریہ مشہور ہو گئے، مصر میں اب بھی دریائے نیل کو بے تکلف بحر کہتے ہیں۔

۶۵۵ھ میں وہ قتل ہوا، اور اس کا بیٹا نور الدین علی جانشین ہوا، ۶۵۷ھ میں عز الدین ایبک کے غلام سیف الدین قطز نے جو حکومت کا ناظمِ اعلیٰ تھا تخت پر قبضہ کیا، یہ وہی سلطان ہے جس نے تاتاریوں کو پہلی مرتبہ شکست فاش دی، اگلے ہی سال (۶۵۸ھ میں) الملک الصالح نجم الدین ایوب کے دوسرے غلام رکن الدین بیبرس نے سیف الدین قطز کو قتل کر کے عنانِ مملکت اپنے ہاتھ میں لی اور الملک الظاہر لقب اختیار کیا، اور ۱۸ سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی، اور تاتاریوں اور صلیبیوں پر پے در پے فتوحات حاصل کیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی ولادت ہوئی تو مصر و شام پر ظاہر بیبرس ہی کی حکومت تھی، ان کا بچپن اسی کی حکومت میں گذرا، اس کا انتقال ہوا تو ان کی عمر پندرہ سال کی تھی، اور وہ جوان تھے، الملک الظاہر بیبرس سلطان صلاح الدین کے بعد پہلا طاقتور مسلمان بادشاہ تھا جس نے جہاد کی طرف پوری توجہ کی، اور دشمنانِ اسلام کو پے در پے شکستیں دیں، ابن کثیر سلطان کے متعلق لکھتے ہیں:-

"بیبرس بیدار مغز، بلند حوصلہ، بہادر بادشاہ تھا، دشمنوں سے کسی وقت غافل نہیں ہوتا تھا، برابر ان کے مقابلہ میں صف آرا اور کمر بستہ رہتا تھا، اس نے اسلام کی پراگندگی دور کی اور مسلمانوں کے منتشر شیرازہ کو جمع کیا، واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس اخیر زمانہ میں اسلام اور اہلِ اسلام کی مدد اور تقویت کے لئے مقرر کیا تھا، فرنگی، تاتاری اور مشرکین کی نظر میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا، اس نے شراب کی بندش کی، فاسقوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ملک بدر کیا، وہ جس خرابی اور فساد کو دیکھتا، اس کو دور کئے بغیر چین نہ لیتا۔"[1]

ظاہر بیبرس کی سلطنت بہت وسیع اور منظم تھی، مشرق میں دریائے فرات تک اور جنوب میں سوڈان کے آخری حصہ تک اس کے حدود پہونچ گئے تھے، مصر اس سلطنت کا مرکز اور قاہرہ اس کا

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۷۶

صدر مقام تھا، جو سلطان اور خلیفۂ عباسی[1] کے قیام کی وجہ سے اس وقت کی دنیائے اسلام کا سیاسی، علمی اور تمدنی مرکز بن گیا تھا، بیبرس نے بکثرت مدارس قائم کئے، دور دور سے علماء و اہل کمال قاہرہ میں جمع ہو گئے۔

بیبرس اپنی ذاتی صلاحیت اسلامی جذبات اور جوش جہاد کے ساتھ بہر حال ایک مطلق العنان فرمانروا تھا، اس لئے اس میں مطلق العنان بادشاہوں کی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں، اس کی تاریخ جہاں مجاہدانہ کارناموں اور اسلامی خدمات سے روشن ہے، وہاں شخصی سلطنت کی خصوصیات استبداد، ضد اور اصرار کے واقعات سے بھی داغدار ہے، اس سلسلہ کا ایک افسوسناک واقعہ وہ ہے، جو امام نووی کے ساتھ پیش آیا۔[2]

بیبرس کی ۱۸ سالہ منظم و مستحکم حکومت کے بعد بہت جلد جلد مصر و شام کے تخت حکومت پر سلاطین آئے اور گئے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۶۷۶ھ سے لے کر (جس سال بیبرس نے انتقال کیا ہے) ۷۰۹ھ تک کل ۳۳ سال کی مدت میں ۹ بادشاہ مصر کے تخت پر بیٹھے، اس ۳۳ سال کی مدت میں مصر و شام و حجاز کی اسلامی حکومت کو صرف ایک طاقتور منتظم اور مجاہد سلطان نصیب ہوا، جس کا نام الملک المنصور سیف الدین قلاوون ہے، جس نے ۶۷۸ھ میں تاتاریوں پر حملہ کیا، اور سخت شکست دی، اور طرابلس کو جو ۱۸۵ سال سے صلیبیوں کے قبضہ میں تھا، فتح کیا، اس نے ۶۷۸ھ سے ۶۸۹ھ تک ۱۲ سال بڑی شان سے حکومت کی منصور قلاوون کے بعد مصر کا تخت بادشاہوں اور بادشاہ گروں کا پھر کھیل بن گیا، بالآخر ۷۰۹ھ میں منصور قلاوون کے بیٹے الملک الناصر محمد بن قلاوون نے تیسری مرتبہ عنانِ مملکت ہاتھ میں لی،

---

[1] خلیفہ مستعصم کی شہادت کے بعد مسلمان تین سال تک بغیر کسی خلیفہ کے رہے مورخین نئے سال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دخلت سنة والمسلمون بلا خليفة" بالآخر سلطان ظاہر بیبرس نے ۶۵۹ھ میں خاندان عباسی کے ایک فرد المستنصر باللہ ابو القاسم احمد بن امیر المومنین الظاہر کے ہاتھ پر بیعت کی اور مصر خلافت کا مرکز قرار پایا، لیکن یہ خلافت برائے نام اور تبرکاً تھی، اصل حکمران اور فرماں روا خود سلطان تھا۔ [2] ملاحظہ ہو "طبقات الشافعية الكبرىٰ" ترجمۂ امام نووی۔

اور ۳۲ سال تک سلطنت کو استقرار حاصل رہا، الملک الناصری امام ابن تیمیہؒ کا اصل معاصر ہے جس سے ان کی اصلاحی وتجدیدی تاریخ کا تعلق ہے، وہ بڑی حد تک ظاہر بیبرس کا جانشین اور بہت سی صفات میں اس کا نمونہ اور اپنے والد نامدار منصور قلاوؤن کی یادگار تھا، اس کے زمانہ میں پھر اسلامی سلطنت میں وحدت اور طاقت پیدا ہوئی، اس نے اپنے نامور پیشرو کی طرح تاتاریوں پر شاندار فتح حاصل کی اور اسلامی حکومت کی دھاک بٹھادی۔

اس پورے عرصہ میں عراق، ایران وخراسان بدستور تاتاریوں کے قبضہ میں رہے، اور بغداد اس وقت تک مسلمانوں کو واپس نہیں ملا، جب تک کہ اس کے حکمران (تاتاری) خود مسلمان نہیں ہوگئے، مصر کے عباسی خلیفہ نے خود فوج کشی کی، اور سلطان ظاہر بیبرس نے بارہا ارادہ کیا، مگر کامیابی نہیں ہوئی، سلاطینِ ممالیک کے قبضہ وانتظام میں صرف مصر، سوڈان، شام اور حجاز تھے۔

نظامِ سلطنت

مملوک سلاطین کی سلطنت کا سرکاری مذہب اگرچہ اسلام تھا، اور سلطان اور اعیانِ سلطنت اسلام سے محبت کرتے تھے، اور دین کی حمیت رکھتے تھے، قضاۃ وائمہ، شیخ الاسلام اور دینی عہدداروں کا باقاعدہ تقرر ہوتا تھا، احتساب کا محکمہ قائم تھا، قاضی کے فیصلے واجب التعمیل تھے، مدارس میں آزاد دینی تعلیم ہوتی تھی، لیکن سارے نظامِ سلطنت میں اصل کارفرما ذات سلطان اور اس کے معتمد وزراء اور ارکانِ سلطنت کی تھی، اور انہی کا فیصلہ اور دلی منشاء سلطنت کا اصل قانون تھا، اسلامی قوانین کے نفاذ کا رقبہ ان کی وسیع سلطنت میں بہرحال محدود تھا، نظامِ حکومت تقریباً فوجی وعسکری طرز کا تھا، جس کا نہ تو کوئی مدوّن ومرتب دستور تھا، نہ کوئی مقرر ومعین نظام، نہ کوئی مجلسِ شوریٰ تھی۔

ظاہر بیبرس اور اس کے جانشین سلاطین اس کی کوشش ضرور کرتے تھے کہ ان کی سلطنت کے

قوانین واحکام اوران کی کارروائیوں کو علمائے وقت کی تصدیق وتائید حاصل ہو، اور وہ حتی الامکان ان کی رضامندی اور مشورہ سے کام کریں، ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر علماء نے کسی نئے اقدام یا قانون کی سختی سے مخالفت کی ہے تو اس کو ملتوی کر دیا گیا ہے، خود ظاہر بیبرس نے مصر وشام میں زمینداروں کی زمینیں اور جاگیریں بحقِ حکومت ضبط کرنی چاہیں، امام نوویؒ نے اس کی سختی سے مخالفت کی بیبرس نے اگرچہ اس پر ناراضگی کا اظہار کیا، اور امام نووی کو اس کی وجہ سے دمشق چھوڑ کر چلا جانا پڑا، لیکن اس کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ زمینوں کی وہ صورتِ حال باقی رہی، اور بیبرس نے اس میں کوئی ترمیم نہیں کی۔

یہ نظامِ سلطنت موروثی بنیادوں پر قائم تھا، لیکن عملاً اس کے خلاف ہو رہا تھا، مگر یہ بھی کسی اسلامی بنیاد پر نہیں تھا، اور نہ اس لئے کہ اسلام کی روح اور اس کی مستند روایات کا تقاضا ہے کہ امیر ذاتی صلاحیت سے متصف ہو، اور اس کو امت کا اعتماد حاصل ہو، بلکہ اس لئے کہ خاندانِ غلامان (ممالیک) کی بنیاد ہی ذاتی جد وجہد شخصی حوصلہ مندی اور کارکردگی پر پڑی تھی، اور اس سلطنت کا یہ مزاج بن گیا تھا کہ جو زیادہ طاقتور اور دلیر ہو وہ زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے، سلطنت ایوبیہ کے غلاموں نے اپنی ذاتی کوشش اور ہمت سے اپنے آقاؤں کی سلطنت پر قبضہ کیا تھا، یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہا، ان میں سے ہر ایک اپنے بیٹے کو جانشین بنانے کی کوشش کرتا رہا، مگر اس کے غلاموں میں جو زیادہ جری اور حوصلہ مند ہوتا، وہ اس کو ہٹا کر خود تختِ سلطنت پر بیٹھ جاتا، تخت وتاج کے ان امکانات نے حوصلہ مندوں میں قسمت آزمائی کا شوق پیدا کر دیا تھا، اور اس کے حصول کے لئے اکثر رسہ کشی اور زور آزمائی ہوتی رہتی، اسی عرصہ میں اگر تاتاریوں یا فرنگیوں کا حملہ ہوتا تو وہ اکثر متحد ہو جاتے۔

ملک کی اجتماعی واخلاقی حالت

یہ ترکی النسل حکمراں طبقہ اپنی برتری کا احساس رکھتا تھا، اور ہر چیز میں عام شہری آبادی سے

ممتاز رہتا تھا، اس کی زبان ترکی تھی، صرف عبادات کے موقع پر یا علماء سے خطاب کے مواقع پر یا عوام سے
گفتگو کرنے میں (جس کی نوبت براہِ راست کم آتی تھی) وہ عربی زبان استعمال کرتا تھا، ان میں سے بعض عربی
سے اتنی واقفیت رکھتے تھے کہ وہ فرض ادا کرلیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ علماء کے قدرداں، مشائخ و صلحاء
کے معتقد، مدارس کے قیام اور مساجد کی تعمیر کے شائق تھے، عہدوں کی تقسیم میں کسی خاص نسل یا طبقہ کی
تخصیص نہ تھی، پھر بھی بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدے قدرتی طور پر ترکی النسل سرداروں کو ملتے
تھے، حکام اور بڑے بڑے جاگیردار زیادہ تر تاتاری ہوتے تھے، جو کاشتکاروں اور مزدوروں کی محنت سے
فائدہ اٹھاتے، ۶۹۷ھ میں حسام الدین لاجین نے اپنے عہدِ حکومت میں اس کی کوشش کی کہ زمینوں کی تقسیم
اس طرح ہو کہ مزارعین کو فائدہ ہو اور ان کی حالت درست ہو، اور زراعت و پیداوار کو بھی ترقی ہو، لیکن حکام
کو اس کا یہ رویہ پسند نہ آیا، اور انھوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی. شہری آبادی کا ایک اہم عنصر تاتاری
تھے، سیف الدین قطز، ظاہر بیبرس اور ناصر الدین قلاؤن کی جو جنگیں تاتاریوں سے ہوئی تھیں، ان
میں بیشمار تاتاری قید ہوئے اور گرفتار ہو کر مصر و شام میں آئے، اور وہاں انھوں نے سکونت اختیار کرلی،
مقریزی کے بیان کے مطابق ظاہر بیبرس کے زمانہ میں مصر و شام ان سے بھر گئے، اور ان کے عادات اور
رسم و رواج ملک میں پھیل گئے، اور انھوں نے اگرچہ اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن وہ اپنی بہت سی رسوم
و عادات پر قائم تھے، اور انھوں نے اپنی قومی خصوصیات کو برقرار رکھا تھا، نومسلموں کے اسلام کی طرف
کلیۃً منتقل ہو جانے اور اپنے سابقہ عقائد و خیالات، تہذیبی خصوصیات اور ذہنی اثرات سے بالکل
مجرد و یکسو ہو جانے کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ہیں، یہ تو صحابۂ کرام کی خصوصیت اور آنحضرت (صلے اللہ
علیہ وسلم) کا معجزہ تھا کہ ان کی زندگی میں اسلام و جاہلیت کی کشمکش بالکل ختم ہوگئی تھی، اور گویا دوبارہ
وہ اسلام میں پیدا ہوئے تھے، ایک ایسے زمانہ اور سوسائٹی میں جب اسلامی تعلیم و تربیت کا مکمل نظام
قائم نہ ہو، اور اسلامی معاشرہ میں نوواردوں کو جذب کرلینے اور از سر نو ڈھال لینے کی صلاحیت نہ رہی ہو،

تاتاریوں اور ترکی النسل عجمیوں کے اسلامی عقائد و عبادات کے سانچہ میں ڈھل جانے اور اپنے قدیم عادات و اخلاق سے یکسر آزاد و دستبردار ہو جانے کی توقع صحیح نہیں ہے، چنانچہ ان تاتاری النسل نومسلموں کی زندگی اسلامی و جاہلی اثرات کا معجون مرکب تھی، مصر کا نامور مورخ مقریزی لکھتا ہے:-

"ان تاتاریوں کی تربیت دارالاسلام میں ہوئی تھی، انھوں نے قرآن کی اچھی طرح تعلیم حاصل کی اور اسلام کے احکام و قوانین سیکھے لیکن ان کی زندگی حق و باطل کا مجموعہ تھی، اس میں اچھی چیزیں بھی تھیں، اور بری بھی، انھوں نے اپنے دینی معاملات نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اوقاف، اور یتامیٰ کے مسائل، زوجین کے اختلافات، قرض خواہوں کے تنازعے وغیرہ، قاضی القضاۃ کے سپرد کر رکھے تھے، اور خود اپنے ذاتی معاملات میں چنگیزی عادات و روایات کے پابند اور السیاسا (تاتاری قانون) پر کاربند تھے، انھوں نے اپنے لئے ایک حاکم حاجب کے نام سے مقرر کر رکھا تھا، جو ان کے روزمرہ کے واقعات میں فیصلہ کرے، طاقتور کو نظم و ضبط میں رکھے اور السیاسا کے مطابق کمزور کو اس کا حق دلائے، اسی طرح بڑے بڑے تاتاری سوداگروں کے معاملات کا فیصلہ بھی السیاسا کے مطابق ہوتا تھا، اور جاگیروں اور جائدادوں کے معاملات میں اگر اختلاف واقع ہوتا تو اس کا تصفیہ اس قومی قانون کے مطابق ہوتا۔"[1]

ان ترکی النسل عجمیوں اور ان تاتاری نومسلموں کے عادات و اخلاق، رسم و رواج اور تہذیب و معاشرت حتیٰ کہ عقائد و خیالات کا اثر قدیم عرب اور مسلمان آبادی پر پڑنا لازمی تھا، جس طرح صلیبی جنگوں میں یورپ و ایشیا کا اختلاط ہوا تھا اسی طرح تاتاری یورش اور تاتاریوں کے فاتح اور مفتوح بننے کی حالت میں مشرق و مغرب کا اختلاط ہو رہا تھا، یہ اختلاط و اجتماع میدان جنگ کی آویزش سے شروع ہوا تھا لیکن تہذیبی و فکری و اخلاقی آمیزش پر ختم ہوا، ہر ایک نے دوسرے کو

---

[1] خطط مصر

متاثر کیا اور ہر ایک نے دوسرے کا اثر قبول کیا۔

اس اختلاط و اجتماع نے بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے، اور ایک نئی تہذیب اور نئی معاشرت وجود میں آئی جس کے متعلق یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اسلامی تہذیب یا عربی معاشرت ہے، اس صورت حال سے ایک ایسے مصلح اور معلم کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے جو مسلمانوں کی زندگی میں غیر اسلامی اثرات اور جاہلی عادات کو دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا، اور جو اس کو سرتاسر کتاب و سنت کے تابع صدر اول اور خیر القرون کے نقش قدم پر اور۔

اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً   اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

کی تفسیر دیکھنا چاہتا ہے۔

علمی حالات

اس صدی کے وسط میں علامہ تقی الدین ابو عمرو بن الصلاح (۵۷۷-۶۴۳ھ) شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام (۵۷۸-۶۶۰ھ) اور امام محی الدین النووی (۶۳۱-۶۷۶ھ) جیسے امام فن موجود تھے، اس صدی کے آخر میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن دقیق العید (۶۲۵-۷۰۲ھ) جیسے محدث، اور علامہ علاء الدین الباجی (۶۳۱-۷۱۴ھ) جیسے اصولی و متکلم نظر آتے ہیں، ابن تیمیہؒ کے معاصرین میں علامہ جمال الدین ابو الحجاج المزی (۶۵۴-۷۴۲ھ) حافظ علم الدین البرزالی (۶۶۵-۷۳۹ھ) اور علامہ شمس الدین الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) جیسے محدث و مورخ موجود تھے، جو اپنے زمانہ میں فنِ حدیث و روایت کے ارکانِ اربعہ میں شمار ہوتے تھے، اور جن کی کتابوں پر متاخرین کا دارومدار ہے۔

ان کے علاوہ قاضی القضاۃ کمال الدین ابن الزملکانی (۶۶۷-۷۲۷ھ) قاضی القضاۃ جلال الدین القزوینی (م ۷۳۹ھ) قاضی القضاۃ تقی الدین السبکی (۶۸۳-۷۵۶ھ) اور علامہ ابو حیان النحوی

(۶۵۴-۷۴۵ھ) جیسے کامل الفن اساتذہ اور قوی الاستعداد عالم موجود تھے، جن کا درس مرجعِ خلائق اور جن کا تبحّر شہرۂ آفاق تھا۔

علم کی اشاعت ترقی پر تھی، مصر و شام میں ایوبیوں اور ممالیک کے قائم کئے ہوئے بڑے بڑے مدرسے اور دارالحدیث تھے، جن میں اطرافِ عالم کے طلبہ علومِ دینیہ اور علوم عقلیہ کی تعلیم پاتے تھے، مدارس کے ساتھ اور مستقل طور پر بھی بڑے بڑے کتاب خانے تھے، جن میں ہر علم و فن کی نادر کتابیں اور علمی ذخیرہ محفوظ تھا، جس سے ہر طالب علم فائدہ اٹھا سکتا تھا، صرف مدرسۂ کاملیہ میں (جس کو الکامل محمد الایوبی نے ۶۲۱ھ میں قائم کیا تھا) جو کتب خانہ تھا، اس میں ایک لاکھ کتابیں تھیں، اسی صدی میں بعض جلیل القدر کتابیں تصنیف ہوئیں، جو متاخرین کا مرجع ہیں، مثلاً علامہ تقی الدین ابن الصّلاح کا "مقدمہ" شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی "القواعد الکبریٰ"، امام نواوی کی مجموع (شرح المہذب) اور شرح مسلم، ابن دقیق العید کی "کتاب الامام" اور "احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام"، ابوالحجاج المزّی کی "تہذیب الکمال" اور علامۂ ذہبی کی "میزان الاعتدال" اور "تاریخ الاسلام"۔

لیکن چند شخصیتوں اور علمی کارناموں کو مستثنیٰ کرکے اس صدی کے علم اور تصنیف و تالیف میں وسعت زیادہ تھی، عمق کم تھا، غور و فکر و تعمق کے بجائے نقل و اقتباس کا ذوق غالب تھا، مذاہبِ فقہیہ کے آہنی سانچے بن گئے تھے، جن میں لوچ نہیں تھا، یوں کہنے کو تو حق کو مذاہب اربعہ میں دائر مانا جاتا تھا، لیکن عملاً ہر مذہب کے پیرو حق کو اپنے مذہب و مسلک کے اندر محدود مانتے تھے، بہت رعایت سے کام لیتے تو کہتے کہ۔

رأی امامنا صواب یحتمل الخطاء	ہمارے امام کے اجتہادات تمام تر درست ہیں ان میں غلطی کا احتمال ہے اور دوسرے امام کے اجتہادات
ورأی غیرنا خطاء یحتمل الصّواب۔	نادرست ہیں ان میں صحت کا احتمال ہے۔

ہر مذہب کے پیرو اپنے فقہی مسلک کو تمام مذاہبِ فقہیہ سے افضل و اعلیٰ مقبول و موئید من اللہ سمجھتے تھے، ان کی تمام ذہانت، قوتِ تصنیف، قوتِ بیانیہ اس کی ترجیح اور اس کی فضیلت ثابت کرنے میں صرف ہوتی تھی، متبعین اپنے مذہب کو جس نظر سے دیکھتے تھے، اور جو ذہنیت اہلِ مذاہب میں کارفرما تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب سلطان الملک الظاہر بیبرس نے پچھلے دستور کے برخلاف شافعی قاضی القضاۃ کے علاوہ باقی تینوں مذاہب کے بھی علیحدہ علیحدہ قاضی القضاۃ مقرر کئے تو فقہاءِ شافعیہ نے اس کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اس لئے کہ وہ مصر کو شافعی قاضی القضاۃ کے ماتحت ہی دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ قدیم روایات اور امام شافعی کا مدفن ہونے کی وجہ سے مصر پر مذہبِ شافعی ہی کا حق ہے، جب بیبرس کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور اس کے خاندان سے حکومت منتقل ہوئی تو بعض شافعیہ نے اس کو اسی فعل کی سزا اور قدرتی انتقام سمجھا۔[1]

اس فقہی تحزّب (گروہ بندی) کے ساتھ کلامی تعصب بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا، مذاہبِ اربعہ کے پیرو ایک دوسرے کے معترف اور شاگرد و استاد بھی تھے، آپس میں ملتے جلتے بھی تھے، محبت و احترام بھی کرتے تھے، لیکن اشاعرہ و حنابلہ کا اتحاد تقریباً ناممکن تھا، مذاہب میں بحث صرف ارجحیت و اولیت کی تھی، یہاں بحث کفر و اسلام کی تھی، ایک کو دوسرے کی گمراہی پر اصرار تھا، عقائد کی بحثوں نے اور متکلمانہ موشگافیوں نے تمام مباحث کو دبا لیا تھا، اور یہ ذوق ہر ذوق پر غالب تھا، سلطنتوں کو اس سے دلچسپی تھی، اور عوام و خواص سب اس نشہ میں سرشار تھے۔

دوسری طرف تصوّف بھی عروج پر تھا، اس میں بہت سے غیر اسلامی افکار اور عناصر شامل ہو گئے تھے، اور بہت سے پیشہ ور جاہل، غیر محقق اور مبتدع اس گروہ میں شامل ہو کر عوام و خواص کی گمراہی اور شرک و بدعات کی گرم بازاری کا سبب بن رہے تھے۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ۔

فلسفہ کا ایک حلقہ مذہب اور انبیاءؑ کی تعلیمات سے آزاد ہو کر اپنی تعلیمات کی اشاعت میں بعض اوقات علانیہ اور بعض اوقات خفیہ طور پر مصروف تھا، دوسرا حلقہ فلسفہ کو اصل اور معیار قرار دے کر مذاہب کا اس سے پیوند لگانا چاہتا تھا، اور عقل و نقل کی تطبیق کی کوشش کرتا تھا، دونوں حلقے ارسطو و افلاطون کے جامد مقلد اور ان کے افکار و خیالات کی تقدیس، ان کے علوم کی صحت اور ان کی برتری اور مافوق البشری حیثیت کے پورے پورے قائل تھے، اور کسی چیز میں ان کے نتائجِ فکر اور تحقیقات سے ہٹنے اور ان کی غلطی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

یہ تھا وہ سیاسی، اجتماعی، اخلاقی، ذہنی و علمی ماحول جس میں ابن تیمیہ نے ہوش سنبھالا، اور جس میں انھوں نے اصلاح و تجدید کا عَلَم بلند کیا۔

ابن تیمیہؒ کا آبائی وطن

دجلہ و فرات کا دوآبہ دو حصوں میں تقسیم ہے (۱) جنوبی جو عراق عربی کہلاتا ہے، اور جس میں بغداد و بصرہ وغیرہ واقع ہیں (۲) شمالی جس کو قدیم عربی لٹریچر میں دیار بکر، دیار ربیعہ اور دیار مضر کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، اور عرب جغرافیہ نویس عام طور پر الجزیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کے شمال میں آرمینیا، جنوب میں عربی عراق، مشرق میں کردستان اور مغرب میں ایشیائے کوچک اور بادیۃ الشام (صحرائے شام) واقع ہے، اسی علاقہ میں موصل، الرقّہ (البیضاء) نصیبین اور الرہا[1] (ایڈیسا) واقع ہیں الرہا کے جنوب میں تقریباً ۸ گھنٹے کی مسافت پر مشہور تاریخی شہر حرّان ہے، ابن حوقل کے بیان کے مطابق یہ قدیم زمانہ سے صابئین کا مذہبی و علمی مرکز رہا ہے، فلسفہ اور قدیم یونانی علوم میں اس کو خاص امتیاز اور شہرت حاصل رہی ہے، یہی حران ابن تیمیہ کا آبائی وطن ہے، جہاں ان کا خاندان صدیوں سے آباد تھا۔

---

[1] آج کل اس کو اورفا کہتے ہیں، اور وہ سلطنت ترکی میں شامل ہے۔

ابن تیمیہ کا خاندان

ابن تیمیہؒ کا خاندان جو پہلے سے اسرۃ ابن تیمیہ[1] (خاندانِ ابن تیمیہ) کے نام سے مشہور تھا، حران کا مشہور علمی اور دینی خاندان تھا، .... یہ خاندان (جب سے اس کی تاریخ معلوم ہے) حنبلی العقیدہ اور حنبلی المذہب تھا، اپنے دیار میں اس کو مذہب حنبلی میں پیشوائی کا منصب حاصل تھا، اور اس کے صاحبِ علم افراد ہمیشہ درس و افتاء اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے دادا ابو البرکات مجد الدین ابن تیمیہؒ کا شمار مذہب حنبلی کے ائمہ و اکابر میں ہے، بعض اہل علم نے ان کو مجتہد مطلق کے لقب سے یاد کیا ہے[2]، امامِ فنِ رجال حافظ ذہبیؒ کتاب النبلاء" میں لکھتے ہیں کہ "مجد الدین ابن تیمیہؒ ۵۹۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے، پہلے اپنے چچا مشہور خطیب و واعظ فخر الدین ابن تیمیہ سے علم حاصل کیا، پھر حران اور بغداد کے علماء و محدثین سے علوم کی تحصیل و تکمیل کی، اور فقہ میں کمال حاصل کیا" ذہبی کے الفاظ ہیں۔

وانتهت اليه الامامة فى الفقه ۔ فقہ میں ان کو درجۂ امامت حاصل تھا۔

۶۵۱ھ کے سفرِ حج میں جب وہ بغداد پہنچے تو علماء ان کی ذکاوت اور کمالات دیکھ کر حیران رہ گئے، ذہبی کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے خود مجھ سے نقل کیا کہ شیخ ابن مالک کہتے تھے کہ اللہ نے علم فقہ کو مجد الدین ابن تیمیہؒ کے لئے ایسا ہی نرم کر دیا ہے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو موم کر دیا گیا تھا، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے دادا (مجد الدینؒ) کی طبیعت میں کچھ تیزی اور جوش تھا، ایک مرتبہ ایک عالم نے

---

[1] ابن تیمیہؒ سے چار پشت اوپر ان کے جد امجد محمد بن الخضر کے وقت سے یہ نسبت شروع ہوئی تھی، اس وجہ تسمیہ میں مؤرخین کا اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ محمد بن الخضر کی والدہ کا نام (جو واعظہ تھیں) تیمیہ تھا، اس لئے یہ خاندان تیمیہؒ کی طرف منسوب ہو گیا۔

[2] ترجمۂ صاحب منتقی الاخبار بقلم علامہ محمد بن علی الشوکانی صاحب "نیل الاوطار"۔

ان سے ایک علمی سوال کیا، انھوں نے فرمایا کہ اس کا جواب ساٹھ طریقہ پر ہے، پھر ایک ایک کر کے پورے جوابات گنا دیئے، اور آخر میں کہا کہ تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ تم ان جوابات کو دہرا دو، وہ یہ ذہانت دیکھ کر متحیر رہ گیا، اور خاموش ہو گیا، شیخ الاسلام کہتے ہیں کہ متون کے نقل اور مذاہب کے حفظ میں وہ ایک عجوبۂ روزگار تھے ان کو اس میں کچھ تکلف اور اہتمام نہیں کرنا پڑتا تھا[1]، ۶۵۲ھ میں ان کی وفات ہوئی ان کی سب سے مشہور تصنیف اور علمی یادگار "منتقی الاخبار" ہے، علماء نے ہر زمانہ میں اس کتاب سے استفادہ اور اس سے اعتناء کیا ہے، مصنف نے اس کتاب میں فقہی ابواب پر وہ احادیث جمع کر دی ہیں، جو اہل مذاہب کی دلیل اور ان کا ماخذ ہیں، آخر میں یمن کے مجتہد عالم اور سرآمد روزگار محدث علامہ محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۵ھ) نے "نیل الاوطار" کے نام سے آٹھ جلدوں میں اس کی شرح لکھی، جو اپنی حسن تلخیص و حسن ترتیب فیصلہ کن بحثوں، اور مصنف کی وسعتِ نظر اور وسعتِ قلب کی وجہ سے علمی و درسی حلقوں میں خاص وقعت رکھتی ہے۔

شیخ الاسلام کے والد شہاب الدین عبد الحلیم ابن تیمیہ عالم و محدث، حنبلی فقیہ اور صاحبِ درس و افتاء تھے، حران سے دمشق منتقل ہونے کے بعد انھوں نے دمشق کی جامع اموی میں جو اکابر علماء و مدرسین کا مرکز تھی، اور جہاں ہر عالم اور مدرس کا کام نہیں تھا کہ درس دے، باقاعدہ درس کا سلسلہ شروع کیا، ان کے درس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بالکل زبانی اور برجستہ ہوتا تھا، اور وہ اثنائے درس میں کسی کتاب سے مدد نہیں لیتے تھے، تمام تر اپنے حافظہ اور یادداشت پر اعتماد تھا، جامع اموی کے درس و وعظ کے ساتھ وہ دمشق کی دار الحدیث السکریہ کے شیخ الحدیث بھی تھے، وہیں ان کی سکونت بھی تھی، ۶۸۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، اور مقابر الصوفیہ میں مدفون ہوئے[2]۔

ولادت اور نقل سکونت

اس نامور اور مخلص علمی و دینی خاندان میں دوشنبہ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ میں تقی الدین ابن تیمیہ

---

[1] یہ سب خصوصیات ان کے پوتے کی طرف منتقل ہوئیں۔ [2] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۱۳ ص ۳۰۳

کی ولادت ہوئی، باپ نے احمد تقی الدین نام رکھا، بڑے ہو کر انھوں نے ابو العباس کنیت اختیار کی، لیکن خاندانی لقب ابن تیمیہ سب پر غالب آیا، اور وہ اسی نام سے مشہور رہیں۔

یہ زمانہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے تاتارگردی کا زمانہ تھا، سارا عالم اسلام ان کی ہیبت سے لرزہ براندام تھا، لیکن عراق و جزیرہ کی سرزمین خاص طور پر ان کی جولانگاہ تھی، ابن تیمیہ سات برس کے تھے کہ ان کا وطن حرّان تاتاری حملہ کی زد میں آگیا، تاتاریوں کے حملہ کے بعد علم و فضل، عزت و آبرو اور جان و مال کے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہ تھی، آخر مجبور ہو کر ان کا خاندان بھی شرفاء و علماء کے صدہا خاندانوں کی طرح کسی اسلامی ملک میں پناہ ڈھونڈھنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، عراق کی طرف جانے کا کوئی سوال نہ تھا، قریب تر ملک جو اس وقت تک تاتاری غارتگروں سے بچا ہوا تھا، شام تھا، جہاں مصر کے طاقتور مملوک سلاطین حکومت کر رہے تھے، آخر اس خاندان نے مغرب ہی کا رخ کیا اور دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس علمی خاندان نے اپنے قیمتی کتب خانہ کو جو کئی پشتوں کا اندوختہ اور ایک بڑا علمی سرمایہ تھا، جدا کرنا گوارا نہیں کیا، چنانچہ سب مال و متاع چھوڑ کر کتابیں ایک گاڑی پر بار کیں، اور روانہ ہو گئے، تاتاریوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا، ہر جگہ دہشت پھیلی ہوئی تھی، عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا، بڑی مشکل یہ تھی کہ جانوروں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی گاڑی خود کھینچنی پڑتی تھی، قافلہ افتاں و خیزاں چلا جا رہا تھا، ایک جگہ قریب تھا کہ تاتاری سر پر پہونچ جائیں، قباحت یہ ہوئی کہ کتابوں کی گاڑی چلتے چلتے رک گئی، خاندان کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور گریہ وزاری کی، اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور گاڑی کے پہیے کام کرنے لگے اور قافلہ آگے بڑھا۔[1]

دمشق میں

دمشق پہونچتے ہی اس علمی گھرانہ کی آمد کی خبر ہو گئی، اہل علم ابو البرکات مجد الدین ابن تیمیہ کے نام

---

[1] الکواکب الدریہ۔

اورکام سے واقف تھے، عبدالحلیم ابن تیمیہ کا علم و فضل بھی معروف تھا، چند دن کے اندر ہی جامع اموی اور دارالحدیث السکریہ میں ان کا درس شروع ہوگیا، اور وہ طلبہ اور حنبلی علماء کا مرجع بن گئے، اور اس خاندان کو اس نئے شہر میں کوئی غربت و اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔

کمسن احمد ابن تیمیہ نے جلد قرآن مجید کے حفظ سے فراغت کرلی، اور حدیث و فقہ و عربیت کی تحصیل میں مشغول ہوگئے، اس عرصہ میں اپنی نوعمری کے باوجود اپنے والد کی مجالسِ درس و وعظ اور علماء کے حلقوں میں شرکت کرتے تھے، اور علمی مذاکرات میں شریک رہتے تھے، جس سے ان کا اخاذ ذہن وسعت و ترقی حاصل کرتا تھا۔

غیر معمولی حافظہ

ابن تیمیہ کا خاندان قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں مشہور تھا، ان کے دادا اور والد دونوں بڑے قوی الحفظ تھے، لیکن تقی الدین ابن تیمیہ اس نعمت میں اپنے پورے خاندان سے سبقت لے گئے، اور بچپن ہی میں ان کے عجیب و غریب حافظہ اور سرعتِ حفظ نے علماء و اساتذہ کو متحیر کردیا، اور دمشق میں اس کی شہرت پھیل گئی، صاحبِ "العقود الدریہ" لکھتے ہیں کہ :-

> "ایک مرتبہ حلب کے ایک بڑے عالم دمشق آئے، انھوں نے سنا کہ ایک بچہ ہے جس کا نام احمد بن تیمیہ ہے اور وہ بہت جلد یاد کرلیتا ہے، ان کو اس کے دیکھنے اور امتحان لینے کا شوق ہوا، جس راستہ سے ابنِ تیمیہ گذرا کرتے تھے، وہاں وہ ایک درزی کی دکان پر بیٹھ گئے، درزی نے کہا کہ وہ بچہ آتا ہوگا، یہی اس کے مکتب کا راستہ ہے، آپ تشریف رکھئے، تھوڑی دیر میں کچھ بچے مکتب جاتے ہوئے گذرے، درزی نے کہا دیکھئے وہ بچہ جس کے پاس بڑی سی تختی ہے، وہی ابن تیمیہ ہے شیخ نے اس بچہ کو آواز دی، وہ آیا تو اس کی تختی لے لی، اور کہا کہ بیٹا اس تختی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے

اس کو پونچھ ڈالو، جب وہ صاف ہوگیا، تو انھوں نے اس پر کوئی ۱۱ یا ۱۳ حدیثیں لکھوادیں، اور کہا ان کو پڑھ لو، بچہ نے اس کو ایک مرتبہ غور سے پڑھا، شیخ نے تختی اٹھالی، اور کہا کہ سناؤ، بچہ نے پوری حدیثیں سنادیں، شیخ نے کہا کہ اچھا اب ان کو بھی پونچھ ڈالو، پھر چند سندیں لکھ دیں، اور کہا کہ پڑھو، بچہ نے ایک بار غور سے دیکھا، اور پھر سنا دیا، شیخ نے یہ تماشا دیکھ کر فرمایا کہ اگر یہ بچہ جیتا رہا تو کوئی چیز بنے گا، اس لئے کہ اس زمانہ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے[1]۔"

محدثین متقدمین کے حافظہ کے جو واقعات معتبر تاریخوں میں منقول ہیں، اور راویانِ حدیث اور ائمۂ ادب کے خداداد حافظہ کی جو مثالیں تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ واقعہ بالکل بعید از قیاس اور ناممکن نہیں، خود ابن تیمیہ کی بعد کی زندگی اور ان کے حفظ و نقل کے واقعات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کو غیر معمولی حافظہ عطا ہوا تھا۔

تعلیم و تکمیل

ابنِ تیمیہ نے بڑی محنت اور توجہ اور انہماک کے ساتھ علوم کی تحصیل شروع کی، ان کے مورخ اور معاصر بیان کرتے ہیں کہ ان کو کمسنی کے باوجود کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اور وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے، بایں ہمہ وہ زندگی اور اپنے زمانہ کی سوسائٹی، شہر کے حالات اور لوگوں کے اخلاق و عادات سے بے خبر اور بے تعلق نہیں تھے، ان کی تصنیفات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زندگی کا مطالعہ وسیع اور عمیق تھا، اور انھوں نے عوام سے الگ تھلگ کسی علمی گوشہ میں زندگی نہیں گزاری تھی۔

ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم کی تحصیل کی، انھوں نے عربیت کی طرف خاص توجہ کی اور لغت و نحو میں اعلیٰ بصیرت حاصل کی، امام نحو سیبویہ کی کتاب "الکتاب" (جو نحو کی سب سے مقبول اور مستند

---

[1] ابن تیمیہ (محمد ابوزہرہ) بحوالہ العقود الدریۃ۔ صہ ۲۱

کتاب ہے، یہاں تک کہ جب محض الکتاب کہا جائے تو اس سے کتاب سیبویہ ہی مراد ہوتی ہے) کا انھوں نے خاص طور پر بڑے غور و فکر سے مطالعہ کیا[۱] اور اس کے کمزور مقامات اور غلطیوں کی گرفت کی، عربیت اور لغت و نحو پر محققانہ اور ناقدانہ نظر رکھنے اور اپنے اس ادبی و نحوی ملکہ اور رسوخ سے انھوں نے اپنی علمی زندگی اور اپنی تصنیفات و مباحث میں بڑا کام لیا، نثر و نظم کا ایک بڑا حصہ انھوں نے محفوظ کیا، عرب جاہلیت اور عرب اولین کے حالات و واقعات تفصیل سے دیکھے اور اسلامی عہد اور اسلامی حکومتوں کی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا، یہ وسیع اور متنوع مطالعہ ان کو اپنے بعد کی گوناگوں علمی زندگی میں بہت کام آیا، ان کے معاصرین و مناظرین میں کوئی وسعتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، ان کے علمی تفوق کا یہ بھی ایک بڑا سبب تھا۔

نظری علوم کے علاوہ انھوں نے کتابت و خوشنویسی اور حساب و ریاضی کی طرف بھی توجہ کی اور ان کو ان کے اساتذہ سے حاصل کیا[۲]۔

علوم دینیہ میں فقہ و اصولِ فقہ، فرائض اور حدیث و تفسیر کی طرف پوری توجہ کی، فقہ حنبلی ان کے گھر کی چیز تھی، اور خود ان کے والد اس سلسلہ میں شفیق استاد، تجربہ کار عالم اور بہترین مشیر و رہنما تھے، اس زمانہ میں حدیث کی کتابت و حفظ اور سماع کا عام رواج تھا، ابنِ تیمیہ نے سب سے پہلے امام حُمیدی کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" حفظ کی، پھر اساتذۂ وقت اور علمائے وقت اور علمائے شام سے حدیث کی سماعت اور کتابت کی، ابن عبد الہادی کا بیان ہے کہ حدیث میں ابنِ تیمیہ کے شیوخ کی تعداد دو سو[۲۰۰] سے متجاوز ہے[۳]، ان کے خاص شیوخِ حدیث میں ابن عبد الدائم المقدسی اور ان کے طبقہ کے لوگ ہیں، مسند امام احمد کی کئی بار سماعت کی، اسی طرح صحاح ستہ کی سماعت کی کئی بار نوبت آئی[۴]۔

تفسیر ابن تیمیہ کا محبوب موضوع تھا، اور ان کو اس سے خاص دلچسپی تھی، ان کا خود بیان ہے کہ

---

[۱] الکواکب الدریہ ۲-۳-۴ [۲] ایضاً ص ۲

انھوں نے تفسیرِ قرآن میں چھوٹی بڑی.. اسے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا،[1] اس فن سے ان کو فطری مناسبت تھی، قرآن مجید کی تلاوت، تدبّر اور مطالعہ کی کثرت سے اللہ تعالیٰ نے ان پر علوم قرآن کا خاص افاضہ فرمایا تھا، کتابوں کے علاوہ خود صاحبِ کتاب کی طرف رجوع کرتے تھے، اور اس سے فہم قرآن اور شرحِ صدر کی دولت مانگتے تھے، اپنی طالب علمی اور اپنے تدبّر فی القرآن کے طریقہ کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں:۔

ربما طالعت علی الآیۃ الواحدۃ نحو مائۃ	بعض اوقات ایک آیت کے لئے میں نے سو سو تفسیروں
تفسیر ثمّ اسئال اللّٰہ الفھم، واقول یا مُعلّم	کا مطالعہ کیا ہے، مطالعہ کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے
آدم وابراھیم علّمنی، وکنت اذھب الی	دعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عنایت ہو، میں عرض
المساجد المھجورۃ ونحوھا وامرّغ وجھی	کرتا کہ "اے آدم و ابراہیمؑ کے معلّم میری تعلیم فرما" میں سنسان
فی التراب واسئال اللّٰہ تعالیٰ واقول "یا معلّم	اور غیر آباد مسجدوں اور مقامات کی طرف چلا جاتا اپنی
ابراھیم فھّمنی"[2]	پیشانی خاک پر ملتا اور کہتا کہ "اے ابراہیم کو تعلیم دینے
	والے مجھے سمجھ عطا فرما"!

اس زمانہ میں (بالخصوص مصر و شام میں) اشاعرہ کے علم کلام کا زور تھا، سلطان صلاح الدین خود اشعری العقیدہ تھا، مورخ مصر مقریزی کا بیان ہے کہ سلطان نے بچپن میں قطب الدین ابوالمعالی اشعری کا متن (جو انھوں نے عقائد کے بارے میں تصنیف کیا تھا) حفظ کیا تھا، اور بعد میں اپنے خاندان کے بچوں کو حفظ کراتا تھا، اس نے اور اس کے جانشینوں (بنی ایوب) نے لوگوں کو اشعری عقیدہ کا پابند کر دیا تھا، ان کے زمانہ اور ان کے جانشینوں (ممالکِ مصر) کے زمانہ تک اشعری عقیدہ کو حکومت کی سرپرستی اور حمایت حاصل تھی۔

حنابلہ صحیح یا غلط طریقہ پر اشاعرہ کے حریف اور مدّمقابل سمجھے جاتے تھے، دونوں فریق بحث و گفتگو میں مشغول رہتے، اشاعرہ کا علم کلام اور طریق اثبات عقلی استدلال اور منطقی برہان پر مبنی تھا، حنابلہ نصوص

---

[1] تفسیر سورۃ النور (ابن تیمیہ) ص ۱۳۶ [2] العقود الدریۃ ص ۲۶

اور آیات واحادیث کے ظاہری مفہوم سے بحث کرتے تھے علم کلام میں عدم تعمق اور منطق وفلسفہ سے عدم اشتغال کی وجہ سے بعض اوقات بحث ومناظرہ میں حنابلہ کا پلڑا ہلکا معلوم ہوتا تھا، اور ان کے متعلق یہ تخیّل قائم ہوتا جاتا تھا کہ وہ عقلیات سے بے خبر اور ظاہری و سطحی علم کے لوگ ہیں، غالباً اسی احساس نے ابن تیمیہ جیسے غیور و ذکی الحس نوجوان عالم کو علم کلام کے وسیع اور گہرے مطالعہ اور عقلیات اور فلسفہ و منطق سے براہِ راست واقفیت کی طرف متوجہ کیا، انھوں نے ان علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور ان پر ایسا عبور حاصل کیا کہ وہ خود ان علوم کی کمزوریوں اور ان کے مصنفین وائمہ حتیٰ کہ حکمائے یونان کی غلطیوں سے واقف ہوگئے اور انھوں نے ان علوم کی تنقید میں ایسی مدلّل اور عالمانہ کتابیں لکھیں جن کا جواب فلسفہ کا پورا حلقہ نہیں دے سکا۔

غرض ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ میں کتاب وسنت کی ترجمانی، دین کی صداقت و برتری ثابت کرنے اور علمی وعملی گمراہیوں کو دور کرنے کے لئے ایسی وسیع اور مکمل علمی تیاری کی جس کی اس ترقی یافتہ علمی دور اور فکری و دینی انتشار کے زمانہ میں ضرورت تھی، انھوں نے ان تمام اسلحہ کا استعمال سیکھا جن سے ان کے حریف اور مخالفین اسلام (یہود و نصاریٰ، فلاسفہ اور باطنیہ) مسلح تھے، انھوں نے وہ علمی تبحر پیدا کیا کہ ان کے معاصرین دیکھ کر دنگ رہ گئے، ان کے مشہور حریف علامہ کمال الدین الزملکانی ان کی علمی جامعیت اور ہمہ دانی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

قد الان الله له العلوم کما الان لداؤد	ابن تیمیہ کے لئے اللہ تعالےٰ نے علوم اس طرح نرم
الحدید کان اذا سئل عن فن من العلم	کر دیئے تھے، جیسے داؤد (علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ
ظن الرائی والسّامع انّہ لایعرف غیر	والسلام) کے لئے لوہا نرم کر دیا تھا، جس علم کے بارہ
ذالک الفن وحکم ان احداً لایعرفہ	میں ان سے سوال کیا جاتا، اس طرح جواب دیتے کہ
مثلہ وکان الفقہاء من سائر الطوائف	دیکھنے والا یا سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ اس فن کے سوا کچھ
اذا جلسوا معہ استفادوا فی مذاھبھم	نہیں جانتے اور یہ فیصلہ کرتا کہ ان کی طرح کوئی اس

منه مالم یکونوا عرفوہ قبل ذالک،
ولا یعرف انہ ناظر احداً فانقطع منہ
ولا تکلم فی علم من العلوم سواءً کان
من علوم الشرع او غیرھا الا فاق فیہ
اھلہ والمنسوبین الیہ وکانت لہ
الید الطولیٰ فی حسن التصنیف۔[1]

فن کا عالم نہیں، ہر مذہب و فقہ کے علماء جب
ان کی مجلس میں شریک ہوتے تو ان کو کوئی نہ کوئی
ایسی چیز معلوم ہوتی جو ان کو پہلے سے معلوم نہیں
تھی یہ کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے کسی سے مناظرہ کیا ہو
اور بند ہوگئے ہوں، جب کبھی انھوں نے کسی شرعی یا
عقلی علم میں کلام کیا تو ماہرین فن سے اور اس کے مخصوص
عالموں سے بڑھ گئے، تصنیف میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

ابنِ تیمیہ کا پہلا درس

ابھی ابن تیمیہ کی عمر ۲۲ ہی سال کی تھی کہ (۶۸۲ھ میں) ان کے جلیل القدر والد عبدالحلیم ابن تیمیہ کا انتقال ہوا، اور دارالحدیث السکریہ میں ان کی مسند درس خالی ہوگئی۔

لیکن یہ مسند درس زیادہ دن خالی نہیں رہنے پائی، ۲ محرم ۶۸۳ھ کو ان کے قابلِ فخر فرزند احمد تقی الدین ابن تیمیہ نے اس کو زینت دی اور پہلا درس دیا، اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی، درس میں دمشق کے مشہور فضلاء و عمائد شریک تھے، قاضی القضاۃ بہاء الدین ابن الزکی الشافعی بنفس نفیس موجود تھے، علماء شافعیہ میں سے ان کے علاوہ شیخ الشافعیہ شیخ تاج الدین الفزاری، علمائے حنابلہ میں سے زین الدین بن المنجا الحنبلی اور دوسرے سربرآوردہ علماء حاضر تھے، اس درس سے تمام حاضرین بیحد متاثر اور نوجوان عالم کے تبحر علمی، حاضر دماغی اور جرأت و فصاحت کے معترف تھے، حافظ ابن کثیر جو شیخ الاسلام کے تلامذہ میں ہیں ۶۸۳ھ کے واقعات کے ضمن میں اس درس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

[1] الکواکب الدریۃ ص۸

وكان درسا هائلا وقد كتبه الشيخ	یہ محیر العقول درس تھا، شیخ تاج الدین الفزاری
تاج الدين الفزاري بخطه لكثرة فوائده	نے اس کے کثیر فوائد اور لوگوں کی عام پسندیدگی کی
وكثرة ما استحسنه الحاضرون وقد اطنب	وجہ سے اس کو اپنے قلم سے ضبط کیا، حاضرین نے
الحاضرون في شكره، على حداثة سنه و	ابن تیمیہ کی کم عمری اور جوانی کی بنا پر اس درس کی
صغره فانه كان عمره اذ ذاك عشرين	بڑی تعریف کی، اور ان کو بہت داد دی، اس لئے
سنة وسنتين۔[1]	کہ ان کی عمر اس وقت ۲۲ سال کی تھی۔

اگلے مہینہ (صفر) کی دسویں تاریخ کو جمعہ کے دن ابن تیمیہ نے اپنے والد کی جگہ پر جامع اموی میں تفسیر کا درس دیا، ان کے لئے خاص طور پر منبر رکھا گیا تھا، انھوں نے سلسلہ وار تفسیر بیان کرنی شروع کی، روز بروز مجمع میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ اپنے درس تفسیر میں اس کثرت سے علوم اور جدید مضامین بیان کرتے تھے کہ سامعین کی تعداد بڑھتی چلی گئی، اسی کے ساتھ ان کی دینداری زہد و عبادت کی وجہ سے لوگ اور گرویدہ ہوتے تھے، اور ان کی شہرت دور دور کے شہروں اور ملکوں میں پھیلتی جاتی تھی، کئی برس تک ان کا یہی معمول رہا۔[2]

حج

۶۹۲ھ میں ابن تیمیہ نے شامی قافلہ کے ساتھ جس کے امیر الباسطی تھے، حج کیا، معان میں جب یہ قافلہ پہنچا تو ایک بڑی تند و تیز ہوا چلی جس میں بہت سے آدمی کام آئے، اونٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکے کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔[3]

شاتم رسول کی تعزیر

۶۹۳ھ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ابن تیمیہ کی دینی حمیت اور ایمانی جذبہ کا

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۳۰۳ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۳۳۳

عملی اظہار ہوا، دمشق میں عسّاف نامی ایک عیسائی کے متعلق ایک جماعت نے گواہی دی کہ اس نے حضرت سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے، اس جرم کے بعد اس نے ایک عرب سردار کے پاس پناہ لی، یہ سن کر ابن تیمیہ اور دارالحدیث کے شیخ زین الدین الفارقی اکٹھا ہوکر نائب السلطنت عزالدین ایبک الحموی کے پاس گئے، اور اس واقعہ کی طرف توجہ دلائی، امیر نے اس کو منظور کیا اور مجرم کو بلا بھیجا، شیخین حاکم کے پاس سے جارہے تھے، اور ان کے ساتھ ایک مجمع کثیر تھا کہ عسّاف کو لوگوں نے آتا ہوا دیکھا، اس کے ساتھ ایک عرب بھی تھا، مجمع یہ دیکھ کر عرب کو گالیاں دینے لگا، عرب نے کہا کہ یہ عیسائی تم سے بہتر ہے، مجمع یہ سن کر مشتعل ہوگیا، اور دونوں پر سنگ باری کرنے لگا اور ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، حاکم نے دونوں عالموں (ابن تیمیہ اور فارقی) کو بلایا، اور اپنے سامنے ان کو زدوکوب کیا، عیسائی مسلمان ہوگیا، اور اس کی حفاظت کی ضمانت کی گئی، بعد میں دونوں عالموں کو چھوڑ دیا گیا، اور حاکم نے ان سے معافی مانگی، اسی زمانہ میں ابن تیمیہ نے اپنی مشہور کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرّسول" لکھی۔[1]

۱۴ شعبان ۶۹۵ھ میں شیخ الحنابلہ علامہ زین الدین بن منجیٰ شیخ المدرسۃ الحنبلیہ نے وفات پائی، تو ان کی قائم مقامی اور مدرسہ حنبلیہ کی صدارت تدریس بھی ابن تیمیہ کے سپرد ہوئی۔[2]

پہلی مخالفت

ابن تیمیہؒ درس و تدریس میں مشغول تھے، اور عوام و خواص میں ان کی مقبولیت و شہرت روز افزوں تھی کہ ۶۹۸ھ میں ان کے خلاف پہلی شورش برپا ہوئی، اور ان کی ذات اور ان کے عقائد موضوعِ بحث بنے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ۶۹۸ھ میں شہر حماۃ (شام) کے چند باشندوں نے ایک استفتاء مرتب کرکے بھیجا، جس میں دریافت کیا گیا تھا کہ "الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" "ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ"

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۳ ص ۳۳۵-۳۳۶ [2] ایضاً ص ۳۴۴

جیسی آیات اور "ان قلوب بنی آدم بین اصبعین من اصابع الرحمٰن" اور "یضع الجبار قدمہ فی النار"
وغیرہ احادیث کے بارہ میں علماء کی کیا تحقیق، اور صفات کے بارہ میں علماء اہلِ سنت کا کیا مسلک ہے؟

شیخ الاسلام نے اس کا بسوط و مفصل جواب[1] دیا، صفات کے بارہ میں صحابہ، تابعین، ائمۂ مجتہدین، متکلمین، متقدمین (امام ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر الباقلانی، اور امام الحرمین تک) کا مسلک ان کے اقوال اور ان کی تصانیف سے بیان کیا، اور ان کی کتابوں کے اقتباسات سے ثابت کیا کہ سب حضرات ان صفات پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں، ان کی وہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق اور اس کی ذات (لیس کمثلہ شیٔ) کے لائق اور تشبیہ و تجسیم نیز نفی و تعطیل سے منزّہ اور پاک ہے، یعنی نہ تو ان صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس کرتے ہیں، نہ تنزیہ و تقدیس کے غلو و افراط میں ان کی نفی اور ان کا انکار کرنے لگتے ہیں، نہ ان کی ایسی تاویل کرتے ہیں جس سے وہ حقیقت سے دور اور محض کنایہ اور مجاز بن کر رہ جائیں، بلکہ جس طرح خود اس کی ذات اور اس کی صفات سبعہ (حیاۃ، علم، قدرت، سمع، بصر، کلام، ارادہ) پر ایمان لاتے ہیں، اور ان کی وہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں، جو ذاتِ الٰہی اور شانِ خداوندی کے لائق ہے، اسی طرح الفاظ منصوص، وجہ، ید، غضب و رضاء فی السماء علی العرش، فوق کو بھی حقیقۃً بلا کسی تاویل کے تسلیم کرتے ہیں، اور ان کی وہ حقیقت ثابت کرتے ہیں، جو اس منزہ و مقدس ذات اور بے چوں و بیچگوں و بے مثال و بے قیاس ہستی کے شایانِ شان ہے، ان دونوں قسم کی صفات میں ان حضرات کا مسلک اور رویہ علیحدہ علیحدہ اور متضاد نہیں ہے، اور جس طرح حیات، علم، قدرت وغیرہ پر ایمان لانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخلوقات اور محدثات کی سی کمزور حیات اور ان کا محدود و مستعار علم اور ناقص قدرت مراد ہے، اور نہ ان صفات کی حقیقت پر

---

[1] یہ جواب "العقیدۃ الحمویۃ الکبریٰ" کے نام سے مشہور ہے، یہ تقریباً ۵۰ صفحہ کا رسالہ ہے جو مجموعۃ الرسائل الکبریٰ میں شامل ہے اور ۱۳۲۳ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے۔

ایمان لانے والے کو "مجسمہ" کا خطاب دیا جاسکتا ہے، اسی طرح "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ، وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ، اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی، أَأَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ" پر بلا تاویل ایمان لانے سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مخلوق و حادث کا سا وجہ اور ید مراد ہے، اور اسی طرح کی فوقیت و مکانیت مقصود ہے جو ایک محدود کی دوسرے محدود پر اور ایک جسم کی دوسرے جسم کے ساتھ ہوتی ہے، اور نہ ان صفات کی حقیقت پر ایمان لانے والے کو تجسیم و تشبیہ کا طعنہ دینا درست ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سلف اولین اور متکلمین متقدمین کے جو اقوال اور عبارتیں نقل کی ہیں، ان سے اسی مسلک کی تائید ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "اس کے خلاف نصًّا و ظاہرًا ایک لفظ بھی صحابہ و تابعین و سلف سے ثابت نہیں، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ آسمان پر نہیں ہے، یا وہ عرش پر نہیں ہے، یا وہ ہر جگہ ہے، اور یہ کہ تمام امکنہ اس کی نسبت سے یکساں ہیں اور یہ کہ نہ وہ عالم میں داخل ہے، نہ اس سے خارج ہے نہ متصل ہے، نہ منفصل ہے، اور یہ کہ اس کی طرف انگلیوں سے حسّی طور پر اشارہ جائز نہیں، اگر مسلک وہی صحیح ہے، جو نفی کرنے والوں کا ہے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ہمیشہ اس کے خلاف الفاظ کیوں بولتے رہے، اور حق کے اظہار سے ساری عمر کیوں خاموش رہے؟ یہاں تک کہ یہ ایرانی اور رومی اور یہود و فلاسفہ کے پروردہ آئیں اور امت کو صحیح عقیدہ کی تعلیم کریں!

پھر انھوں نے ثابت کیا کہ متکلمین متاخرین کچھ تو فلسفۂ یونان کے اثر سے اور کچھ تنزیہ کے جوش و غلو میں ان صفات کی ایسی تاویل کرنے لگے کہ جو حقیقت لغوی، فہم صحابہ اور نصوصِ حدیث سے بہت دور جا پڑی، اور جس کی سرحد نفی و تعطیل سے ملنے لگی، اس سلسلہ میں وہ علمائے سلف، ائمہ سنت، اور خود متکلمین متقدمین کے مسلک سے دور ہو گئے، یہاں تک کہ وہ سلف کے متعلق ایسے لفظ بولنے لگے، جس سے ان کے علم کی تحقیر ہوتی ہے، جو بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سلف کا طریقہ زیادہ مامون و بے خطر، مگر خلف کا طریقہ زیادہ علمی اور پر از حکمت ہے، یہ سب سلف کی حقیقت اور

مقام سے ناآشنائی کا نتیجہ اور ناواقفیت کی دلیل ہے، اصل علم سلف کو حاصل تھا، بھلا وارثین انبیاء نائبینِ رسُل، حاملین کتاب وسنت سے معرفت الٰہی اور اسماء وصفات کے فہم میں وہ لوگ کیا مقابلہ کرسکتے ہیں، جو مدعیانِ فلسفہ کے چوزے بچے اور ہند ویونان کے خوانِ نعمت کے زلّہ ربا ہیں، فلاسفہ ومتکلمین کے آخری اقوال اور دنیا سے کوچ کرنے کے وقت کے مقولے بتلاتے ہیں کہ وہ اپنی موشگافیوں پر نادم، عالم حیرت میں سرگرداں اور اپنی ناکامی وبے حاصلی پر ماتم کناں تھے، ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ "ہماری ساری عمر کا اندوختہ قیل وقال کے سوا کچھ نہیں" کسی نے کہا کہ دریائے ناپیدا کنار میں غوطے لگائے، اہلِ اسلام کے علوم کو چھوڑ کر بیاباں کی خاک چھانی، اب یہ حال ہے کہ اگر لطفِ خداوندی نے دستگیری نہ کی تو میں کہیں کا نہ رہا، گواہ رہنا کہ اپنی ماں کے عقیدہ پر مر رہا ہوں۔"

یہ فتویٰ ایک مستقل علمی رسالہ ہے جس میں شیخ الاسلام کی علمی وتصنیفی خصوصیات پوری موجود ہیں روانی، قوتِ استدلال، خطابت، قرآن وحدیث سے حسن استشہاد، جدّتِ اسلوب عقلِ عام سے اپیل، برجستگی وبے تکلفی، تاریخی معلومات، متکلمین وفلاسفہ پر بیباک تنقید، یہ سب وہ خصوصیات ہیں، جو اس زمانہ کی عام تصانیف بالخصوص فتاویٰ میں (جو عموماً فقہی واصطلاحی زبان میں لکھے جاتے تھے) ناپید ہیں۔

اس فتویٰ میں پہلی مرتبہ انھوں نے ایسے واضح اور طاقتور طریقہ پر اس عقیدہ کی توضیح وتبلیغ کی تھی، جو ان کے نزدیک سلف کا عقیدہ اور اہلِ سنت کا اعتقاد تھا، اور ان کے مخالفین کے نزدیک "تجسیم" کا عقیدہ اور بگڑی ہوئی حنبلیت تھی، یہ فتویٰ جس لب ولہجہ اور جس تحدّی (چیلنج) کے انداز میں لکھا گیا تھا، اور حنبلی حلقوں میں جس طرح اس کا استقبال ہوا، اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اشاعرہ ومتکلمین کے حلقہ میں جن کو جمہور اور حکومت کی تائید حاصل تھی، اور جو قضاء وافتاء کے سرکاری منصبوں سے لے کر درس وتصنیف کے علمی حلقوں تک پر حاوی تھے، ناراضگی کی ایک لہر اور عام برہمی کی کیفیت پیدا ہو جائے، ابن کثیر ۶۹۸ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

"علماء کا ایک گروہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی مخالفت میں کھڑا ہو گیا، ان کا اصرار تھا کہ وہ حنفی قاضی شیخ جلال الدین کی مجلس میں حاضر ہوں، اور اس فتویٰ کے متعلق صفائی پیش کریں، ابن تیمیہ نے اس کو منظور نہیں کیا، اس پر شہر میں منادی کرا دی گئی کہ یہ فتویٰ قابلِ قبول نہیں، لیکن امیر سیف الدین جاغان نے ابن تیمیہ کی حمایت کی، اور ان لوگوں کو طلب کیا جنھوں نے ہنگامہ کیا تھا، مگر ان میں سے اکثر روپوش ہو گئے، امیر نے منادی کرنے والوں میں سے ایک گروہ کو زدوکوب کیا، جس سے باقی خاموش ہو گئے، جب جمعہ کا دن آیا تو شیخ اپنی عادت کے مطابق جامع مسجد میں گئے اور (انک لعلیٰ خلق عظیم) کی تفسیر بیان کی، اگلے روز سنیچر کو وہ قاضی امام الدین (شافعی) کے پاس گئے اور فضلاء کی ایک جماعت بھی وہاں آ گئی، ان سب نے فتویٰ حمویہ کے بارے میں ان سے سوال و جواب کیا، اور کئی مقامات کی توضیح چاہی، انھوں نے سب کو مطمئن اور خاموش کر دیا، شیخ واپس آ گئے، اور حالات اعتدال پر آ گئے۔"[1]

ممکن ہے یہ قصہ طول پکڑتا، اور پھر کوئی مخالفت یا شورش پیدا ہوتی، مگر اس کے بعد ہی ایسے حالات پیش آئے کہ ایک عرصہ تک کسی ایسے علمی اختلاف اور بحث و مناظرہ کی فرصت اور ہوش باقی نہیں رہا، یہ تاتاریوں کا حملہ تھا، جس میں شیخ الاسلام پہلی مرتبہ ایک عظیم الشان مجاہد اور ایک عمومی قائد کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔

تاتاریوں کا رُخ دمشق کی طرف

سنہ ۶۹۹ھ کا نیا سال شروع ہی ہوا تھا کہ متواتر اطلاعیں اس مضمون کی ملیں کہ ایران و عراق کے تاتاری فرمانروا قازان[2]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۱۴ ص ۴۔ [2] قازان جس کا اسلامی نام محمود ہے چنگیز خاں کا پرپوتا تھا، ۶۹۴ھ میں اس نے امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغ و ترغیب سے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن پانچ سال کے مختصر عرصہ میں سیرت و اخلاق کی یکسر تبدیلی اور اسلامی تعلیم و تربیت کی زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی، اس لئے باوجود مسلمان ہو جانے کے تاتاریوں کی دہشت انگیزی، غارتگری اور سفاکی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا تھا۔

کی نیت شام پر حملہ کرنے کی ہے اور اس کی فوجوں کا رخ دمشق کی جانب ہے، تاتاریوں کے حملہ کے جو تلخ تجربات اسلامی ممالک کو تھے اور جو روایات قائم ہو چکی تھیں ان کی بنا پر پورے ملک شام میں اس اطلاع سے ایک دہشت پھیل گئی، حلب و حماۃ سے جو دار السلطنت سے فاصلہ پر ہیں، لوگ نکل نکل کر دار السلطنت کا رخ کرنے لگے یہاں تک کہ صرف حماۃ سے دمشق تک گھوڑے کا کرایہ دو سو درہم ہو گیا، لیکن لوگوں کو بہت جلد یہ سن کر اطمینان ہوا کہ سلطان مصر (الملک الناصر محمد بن قلاوون) افواج شاہی کے ساتھ شام کی حفاظت اور تاتاریوں کے مقابلہ کے لئے آرہا ہے، ۸ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو مصری افواج دمشق میں داخل ہوئیں، اہلِ شہر نے سخت بارش اور کیچڑ کے باوجود بڑی گرمجوشی سے سلطان اور اس کی افواج کا استقبال کیا، شہر آراستہ کیا گیا، جابجا اس کے لئے اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعائیں کی گئیں، ۱۷ ربیع الاول کو سلطان اپنے عساکر کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلا، حنفی قاضی القضاۃ اور بڑے بڑے علماء اور اعیان شہر ہمرکاب ہوئے، پورا لشکر ساتھ تھا، مجاہد رضا کاروں اور نئے رنگروٹوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی، مسجدوں میں قنوتِ نازلہ اور دعاؤں کا خاص اہتمام کیا گیا۔

سلطان مصر کی شکست اور دمشق کی حالت

دمشق کے باہر ۲۷ ربیع الاول کو قازان اور سلطان کے درمیان معرکہ پیش آیا، مسلمان جم کر لڑے اور بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن مسلمانوں کو شکست ہوئی، سلطانی افواج نے مصر کا رخ کیا اور اہل دمشق نے دمشق میں پناہ لی، اس شکست، مصری افواج کی واپسی اور تاتاریوں کے فاتحانہ دمشق میں داخل ہونے کے خطرہ سے شہر میں بدحواسی پھیلی ہوئی تھی، بڑے بڑے علماء اور سرآوردہ اشخاص شہر چھوڑ چھوڑ کر مصر کا رخ کر رہے تھے، خود قاضی شافعی، قاضی مالکی بعض دوسرے نامور علماء، حاکم شہر، محتسب اور بڑے بڑے تاجر اور عوام شہر چھوڑ چکے تھے، حکومتی عملہ رخصت ہو چکا تھا، حکام میں سے صرف منتظم قلعہ ابھی مقیم تھا اور نہ

کوئی ذمہ دار حاکم اور منتظم شہر میں موجود نہ تھا، گرانی حد کو پہنچی ہوئی تھی، باہر کی آمد و رفت موقوف تھی، اس پر طرفہ یہ ہوا کہ قیدی جیل خانہ توڑ کر باہر نکل آئے، اور انھوں نے شہر میں لوٹ مچادی، اوباشوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا، باغات (جو اہلِ دمشق کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے) کے دروازے توڑ ڈالے اور دروازے اور کھڑکیاں اکھاڑ کر لے گئے، اور اونے پونے کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا، اِدھر دمشق میں یہ طوفان بے تمیزی برپا تھا، اُدھر قازان کی آمد آمد کا غلغلہ تھا جس سے رہے سہے حواس اور پراگندہ تھے۔

ابن تیمیہؒ کی قازان سے ملاقات

یہ حالات دیکھ کر اعیانِ شہر اور ابن تیمیہؒ نے مشورہ کیا، اور یہ قرار پایا کہ ابن تیمیہؒ چند علماء اور رفقاء کی معیت میں قازان سے ملاقات کریں اور دمشق کے لئے پروانۂ امن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

دوشنبہ ۳ ربیع الثانی ۶۹۹ھ کو مقام نبک[1] میں اہلِ دمشق کے نمائندہ اور اسلام کے سفیر ابن تیمیہؒ اور تاتاریوں کے جبار بادشاہ قازان کی ملاقات ہوئی، شیخ کمال الدین بن الانجا جو دمشق سے ابن تیمیہؒ کے ساتھ گئے تھے، اور اس مجلس میں شریک تھے، اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں:۔

"میں شیخ کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھا، وہ سلطان (قازان) کو عدل و انصاف کی آیات و احادیث اور اللہ و رسولؐ کے ارشادات و احکام سناتے تھے، ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی، اور برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کے گھٹنے اس کے گھٹنے سے مل جائیں، سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہیں ہوئی، وہ بڑی توجہ سے کان لگائے ان کی گفتگو سن رہا تھا، اور ہمہ تن متوجہ تھا، اس پر ان کا رعب ایسا طاری تھا، اور وہ ان سے ایسا متأثر

---

[1] یہ مقام دمشق اور حمص کے درمیان واقع ہے، وہاں کا پانی خاص طور پر مشہور ہے، آج کل ایک سیرگاہ ہے، ۱۹۵۱ء میں حمص جاتے ہوئے راقم سطور نے یہ جگہ دیکھی تھی۔

تھا کہ اس نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہ عالم کون ہیں؟ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا، اور نہ اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور قوی القلب آج تک دیکھنے میں آیا مجھ پر ابھی تک کسی کا ایسا اثر نہیں پڑا تھا، لوگوں نے ان کا تعارف کرایا، اور ان کے علمی اور عملی کمالات کا تذکرہ کیا۔

ابن تیمیہؒ نے قازان سے کہا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور موذنین بھی رہا کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا، حالانکہ تمہارے باپ اور دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے محترز رہے، انھوں نے جو کچھ عہد کیا تھا، وہ پورا کیا، اور تم نے جو عہد کیا تھا، وہ توڑ دیا، اور جو کچھ کہا تھا، اس کو پورا نہیں کیا، اور بندگانِ خدا پر ظلم کیا۔"

شیخ کمال الدین کہتے ہیں کہ ایسی سخت گفتگو کرنے کے باوجود شیخ بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس آئے تاتاریوں کے ہاتھ میں جو مسلمان قید تھے، ان کی بڑی تعداد ان کی حُسنِ سفارش سے چھوڑ دی گئی، شیخ کہا کرتے تھے کہ غیر اللہ سے تو وہ ڈرے گا جس کے دل میں کوئی بیماری ہے، امام احمد ابن حنبل سے کسی نے حکام سے اپنے اندیشہ اور خوف کا اظہار کیا، فرمایا کہ "اگر تم تندرست ہوتے تو کسی سے نہ ڈرتے"[1]

ایک دوسرے ہمراہی قاضی القضاۃ ابو العباس اتنا اور اضافہ کرتے ہیں:۔

"اس مجلس میں ابن تیمیہؒ اور ان کے رفقاء کے سامنے کھانا رکھا گیا، اور سب شریک ہو گئے لیکن ابن تیمیہ دست کش رہے، دریافت کیا گیا کہ آپ کیوں نہیں شرکت کرتے؟ فرمایا کہ یہ کھانا کب جائز ہے؟ یہ تو غریب مسلمانوں کی بھیڑ بکریوں کے گوشت سے تیار کیا گیا ہے، اور لوگوں کے درختوں کی لکڑی کے ایندھن سے پکا گیا ہے، قازان نے ان سے دعا کی درخواست کی، شیخ نے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی کہ خدایا اگر آپ کے نزدیک قازان کا اس جنگ سے مقصد تیرے کلمہ کی بلندی اور

---

[1] "الکواکب الدریۃ فی مناقب الامام المجتهد شیخ الاسلام ابن تیمیہ" تالیف الشیخ مرعی ابن یوسف الکرمی الحنبلیؒ صـ۲۵ شامل مجموعہ فرج اللہ زکی الکردی صـ۱۶۲

بہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس کی مدد فرما، اور اگر سلطنت دنیا اور حرص و ہوس ہے تو اسے تو سمجھ لے حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ دعا کر رہے تھے اور قازان آمین کہہ رہا تھا ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اپنے کپڑے سمیٹ رہے تھے کہ اب جلاد کو ان کی گردن مارنے کا حکم ہوگا، ان کے خون کی چھینٹیں ہمارے دامن پر کیوں آئیں؟!

ابوالعباس کہتے ہیں کہ :۔

"جب مجلس برخاست ہوئی اور ہم دربار کے باہر آئے تو ہم نے کہا کہ آپ نے تو ہماری ہلاکت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، ہم اب آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے، انھوں نے کہا کہ میں خود تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا چنانچہ ہم لوگ تو روانہ ہوگئے اور وہ ذرا دیر ٹھہر کر واپس ہوئے، خوانین و امراء کو جب اس واقعہ کی اطلاع اور ان کی موجودگی کا علم ہوا تو ہر طرف سے انھوں نے ہجوم کیا، اور برکت و حسن اعتقاد میں چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا، اور وہ اس شان سے دمشق واپس ہوئے کہ تین سو سواران کی رکاب میں تھے۔

اس کے مقابلہ میں ہم پر یہ گزری کہ ہم راستہ میں تھے کہ ایک گروہ حملہ آور ہوا، اور اس نے ہمارے کپڑے اتار لئے۔"[1]

دمشق میں تاتاریوں کی بے عنوانیاں

اہل دمشق کو اگرچہ تاتاری سلطان کی طرف سے پروانۂ امن مل گیا تھا، اور اس کا دمشق میں اعلان بھی ہوگیا تھا لیکن دمشق کے اطراف و نواح میں تاتاریوں کی غارتگری اور بے آئینی جاری تھی، اور شہر پناہ سے باہر ایک غدر سا مچا ہوا تھا، شہر میں نرخ بہت چڑھ گئے تھے، اور گرانی بےحد تھی، اِدھر تاتاریوں نے اہل دمشق سے مطالبہ کیا کہ حکومت سابقہ کے جتنے گھوڑے، ہتھیار، اور نقد لوگوں کے پاس چھپا ہوا ہے

---

[1] الکواکب الدریۃ ص ۲۵

وہ تاتاریوں کے حوالہ کردیا جائے' تاتاریوں نے سیف الدین[1] قبجق کو اپنی طرف سے حاکم شام مقرر کیا اور اس نے اہلِ شہر پر سختی شروع کی، شہر پر تاتاریوں کا قبضہ مکمل طور پر ہوچکا تھا صرف قلعہ، قلعہ دار ارجواش نے حوالہ نہیں کیا تھا، اور صاف انکار کردیا تھا، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس کے محرک ابن تیمیہؒ تھے" انھوں نے قلعہ دار کو پیغام بھیجا کہ جب تک قلعہ کی ایک اینٹ بھی سلامت ہے، قلعہ تاتاریوں کے حوالہ نہ کرنا" قلعہ دار نے آخر وقت تک اس پر عمل کیا اور تاتاریوں کا اس پر عمل دخل اخیر تک نہ ہوسکا[2] تاتاریوں نے شہر میں دست درازیاں شروع کیں اور قدیم روایات کے مطابق ہر طرح کی بے عنوانیاں کیں بکثرت مسلمان مرد عورت قید کئے، اور غلام بنائے، صرف محلہ صالحیہ کے چار سو افراد قتل اور چار ہزار کے قریب گرفتار ہوئے' بڑے بڑے شریف خاندانوں اور علماء کے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں غلام اور باندیاں بنالی گئیں، کتب خانے لوٹ لئے، اور وقف کی کتابیں کوڑیوں کے مول بکیں۔

یہ حال دیکھ کر ابن تیمیہ نے دوبارہ قازان سے ملاقات ضروری سمجھی، وہ ایک جماعت کے ساتھ ۲۵ ربیع الثانی کو پھر سلطان سے ملنے گئے لیکن دو روز انتظار کرنے کے باوجود ان کو سلطان سے ملنے نہیں دیا گیا، اس عرصہ میں دمشق میں خبر گرم ہوئی کہ تاتاری (جو ابھی تک باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے) شہر میں داخل ہوا چاہتے ہیں، یہ سن کر لوگوں کے رہے سہے ہوش و حواس جاتے رہے، اور شہر میں کھلبلی پڑ گئی، لوگوں نے شہر چھوڑ کر جانا چاہا، مگر جائیں تو کہاں جائیں؟ تاتاریوں نے قلعہ فتح کرنے کے انتظامات کئے، خندق کھودی جانے لگی، اور منجنیقیں نصب کی گئیں، لوگ اس ڈر سے کہ بیگار میں پکڑے جائیں گے، گھر بیٹھ رہے، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ:-

"راستوں، سڑکوں پر سناٹا تھا، اکّادکّا کوئی آتا جاتا نظر آتا تھا، جامع مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی، جمعہ کی نماز میں جامع اموی میں بڑی مشکل سے ایک صف پوری ہوتی' اور کچھ آدمی پیچھے ہوتے، جو شخص ضرورتاً نکلتا بھی وہ تاتاریوں کا بھیس بدل کر، اور فوراً واپس آجاتا، پھر بھی

---

[1] جو ترکی النسل اور غالباً تاتاری نو مسلم تھا۔ [2] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۱۷

یہ کھٹکا لگا رہتا کہ شاید واپس آنا نصیب نہ ہو"[1]

۱۹ جمادی الاولیٰ کو قازان نے عراق کی طرف کوچ کیا، اور اپنے قائم مقام اور ساٹھ ہزار فوج شام کی حفاظت کے لئے چھوڑ دی، چلتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ "ہم اپنے نائب اور کثیر فوج چھوڑ کر جا رہے ہیں، اور اگلے سال موسمِ خزاں میں ہم پھر واپس آئیں گے، اس وقت ہم شام کے ساتھ مصر بھی فتح کریں گے" قازان اگرچہ چلا گیا تھا، مگر دوسرے تاتاری امیر بولائی نے دمشق کے اطراف و جوانب میں لوٹ مار مچا رکھی تھی، کثیر آبادیاں اور بستیاں ویران ہو گئی تھیں، کثیر التعداد مسلمان بچوں کو غلام بنا لیا گیا تھا، خود دمشق سے اس نے بڑی رقم وصول کی تھی، ۸ رجب کو ابن تیمیہؒ نے بولائی کی لشکر گاہ میں جا کر اس سے خود ملاقات کی، اور قیدیوں کی رہائی کے معاملہ میں اس سے گفتگو کی، اور ایک بڑی تعداد کو رہا کرا لیا[2]، ان رہا ہونے والوں میں مسلمان بھی تھے، اور غیر مسلم شامی (ذمّی) بھی تھے۔[3]

۳ رجب کو دمشق میں قلعہ دار کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مصری افواج شام کی طرف آ رہی ہیں، اگلے ہی روز بولائی اور اس کے تاتاری ساتھی دمشق چھوڑ کر روانہ ہو گئے، ۷ تاریخ تک دمشق اور اس کے اطراف تاتاریوں سے بالکل خالی ہو گئے۔

۹ رجب کو اطلاع ملی کہ سلطان (محمد بن قلاوون) اور مصری افواج شام کے استخلاص کے لئے روانہ ہو گئیں، اس وقت دمشق میں کوئی ذمہ دار حاکم اور منتظم نہ تھا، شہر پناہ تاتاریوں کے حملہ سے شکستہ پڑی ہوئی تھی، قلعہ دار ارجواش نے اعلان کرایا کہ "اہلِ شہر، شہر پناہ اور دروازوں کی حفاظت کریں، کوئی اپنے گھر میں نہ سوئے، سب مسلح شہر پناہ پر موجود رہیں" لوگوں نے تعمیل کی، ابن کثیر کہتے ہیں کہ "ابن تیمیہؒ کا ان دنوں معمول تھا کہ رات بھر شہر پناہ کا گشت کرتے تھے، اور لوگوں کو جہاد اور رباط فی سبیل اللہ کی آیات سنا کر صبر و قتال کی ترغیب دیتے تھے"[4]

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۱۹ [2] ایضاً ص ۱۰ [3] ابن تیمیہ (محمد ابوزہرہ) ص ۳۹ [4] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۱۱

شراب کے خلاف جہاد

مصری افواج اور مسلمان سلطان کی آمد آمد اور تاتاریوں کے کوچ کوس کر دینداراسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے، اور انھوں نے ان خرابیوں کو دور کرنے کا عزم کیا، جو اس ناتربیت یافتہ قوم اور اس کے ناخداترس حکام کے زمانہ میں پیدا ہوئی تھیں، حافظ ابن تیمیہؒ اس کام میں پیش پیش تھے، نائب شام سیف الدین قبجق نے شراب خانوں کی خاص سرپرستی کی تھی، اور وہ اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھے، اس کے مختصر دورِ حکومت میں متعدد نئے شراب خانے قائم ہوئے تھے، اب ان کے باقی رہنے کے لئے کوئی جواز نہ تھا، دمشق میں کوئی حاکم اور ذمہ دار افسر نہ تھا، ابن تیمیہ نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا، اپنے تلامذہ اور احباب کے ساتھ سارے شہر کا دورہ کیا، جہاں شراب خانہ نظر آیا، اس کے مٹکے اور جام و سبو توڑ ڈالے، شراب انڈیل دی، ان میخانوں میں جو اوباش مقیم تھے، اور افعالِ شنیعہ کے مرتکب ہوتے تھے، ان کی تعزیر کی، شہر میں عام طور پر اس کارروائی پر مسرّت کا اظہار کیا گیا۔[1]

بدعقیدہ کوہستانیوں کی تادیب و تبلیغ

۶۹۹ھ میں جب تاتاری لشکر دمشق میں داخل ہوا تھا، اور انھوں نے دست درازی کی تھی تو پہاڑوں کے (عیسائی باطنی اور اسماعیلی) باشندوں نے ان کا پورا ساتھ دیا تھا، مسلمان فوجیں جب تاتاریوں سے شکست کھا کر واپس ہو رہی تھیں، اور ان کے علاقہ سے گزریں تو ان کوہستانیوں نے ان پر حملہ کر دیا، ان کے اسلحہ اور گھوڑے چھین لئے، اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کیا، انھوں نے کبھی لشکر کی اطاعت نہیں کی تھی، نہ دینِ حق کو قبول کیا تھا، اور نہ کسی نظام کے پابند تھے۔[2]

---

[1] البدایہ والنہایہ [2] ایضاً

شام کا مطلع صاف ہو جانے اور اندرونی اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد ابنِ تیمیہؒ نے ان مفسدوں کی تادیب و تبلیغ ضروری سمجھی حسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں نائب السلطنت جمال الدین آقوش الافرم نے جرد و کسروان نامی پہاڑوں کی طرف فوج کشی کی، ابن تیمیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور رضاکاروں اور حوران کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ نائب السلطنت کی رفاقت کی، نائب السلطنت کی آمد سن کر قبائل کے سردار ابن تیمیہ کے پاس حاضر ہوئے، شیخ نے ان سے توبہ کرائی، ان کو اچھی طرح تبلیغ کی، اور اس سے بڑا نفع ہوا، انھوں نے مسلمان فوج سے جو کچھ چھینا لوٹا تھا، اس کی واپسی کی ذمہ داری لی، بیت المال کی طرف سے ان پر رقوم عائد کی گئیں، جن کو ادا کرنے کا انھوں نے عہد کیا، اور یہ مہم ۱۳ ذی القعدہ کو کامیاب واپس آئی[1]

تاتاریوں کی دوبارہ آمد اور ابنِ تیمیہ کا اعلانِ جہاد

سنہ ۷۰۲ھ شروع ہی ہوا تھا کہ تاتاریوں کی دوبارہ آمد کی اطلاع دمشق میں پہنچی، لوگوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، اور مصر اور دوسرے مقامات اور محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، لوگ اپنا سامان، پوشاک اور غلہ اونے پونے بیچ کر سفر کا سامان کرنے لگے، سواری کا کرایہ بہت بڑھ گیا، اور جانوروں کے دام کہیں سے کہیں پہنچ گئے، یہ دیکھ کر ابن تیمیہ نے جامع مسجد میں مواعظ اور درس کا سلسلہ سرگرمی سے شروع کیا، لوگوں کو جہاد پر آمادہ کیا، بھاگنے سے غیرت دلائی، اور اس بزدلانہ حرکت کی مذمت کی انھوں نے لوگوں کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے ملکوں کی حفاظت و مدافعت کے سلسلہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا کہ لوگ بھاگنے میں جو روپیہ صرف کر رہے ہیں، یہاں رہ کر مسلمانوں کی حفاظت اور جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کریں، وہ کہتے تھے کہ اس مرتبہ تاتاریوں سے کھلے میدان میں مقابلہ

---

[1] البدایہ والنہایہ

کرنا چاہیئے، اس مرتبہ ان سے جہاد فرض ہے' ان کی اس مسلسل تقریروں سے لوگوں کی ڈھارس بندھی' ادھر شہر میں سرکاری اعلان ہو گیا کہ کوئی شخص حکومت کی اجازت اور پروانہ کے بغیر شہر نہیں چھوڑ سکتا، اس سے بھاگنے کا سلسلہ بند ہوا ادھر سلطانِ مصر کی روانگی کی بھی اطلاع ملی جس سے لوگوں کو مزید اطمینان ہوا۔

مصر کا سفر

ربیع الثانی میں پھر تاتاریوں کی آمد آمد کی خبر گرم ہوئی، اور اطلاع ملی کہ وہ مقام بیرۃ تک پہنچ گئے ہیں، شہر میں جہاد کا اعلان عام ہو گیا، تاتاریوں کے آگے بڑھنے کی اطلاعیں پے در پے آرہی تھیں، لوگوں کو تسکین دی گئی' اور کہا گیا کہ اپنا کام دلجمعی سے کریں، سلطان مصر سے روانہ ہو چکے' دفعتہً یہ اطلاع ملی کہ سلطان نے فسخ عزیمت کر دی' یہ سن کر جمے ہوئے قدم اکھڑ گئے اور لوگ اپنے اپنے اہل و عیال کو مصر اور دوسرے محفوظ مقامات کی طرف منتقل کرنے لگے، یہ حالت دیکھ کر ابن تیمیہ نائب الشام سے ملاقات کے لئے (جو دمشق کے باہر تاتاریوں کو روکنے کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑا تھا) تشریف لے گئے انھوں نے اس کو بہت اطمینان دلایا، اور فرمایا کہ ہم مظلوم ہیں' ہم کو ضرور فتح ہو گی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ	اور جس نے اسی قدر بدلہ لیا جس قدر اسے تکلیف دی
بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنصُرَنَّهُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ	گئی تھی' پھر اس پر زیادتی کی گئی تو اللہ ضرور اس کی
لَعَفُوٌّ غَفُورٌ (الحج۔۔ ۶۰)	مدد کرے گا' بیشک اللہ درگذر کرنے والا معاف کرنے والا ہے

نائب شام اور امراء نے ان سے درخواست کی کہ وہ خود مصر جائیں' اور سلطان کو ملک شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں' چنانچہ وہ ڈاک کی سواری سے مصر روانہ ہوئے' ان کے پہونچتے پہونچتے سلطان قاہرہ میں داخل ہو چکا تھا، ابن تیمیہ نے سلطان کو بڑی غیرت دلائی اور فرمایا کہ "اگر شام تمہاری سلطنت میں داخل نہ ہوتا، اور بحیثیت سلطان مصر و شام کے تم پر اس کی

براہِ راست ذمہ داری نہ ہوتی جب بھی اگر اہل شام تم سے مدد مانگتے تو تمہیں ان کی مدد کرنی ضروری تھی، چہ جائیکہ شام تمہاری سلطنت کا ایک صوبہ اور تمہاری حکومت کا ایک اہم جز ہے، اگر تم کو شام کی حفاظت کی کوئی فکر نہیں تو صاف کہہ دو ہم اپنا انتظام خود کرلیں، اور کسی کو وہاں کا حاکم منتخب کریں، جو خطرہ کے وقت اس کی خدمت و حفاظت کرے، اور معتدل حالات میں اس سے فائدہ اٹھائے"

ابن تیمیہ نے سلطان کو یقین دلایا کہ اس مرتبہ فتح مسلمانوں ہی کی ہوگی، وہ آٹھ دن تک قلعۂ مصر میں مقیم رہے، اور جہاد اور تاتاریوں کے مقابلہ کی ترغیب دیتے رہے۔

ابن تیمیہ کی اس ایمان افروز اور یقین آفریں گفتگو اور مخلصانہ مساعی کا یہ نتیجہ ہوا کہ سلطان دوبارہ شام کے لئے آمادہ ہوگیا، اور مصری افواج جہاد کے لئے روانہ ہوگئیں، ابھی اہل دمشق یہ سن کر پوری طرح خوش نہیں ہونے پائے تھے کہ تاتاریوں کے قریب آجانے اور سلطان کی واپسی کی اطلاع پہونچ گئی، غضب یہ ہوا کہ حاکم شہر ابن النحاس نے منادی کرادی کہ جس میں سفر کی طاقت ہو وہ دمشق سے ضرور چلا جائے، یہ سن کر شہر میں ہلچل مچ گئی، بازار بند ہوگئے، لوگ جنگلوں اور میدانوں کی طرف بھاگنے لگے، ہر شخص کی زبان پر تھا کہ اہلِ دمشق کی قسمت میں تو دشمن کا لقمہ بننا لکھا ہے، بڑے بڑے علماء اور دمشق کے اعیان و شرفاء نے شہر سے کوچ کیا، ان کے متعلقین پہلے جاچکے تھے، سربرآوردہ اور معزز لوگوں میں دمشق میں گنتی کے چند آدمی رہ گئے تھے، شہر میں اعلان ہوا کہ جس کی نیت جہاد کی ہو، وہ لشکر سے جاملے، اس لئے کہ تاتاری قریب آگئے ہیں، جو علماء باقی تھے (جن میں ابن تیمیہ کے چھوٹے بھائی شرف الدین ابن تیمیہ بھی تھے) انھوں نے نائب السلطنت کو ہمت دلائی، اور "مہنا" امیر عرب کو بھی جہاد پر آمادہ کرلیا، اسی عرصہ میں ابن تیمیہ مصر سے واپس آگئے، انھوں نے سلطان کی آمادگی اور ارکانِ سلطنت کے عزم جہاد کی خوشخبری سنائی، ادھر یہ اطلاع ملی کہ سلطان تاتار نے واپسی کا ارادہ کرلیا اور دریائے فرات عبور کرکے عراق پہنچ گیا،

"وکفی اللہ المومنین القتال"[1]

تاتاریوں سے فیصلہ کن جنگ اور ابن تیمیہ کا کارنامہ

رجب ۷۰۲ھ میں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ تاتاری اس مرتبہ شام کا عزم مصمم رکھتے ہیں، لوگوں میں اس خبر سے ایک اضطراب پیدا ہوا، نمازوں میں قنوتِ نازلہ کا اہتمام کیا گیا، اور بخاری شریف کا ختم ہوا، لوگ حسب عادت مصر اور محفوظ مقامات کا رخ کرنے لگے جس قدر سلطان مصر اور مصری افواج کی آمد میں تاخیر ہوتی جاتی تھی، لوگوں کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا، بالآخر ۱۸ شعبان کو مصری فوج کا ایک بڑا حصہ نامور ترکی امراء کی قیادت میں پہنچا، پھر دوسرا دستہ پہنچا اور لوگوں میں سکون پیدا ہوا لیکن دوسرے مقامات سے پناہ گزینوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور شمالی شہروں سے بکثرت لوگ اپنا اپنا شہر چھوڑ کر دمشق میں آنے لگے مختلف قسم کی افواہیں بھی پھیلنے لگیں، امرائے شام نے جمع ہوکر دشمن کے مقابلہ کا عہد کیا اور قسم کھائی اور شہر میں اعلان کرایا گیا کہ کوئی شہر چھوڑ کر نہ جائے، ابن تیمیہ نے دمشق سے باہر جاکر لشکر کو اس کی اطلاع دی اور ان سے بھی اس بات کی قسم لی، وہ امراء اور عوام سے قسم کھاکر کہتے تھے کہ تم اس مرتبہ ضرور فتح پاؤگے ان کو اس کا اس قدر یقین تھا کہ اگر کوئی کہتا کہ انشاء اللہ تو کہیئے، تو فرماتے کہ "انشاء اللہ تحقیقًا لا تعلیقًا" وہ فرماتے تھے کہ ہم مظلوم ہیں، اور مظلوم کی ضرور مدد ہوتی ہے۔

ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ط (الحج-۶۰) جس پر زیادتی کی جائے گی اس کی اللہ ضرور مدد کرے گا

اس لئے اس وعدۂ خداوندی کی رو سے ہماری فتح یقینی ہے، اس میں ذرہ برابر شک نہیں۔[2]

اس وقت ایک سوال یہ چھڑ گیا کہ تاتاری بہرحال مسلمان ہیں، اس لئے ان سے جنگ کرنے کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ وہ نہ کافر ہیں نہ باغی ہیں، باغی اس لئے نہیں ہیں کہ کبھی وہ مسلمان امیر کی اطاعت میں

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۱۶ [2] ایضاً ص ۲۳

داخل ہی نہیں ہوئے، اس لئے بغاوت کا بھی سوال نہیں، پھر ان سے جنگ کس بنیاد پر کی جائے؟ علماء کو اس بارہ میں تردد ہوا، ابن تیمیہ نے کہا کہ وہ خوارج کے حکم میں ہیں، خوارج نے سیدنا علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کے خلاف بغاوت کی تھی، وہ اپنے کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے، یہ تاتاری اسی طرح دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے کو حکومت کا زیادہ مستحق سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ حق وانصاف کو قائم کر سکتے ہیں، وہ مسلمانوں پر گناہوں اور مظالم کا الزام لگاتے ہیں اور خود اس سے کہیں بڑھ کر افعالِ شنیعہ اور حرکاتِ ناشائستہ کے مرتکب ہیں، ان کی اس توضیح سے علماء کو اطمینان ہو گیا، اور یہ نکتہ سمجھ میں آگیا، ان کو اس بارہ میں اتنا وثوق اور اطمینان تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تم مجھے بھی اس حال میں تاتاریوں کی صف میں دیکھو کہ قرآن مجید سر پر رکھا ہے، تب بھی مجھے قتل کر دینا، اس سے لوگوں کا تردّد دور ہوا، اور ان کے حوصلے بلند ہوئے۔

دمشق میں بڑی سراسیمگی تھی، سلطان کی آمد کی اطلاع نہ تھی، شامی و مصری فوجوں کے جنگ کرنے کا یقین نہ تھا، تاتاریوں کی آمد آمد کی اطلاع دم بدم مل رہی تھی، لوگ دوسرے شہروں سے بھاگ بھاگ کر دمشق میں پناہ لے رہے تھے، سارا شہر پناہ گزینوں سے بھرا ہوا تھا، ابن تیمیہ لشکرگاہ جانے کے لئے چلے تو راستہ ملنا مشکل تھا، جن لوگوں کو ان کے عزم کی اطلاع نہ تھی، انھوں نے طعنہ دیا کہ ہمیں تو آپ بھاگنے سے روکتے تھے، اور آپ خود دمشق سے فرار اختیار کر رہے ہیں؟ امام خاموشی سے سنتے ہوئے چلے گئے، شہر میں کوئی حاکم نہ تھا، اوباشوں اور بدمعاشوں نے اُدھم مچا رکھی تھی، لوگ میناروں پر چڑھ چڑھ کر اسلامی لشکر کو تلاش کرتے تھے، اور قیاس آرائی کرتے رہتے تھے، ہر شخص اپنی قسمت کے فیصلہ کا منتظر تھا، جنگ ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر جنگ ہوتی ہے تو فتح کس کو ہوتی ہے، اگر خدانخواستہ اسلامی لشکر شکست کھاتا ہے، تو پھر مسلمانوں کا کہیں ٹھکانا نہیں، اور عزّت و آبرو، جان و مال کی خیر نہیں، غرض:-

وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ   اور جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے،

الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَاہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ	اور تم اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے، اس
الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ○ (احزاب ۱۰۔۱۱)	موقع پر ایمان دار آزمائے گئے اور سخت ہلادیئے گئے۔

کا نقشہ تھا۔

ابن تیمیہ شامی لشکر میں پہونچے تو امرائے لشکر نے ان سے خواہش کی کہ وہ آگے بڑھ کر سلطان سے ملیں اور ان سے جلد تشریف آوری کی درخواست کریں، ابن تیمیہ نے سلطان سے ملاقات کی، ابن تیمیہ کی گفتگو سے ان کا عزم پختہ ہوگیا، اور وہ ابن تیمیہ کی معیت میں لشکر گاہ میں آئے، سلطان نے ان سے خواہش کی کہ جنگ کے موقع پر وہ سلطان کے ساتھ ہوں، ابن تیمیہ نے کہا کہ سنت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کے جھنڈے کے نیچے جنگ کرے، ہم شامی لشکر سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اسی جھنڈے کے نیچے جنگ کریں گے، انھوں نے سلطان کو دوبارہ جہاد کی تلقین کی، اور کہا کہ خدائے واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ فتح ہماری ہی ہے، اس موقع پر بھی امرا نے ان کو یاد دلایا کہ انشاء اللہ کہنا چاہئے، فرمایا "انشاء اللّٰه تحقيقًا لا تعليقًا"

۲۹ شعبان جمعہ کی شب کو رمضان کا چاند ہوگیا، اہل دمشق نے تراویح کی تیاری کی، رمضان کی مسرت بھی تھی اور دشمن کا خوف اور مستقبل کا اندیشہ بھی، جمعہ کا دن بہت سخت گزرا، سنیچر کو لوگوں نے میناروں سے دیکھا کہ لشکر کی جانب گرد اور سیاہی ہے، وہ سمجھ گئے کہ آج ہی مقابلہ ہے، دعاؤں کی کثرت ہوئی، عورتیں اور بچے کوٹھوں پر ننگے سر کھڑے تھے، اور شہر میں ایک غلغلہ تھا، سنیچر ۲ رمضان کو ظہر کے بعد سلطان کا فرمان جامع مسجد میں پڑھا گیا کہ "سنیچر کے دن دو گھڑی دن گزرے، شامی اور مصری فوجیں سلطان کی ہمرکابی میں صف آرا ہوں گی، مسلمان اللہ سے فتح و نصرت کی دعا کریں، اور قلعہ اور شہر پناہ کی حفاظت میں مستعد رہیں۔"

۲ رمضان کو شقحب کے میدان میں ایک طرف شامی و مصری فوجیں، دوسری طرف تاتاری لشکر صف آرا ہوا، ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ مجاہدین کو روزہ کھول لینا چاہئے تاکہ جنگ کی طاقت پیدا ہو، وہ ایک ایک علم اور ایک ایک دستہ کے پاس خود جاتے تھے، ان کے ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز تھی،

وہ ان کو دکھا کر افطار کرتے تھے اور حدیث سناتے تھے کہ:۔

انکم ملاقوا العدو غدا والفطر اقوی لکم۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل دشمن سے تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے اور روزہ نہ رکھنے کی حالت میں تم زیادہ قوی ہو گے۔

جنگ شروع ہوئی، سلطان خود بنفس نفیس لشکر میں موجود تھا، خلیفۂ عباسی ابو الربیع سلیمان سلطان کے پہلو میں تھے، بالآخر دونوں لشکر آپس میں گتھ گئے، اور جنگ کا بازار گرم ہوا، سلطان نے بڑی ثابت قدمی دکھائی، اس نے اپنے گھوڑے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں کہ بھاگنے نہ پائے، اس نے اللہ سے اس موقع پر عہد کیا، سخت معرکہ ہوا، بڑے بڑے ترکی امراء کام آئے، بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور تاتاریوں کے قدم اکھڑ گئے رات کو تاتاریوں نے ٹیلوں، پہاڑوں اور ٹیکریوں پر پناہ لی، مسلمانوں نے رات بھر پہرہ دیا، اور ان کو بھاگنے نہیں دیا، اور اپنے تیروں پر رکھ لیا، بکثرت تاتاری قتل ہوئے، صبح مسلمان ان کو رسیوں میں باندھ باندھ کر لاتے تھے، اور گردن اڑا دیتے تھے، بھاگنے والوں میں سے ایک کثیر تعداد گھاٹیوں اور خطرناک جگہوں میں گر کر اور بہت سے دریائے فرات میں ڈوب کر ہلاک ہوئے۔

دوشنبہ ۴ رمضان کو ابن تیمیہ دمشق میں داخل ہوئے، لوگوں نے ان کا بڑا استقبال کیا، ان کو مبارکباد اور دعائیں دیں۔

سہ شنبہ ۵ رمضان ۷۰۲ھ کو سلطان، اعیان سلطنت، خلیفہ اور افواج شاہی کے ساتھ منصور و کامران دمشق میں داخل ہوا۔

انکار بدعات اور ازالۂ منکرات

تاتاریوں کے قصہ سے فرصت پا کر ابن تیمیہ نے حسبِ معمول سابق پوری سرگرمی کے ساتھ درس و تدریس،

اشاعتِ سنت اور ردِّ بدعات کا کام شروع کر دیا، اور شرک و جاہلیت کے خلاف جہاد میں مشغول ہو گئے، جوان کا محبوب مشغلہ اور زندگی کا ایک بڑا مقصد تھا، اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط اور فاسد العقیدہ اور جاہل مقتداؤں کی تعلیم سے مسلمانوں میں بہت سے ایسے اعمال آ گئے تھے، جو جاہلیت کی یادگار اور مشرک و بت پرست اقوام کا شعار تھے، دمشق کے نواح میں نہر قلوط کے کنارہ ایک چٹان تھی، جس کے متعلق مختلف قسم کی روایات مشہور تھیں، یہ جہلاء اور توہم پرست مسلمانوں کے لئے ایک فتنہ بن گیا تھا، مسلمان جاتے تھے، اور وہاں منتیں مانتے تھے، ابن تیمیہ رجب ۷۰۴ھ کو مزدوروں اور سنگ تراشوں کے ساتھ وہاں خود گئے، اور اس کو کاٹ کر شرک کے اس دروازہ کو بند کر دیا، اور ایک بڑا فتنہ ختم ہوا۔[1]

وہ شریعت اور سنت کے خلاف جو عمل دیکھتے، اس کو حتی الامکان اپنے ہاتھ سے بدل دینے اور روکنے کی کوشش کرتے، اس لئے کہ ایمان کا یہ اعلیٰ درجہ اور دینی حمیت کا اوّلین تقاضہ ہے۔

من رائ منکم منکرًا فلیغیّرہ بیدہ فمن لم یستطع فبلسانہ فمن لم یستطع فبقلبہ وذلك اضعف الایمان۔	تم میں سے جو کوئی خلافِ شرع امر (منکر) دیکھے، وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے جو ایسا نہ کر سکے وہ اپنی زبان سے اس کی مخالفت اور اصلاح کرے جو ایسا بھی نہ کر سکے وہ اپنے دل سے اس کی مخالفت کرے، اور یہ ضعیف ترین ایمان ہے۔

حکام کو امورِ سلطنت سے فرصت نہ تھی، علماء بعض اوقات بہت سی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور بعض اوقات انکار و مخالفت کرتے جھجکتے تھے، اس لئے ابن تیمیہ کو اکثر یہ کام خود انجام دینا پڑتا تھا، ان کے ساتھ ان کے تلامذہ و محبّین کی ایک جماعت تھی، جو ان کی مددگار اور رفیق تھی، اس لئے انھوں نے اعزازی طور پر حسبۃً للہ ایک طرح کا شرعی اور اخلاقی احتساب قائم کر رکھا تھا اور

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۴

بتدعین ومخالفینِ سنت، حکام کی نگرانی اور علماء کے عتاب سے اگر بچ بھی جاتے تھے تو اس "شرعی پولیس" کی نظر سے نہیں بچ سکتے تھے۔

رجب ۷۰۴ھ ہی کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک پیر مرد جو اپنے کو "المجاهد ابراهیم بن القطّان" کہتا تھا لایا گیا جو بہت لمبی چوڑی گدڑی پہنے ہوئے تھا، بال اور ناخن بڑھے ہوئے تھے، لبیں منہ پر آرہی تھیں، گالی اور فحش کثرت سے بکتا تھا، اور نشہ آور چیزوں کا استعمال بھی کرتا تھا، ابن تیمیہ نے اس کی گدڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا حکم دیا، سب طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے اور اس کا تار تار "تبرک" ہو گیا، سر کے بال اور لبیں ترشوائیں، ناخن کٹوائے، فحش گوئی اور نشہ سے اس کو توبہ کرائی گئی[1]۔

اسی طرح ایک معمر شخص محمد الخباز البلاسی کے نام سے مشہور تھا، وہ حرام چیزوں کا استعمال کرتا تھا، یہودیوں، عیسائیوں کے پاس اس کی نشست و برخاست تھی، خوابوں کی تعبیر دیتا تھا، اور ان مسائل و علوم میں دخل دیتا تھا جن کا علم نہیں رکھتا تھا، ابن تیمیہ نے اس کو بھی طلب کرایا، اور اس سے بھی ان تمام افعال سے توبہ کرائی، ابنِ کثیر کا بیان ہے کہ یہ واقعات بھی ایک طبقہ کی ناراضگی کا سبب بنے۔

ملحدین و مفسدین کے خلاف جہاد

داخلی اصلاح کے علاوہ ابن تیمیہ ان مفسدین سے بھی غافل نہ تھے، جنھوں نے ایسے ہر موقع پر جب مسلمان کسی نرغہ میں آئے، مسلمانوں کو زک پہنچانے اور دشمنانِ اسلام سے سازباز کرنے میں کمی نہیں کی، اگرچہ ۶۹۹ھ میں انھوں نے نائب السلطنت الافرم کی معیت میں جرد و کسروان جا کر وہاں کے بددین، شرارت پسند قبائل کی تادیب و تنبیہ کی تھی، اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے توبہ اور آئندہ ان حرکات سے باز رہنے اور سلطنت کے نظام اور حکامِ اسلام کے تابع رہنے کا وعدہ کیا تھا، مگر پچھلے تجربوں سے

---

[1] البدایہ والنہایہ ص ۳۳

معلوم ہوا کہ وہ شرارت سے باز نہیں آئے، اور ان کی مزید تنبیہ و گوشمالی کی ضرورت ہے، اور ہر خطرہ کے موقع پر ان سے گزند پہونچنے کا اندیشہ ہے، چنانچہ ذی الحج کے اوائل میں ابن تیمیہ اپنے تلامذہ و احباب کی ایک جماعت کی رفاقت اور نقیب الاشراف زین الدین ابن عدنان کی معیت میں دوبارہ جرد و کسروان کی طرف تشریف لے گئے، اور ان کو تبلیغ کی، ان میں کی ایک بڑی تعداد تائب ہوئی، اور اس نے احکام اسلام کی پابندی اختیار کی۔

جرد کے علاقہ کے روافض (باطنی اسماعیلی حاکمی و نصیری) قبائل نے کھلم کھلا مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا، صلیبیوں اور تاتاریوں کو مسلمان ممالک پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی اور ان کو سہولتیں بہم پہونچائی تھیں مسلمانوں کی بےبسی اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو پر دست درازیاں کی تھیں، اور مسلمانوں کو دشمنوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کیا تھا، ابن تیمیہ کے غیور اور با حمیت دل پر اس کا بڑا داغ تھا، وہ ان دنی الفطرت اور شریر النفس منافقوں کو معاف نہیں کر سکتے تھے جنھوں نے ایسی کٹھن گھڑیوں اور نازک وقت میں مسلمانوں کو تنگ اور ذلیل کیا، اور ان کے حریفوں کی مدد کی، ابن تیمیہ نے ان کو ان جرائم اور اس غداری کی پوری پوری سزا دینی چاہی اور اس کا انتظام کرنا چاہا کہ آیندہ کسی جنگ یا خطرہ کے موقع پر وہ مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچا سکیں، انھوں نے السلطان الناصر (سلطان مصر و شام) کو ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کی شرارتوں اور خطرات سے آگاہ کیا، ایک خط میں انھوں نے سلطان کو لکھا کہ :-

"جب تاتاریوں نے شام کا رخ کیا تو ان بد باطنوں (نصیریوں اور اسماعیلیوں) نے اسلامی افواج کے ساتھ بڑی بدسلوکیاں کیں، یہ وہی ہیں جنھوں نے اہلِ قبرص (عیسائیوں) کو پیغام بھیجا، اور ساحل شام کے ایک حصہ پر ان کو قبضہ دلایا، اور صلیب کا جھنڈا خود اٹھا کر لے چلے، اور مسلمانوں کے گھوڑوں، ہتھیاروں، اور قیدیوں کی اتنی تعداد انھوں نے قبرص پہنچائی جس کا علم صرف اللہ کو ہے، بیس دن تک نخاسہ کا بازار لگا رہا، جس میں مسلمان اور گھوڑے اور ہتھیار اہل قبرص کے ہاتھ (جو

صلیبی اور مسلمانوں کے حریف تھے) مکتے رہے، تاتاریوں کی آمد پر انھوں نے گھی کے چراغ جلائے، اور جب تاتاریوں کے مقابلہ کے لئے اسلامی فوجیں مصر سے روانہ ہوئیں تو ان کے چہرے فق ہو گئے جب اللہ تبارک و تعالےٰ نے سلطان کی آمد پر مسلمانوں کو فتح مبین عطا فرمائی تو ان کے یہاں صفِ ماتم بچھ گئی، یہ اور اس سے بڑھ کر بھی چیزیں ان کے یہاں پیش آئیں، یہی چنگیز خاں کو اسلامی ممالک پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والے تھے، یہی ہلاکو کے بغداد پر تسلط، حلب کی بربادی، اور صالحیہ کی غارتگری کا سبب تھے، اس کے علاوہ ان کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

ان کے پڑوس میں جو مسلمان رہتے ہیں، وہ بڑی مصیبت میں مبتلا تھے، ہر رات ان کی ٹولی پہاڑ سے اترتی، اور وہ فساد برپا کرتی جس کو اللہ ہی جانتا ہے، یہ ڈاکے ڈالتے، پرامن شریف گھرانوں کو پریشان کرتے اور جرائم کا ارتکاب کرتے، قبرص کے عیسائی ان کے علاقہ میں آتے تو یہ ان کی میزبانی کرتے اور مسلمانوں کے ہتھیار ان کے حوالہ کرتے، جو نیک اور صالح مسلمان ان کو ملتا یا تو اس کو قتل کر ڈالتے یا اس کا سب کچھ چھین لوٹ لیتے، شاذ و نادر ہی کوئی ان سے بچ کر نکلتا۔[1]

۷۰۵ھ میں ۲ محرم کو وہ ایک مہم کے ساتھ ان مفسدین و ملحدین کے خلاف جہاد کرنے کے لئے روانہ ہوئے ان کے پیچھے نائب السلطنت ایک لشکر کے ساتھ دمشق سے روانہ ہوا، اور جرد کے علاقہ اور روافض و تیامنہ کے پہاڑوں پر چڑھائی کی، سرکش قبائل کی اچھی طرح سرکوبی کی گئی اور اس پورے علاقہ کو جو بہت دشوار گذار اور محفوظ تھا، صاف کر دیا گیا، ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ بنی النضیر کی طرح ان کے باغات کے درخت کاٹنا درست ہے اس لئے کہ یہ اس میں کمین گاہ بناتے ہیں، اور یہ ان کے فوجی اڈے اور سازش کی جگہیں ہیں، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام کی موجودگی اور شرکت سے بڑی خیر حاصل ہوئی اور اس موقع پر ان کے علم و شجاعت کا بڑا ظہور ہوا، اسی کے ساتھ ان کے دشمنوں کے دل حسد اور غم سے لبریز ہو گئے۔[2]

---

[1] ابن تیمیہ (محمد ابو زہرہ) ص ۴۵ [2] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۵

رفاعیوں سے مناظرہ

۹ جمادی الاول ۷۰۵ھ کو رفاعی فقراء کی ایک جماعت کثیر نائب السلطنت کے پاس حاضر ہوئی ابن تیمیہ بھی تشریف لائے رفاعیوں کا مطالبہ تھا کہ ابن تیمیہ کو ان پر اپنے احکام جاری کرنے سے روک دیا جائے اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے' ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ ایسا ممکن نہیں' ہر شخص کو کتاب و سنت کے ماتحت ہو کر رہنا پڑے گا، جو اس سے قدم باہر نکالے گا، اس کی تردید اور مخالفت ضروری ہے' رفاعیوں نے اس موقع پر اپنی حقانیت اور مقبولیت ثابت کرنے کے لئے اپنے کچھ کرتب دکھانے چاہے' ان کا دعویٰ تھا کہ ہم پر آگ اثر نہیں کرتی' ہم آگ میں کود کر دکھاتے ہیں' اگر ہم صحیح سالم نکل آئیں تو تسلیم کر لیا جائے کہ ہم برسر حق ہیں' اور مؤید من اللہ' ابن تیمیہ نے کہا کہ یہ شیطانی حالات ہیں' اور ان کا کچھ اعتبار نہیں یہ محض شعبدہ بازی اور مکر و فریب ہے' جو شخص آگ میں کودے پہلے حمام میں اس کو غسل دیا جائے' اور اس کے جسم کو سرکہ اور گھاس سے اچھی طرح دھویا مانجھا جائے، پھر آگ میں گھسے اور اپنا کمال دکھائے' اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی شخص غسل کے بعد آگ میں گھستا ہے تو وہ اگر اہلِ بدعت میں سے ہے تو اس وقت بھی اس کا کچھ اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو دجّال سمجھا جائے گا، اس موقع پر ایک رفاعی صوفی (شیخ صالح) کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ ہمارے یہ کرتب تاتاریوں کے یہاں چلتے ہیں' شریعت کے مقابلہ میں نہیں چلتے، لوگوں نے ان کی یہ بات پکڑ لی اور اس کو دلیل بنا لیا، آخر یہ فیصلہ ہوا کہ وہ لوہے کے طوق اپنی گردنوں سے اتار دیں، اور جو کتاب و سنت کی مخالفت کرے' اس کی گردن اڑا دی جائے' ابن تیمیہ نے اس کے بعد اس مسئلہ پر مستقل رسالہ تصنیف کیا جس میں طریقہ رفاعیہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی' اور ان کے حالات' مسلک و تخیلات کا کتاب و سنت سے موازنہ کیا۔[۱]

---

[۱] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۶

۸ رجب کو علماء کی ایک مجلس میں جو نائب السلطنت کی موجودگی میں منعقد ہوئی تھی، ابن تیمیہ کے رسالہ "عقیدۂ واسطیہ" پر بحث ہوئی، اور علماء نے ان سے سوال و جواب کئے، جس کے نتیجہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ ان کا عقیدہ اہلِ سنت کے عقیدہ کے مطابق ہے، اور ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کے مکان پہونچا دیا گیا، عوام کی ایک بڑی تعداد شمعیں ہاتھوں میں لئے ہوئے، ان کے رکاب میں چل رہی تھی، جو اظہار عقیدت کا اس زمانہ میں ایک طریقہ تھا۔[1]

ابن تیمیہ کی مخالفت اور مصر طلبی

دمشق میں ابن تیمیہ کی ایک طرح کی دینی سیادت قائم ہو گئی تھی، وہ اگر دیکھتے تھے کہ حکومت کسی بدعت یا فعل منکر کے روکنے میں تساہل سے کام لے رہی ہے، اور علماء خاموش ہیں تو وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور خود شرعی احکام کا اجراء کرتے، ان کے ساتھ عقیدت مند تلامذہ اور دیندار اور صحیح العقیدہ عوام کی ایک بڑی جماعت تھی، اور ان کا حلقۂ اثر بڑھتا جا رہا تھا، اہل علم کی ایک جماعت کو ان کا یہ دینی عروج اور شخصی اثر پسند نہیں آیا، اور ان کو اس میں ان کی خود سری نظر آئی، اس نے ان کے حاسدوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا، جو ان کے زوال کا متمنّی، اور ان کی اہانت کے درپے تھا، ابن کثیر لکھتے ہیں۔

وکان للشیخ تقی الدین من الفقہاء	شیخ تقی الدین ابن تیمیہ سے حسد کرنے والی علماء کی
جماعۃ یحسدونہ لتقدمہ	ایک جماعت تھی جس کا باعث ان کا حکومت میں
عند الدولۃ وانفرادہ بالأمر بالمعروف	رسوخ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کو
والنہی عن المنکر، وطاعۃ الناس لہ	تنہا انجام دینا، لوگوں کو ان کے حق میں فرمانبرداری
ومحبتہم لہ وکثرۃ اتباعہ وقیامہ	محبت، ان کے متبعین کی بڑھتی ہوئی تعداد ان کا

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۵

فی الحقّ وعلمہ وعملہ[1] دینی جوش وعزم اور علم وعمل تھا۔

عقیدۂ وحدۃ الوجود کی تردید

ادھر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ عقائد کی بحث دوبارہ چھڑ گئی اور بحث ومباحثہ کی مجلسیں منعقد ہوئیں[2]، اس سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ وہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے مسلک وحدۃ الوجود کی برملا تردید کرتے تھے، مصر وشام میں ان کے معتقدین ومنتسبین کا بہت بڑا گروہ تھا، اور علماء ومشائخ کی ایک بڑی جماعت تھی، جو ان کو نہایت بلند پایہ عارف ومحقق، امام مشرب توحید اور شیخ اکبر مانتی تھی، ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ ان کی تحقیقات والہامات انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور توحید کی اس تعلیم کے بالکل معارض ہیں، جو ہر پیغمبر نے اپنے وقت میں دی، اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی آخری وضاحت اور تکمیل فرمائی، اور جو صاف صاف قرآن وحدیث سے سمجھ میں آتی ہے اور لفظی ومعنوی تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے شیخ محی الدین ابن عربی نے ۶۳۸ھ میں (ابن تیمیہؒ کی ولادت سے ۲۳ سال پیشتر) وفات پائی تھی، ان کی کتابیں خصوصاً "فتوحاتِ مکّیہ" اور "فصوص الحکم" عام طور پر متداول تھیں، اور علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، ابن تیمیہ نے فلسفہ اور تصوف واشراق کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور اس سلسلہ میں "فتوحات" و "فصوص" کو بھی پڑھا تھا، وہ اپنی کتابوں میں جا بجا ان کتابوں کے اقتباسات نقل کرتے ہیں، اور ان کی تردید کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ براہ راست تھا، وہ ان

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۳۷ [2] ایک مجلس میں جو ۸ رجب کو نائب السلطنت کے یہاں منعقد ہوئی شیخ کی موجودگی میں "العقیدۃ الواسطیہ" پڑھا گیا، اور اس پر بحث ہوئی اس کے بعد دو مجلسوں میں شیخ صفی الدین الہندی اور علامہ کمال الدین ابن الزملکانی سے بحث ومذاکرہ ہوا، اور ثابت ہوا کہ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کے خلاف نہیں ہے اور شیخ نہایت عزت وحرمت کے ساتھ گھر واپس ہوئے، عوام مشعلیں ہاتھ میں لئے ہوئے ساتھ تھے (ابن کثیر جلد ۱۴ ص ۳۶-۳۷)

کتابوں کے مطالعہ سے اس نتیجہ تک پہونچے تھے کہ ان کتابوں کی تعلیمات اور نبوت کی تعلیمات میں تطبیق کی کوئی صورت نہیں، وہ شیخ ابن عربی کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ابن عربی اور ان کے متبعین کا مسلک یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے، وہ کہتے ہیں، مخلوق کا وجود خالق کا وجود ہے، وہ دو متغائر موجودوں کے قائل نہیں، جن میں سے ایک دوسرے کا خالق ہو، بلکہ کہتے ہیں کہ خالق ہی مخلوق ہے اور مخلوق ہی خالق ہے[1]، وجود میں رب و عبد کی کوئی تفریق نہیں، وہاں نہ کوئی خالق ہے، نہ کوئی مخلوق، نہ کوئی داعی نہ کوئی مجیب، وجود کا جب اعیان پر فیضان ہوا اور اس نے ان کے اندر ظہور کیا تو اعیان کی حیثیت سے اس میں تنوع اور تفریق پیدا ہوئی جیسے کہ روشنی مختلف الالوان شیشوں میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے[2]، اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی، موسیٰ علیہ السّلام نے ہارون کو جو ٹوکا تھا تو اس بات پر کہ انھوں نے اس گوسالہ پرستی کی (جو دراصل خدا پرستی تھی، اس لئے کہ موجود تو ایک ہی ہے) مخالفت کیوں کی؟ ان کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام ان عارفین میں سے تھے، جو ہر چیز میں حق کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اس کو ہر چیز کا عین سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسرِ حق تھا کہ "انا ربّکمُ الاعلیٰ"، بلکہ وہ عین حق تھا[3]۔

صاحبِ "فصوص" کا کہنا ہے کہ فرعون کو چونکہ (تکوینی طور پر) منصبِ حکومت حاصل تھا، اور وہ صاحبِ وقت تھا تو اس نے بجا طور پر "انا ربکم الاعلیٰ" کہا اس لئے کہ جب سب کسی نہ کسی نسبت سے ارباب ہیں تو میں ان میں سب سے اعلیٰ ہوں، کیونکہ مجھے ظاہر میں تم پر حکومت کرنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جادوگروں کو جب فرعون کی صداقت کا علم ہوا تو انھوں نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کا اعتراف کیا، اور کہا "اِقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِی هٰذِهِ

---

[1] الرد الاقوم علی ما فی کتاب فصوص الحکم ص۱۱ [2] ایضاً ص۱۰۲ [3] ان سب اقوال کو انھوں نے صاحبِ "فصوص" کی طرف منسوب کیا ہے۔

الحیٰوۃَ الدُّنیا" (جو تمہیں فیصلہ کرنا ہو کرو، تم اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتے ہو) اس لئے فرعون کا یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ "انا ربکم الاعلیٰ" اگرچہ فرعون عین حق پر تھا۔[1]

ابن عربی حضرت نوح علیہ السلام پر تنقید کرتے ہیں، اور ان کی کافر قوم کی تصویب و تعظیم جنھوں نے پتھروں کی پرستش کی، وہ کہتے ہیں کہ ان (بت پرستوں نے) درحقیقت اللہ ہی کی عبادت کی تھی، اور یہ طوفان دراصل معرفتِ الٰہی کی طغیانی اور اس کے سمندر کا جوش تھا جس میں وہ غرق ہوئے۔[2]"

معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ کے زمانہ میں "وحدت وجود" کے عقیدہ میں حد درجہ کا غلو پیدا ہو گیا تھا، اور لوگ اس سلسلہ میں شریعت، عقل و اخلاق کے حدود پھلانگ گئے تھے، اور ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

"اس سلسلہ میں ایک جماعت (جس کو علم کلام، فلسفہ اور تصوف سے واقفیت تھی) بہت زیادہ گمراہ ہوئی، ان میں سے ابن سبعین، صدر الدین قونوی (تلمیذ ابن عربی) اور بلبانی، اور تلمسانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں تلمسانی اس مسئلہ کے علم و معرفت میں سب سے بڑھا ہوا تھا، وہ مذہب وحدۃ الوجود کا صرف قائل ہی نہ تھا، بلکہ اس پر عامل بھی تھا، چنانچہ شراب پیتا تھا، اور محرمات کا ارتکاب کرتا تھا، (کہ جب موجود ایک ہے تو حلال و حرام کی تفریق کیسی؟)

مجھ سے ایک معتبر آدمی نے بیان کیا کہ وہ تلمسانی سے "فصوص الحکم" کا درس لیتے تھے، اور اس کو اولیاء اللہ اور عارفین کا کلام سمجھتے تھے، جب انھوں نے فصوص کو پڑھا اور دیکھا کہ اس کے

---

[1] الفرقان بین الحق والباطل ص۱۴۷ [2] ایضاً ص۱۴۸، یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکبر کی کتابوں اور علوم کے اشتغال رکھنے والوں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شیخ کی کتابوں بالخصوص فصوص الحکم" میں کثرت سے الحاقات اور اضافات کئے گئے ہیں، دمشق میں شیخ احمد الحارون العسل جو شیخ کے عشاق اور ان کے علوم کے حاملین میں سے تھے، بڑے جزم و وثوق سے فرماتے تھے کہ فصوص کا نہائی حصہ یا بیشتر محض الحاقی و بے اصل ہے۔ ۱۲.

مضامین تو قرآن شریف کے صریح مخالف ہیں، تو انھوں نے تلمسانی سے کہا کہ یہ کلام تو قرآن مجید کے مخالف ہے تو اس نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہوا ہے، اس لئے کہ وہ رب و عبد کے درمیان فرق کرتا ہے، توحید تو ہمارے کلام میں ہے، اس کا یہ بھی مقولہ ہے کہ کشف کے ذریعہ وہ ثابت ہوا ہے، جو صریح عقل کے خلاف ہے[1]۔"

"ایک شخص نے جو تلمسانی اور اس کے ہم خیال کے ساتھ تھا، مجھے خود سنایا کہ ہمارا گزر ایک مردہ کتے کے پاس سے ہوا جس کو خارش تھی، تلمسانی کے رفیق نے کہا کہ یہ بھی ذاتِ خداوندی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے، ہاں سب کے سب اس کی ذات کے اندر ہیں[2]۔"

"بعض لوگوں سے کہا گیا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں کیوں حرام ہے؟ اس "محقق" نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں، لیکن ان محجوبین نے (جو توحید حقیقی سے ناآشنا ہیں) کہا کہ ماں حرام ہے؟ ہم نے بھی کہا کہ ہاں تم (محجوبین) پر حرام ہے[3]۔"

شیخ الاسلام نے ۷۰۴ھ کو شیخ ابو الفتح نصر المنبجی کو ایک مفصل خط لکھا جس میں انھوں نے ظاہر کیا کہ وہ قائلین وحدۃ الوجود کے ضرر کو راہِ خداوندی کے سالکین سے دفع کرنا قریب قریب اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ جتنا تاتاریوں کا مقابلہ اور ازالہ، شیخ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دعوت انبیاء کا مقصد بلکہ خلق و انزالِ کتب و ارسال رسل کا مقصود یہی ہے کہ دعوت و اطاعت صرف اللہ کی ہو، "اَنْ یَّکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" اس کا مقصود مخلوقات کو اپنے خالق کی طرف دعوت دینا ہے، ان اتحادیوں نے سالکین کے لئے اس توحید کو جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے صحیفے نازل کئے، اور اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا، اس اتحاد کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے، جس کا نام انھوں نے "توحید" رکھا ہے، اور اس کی حقیقت صانع (جل مجدہ) کو معطّل قرار دینا اور خالق (عز اسمہ) کا انکار ہے، میں ابتداء میں شیخ ابن عربی

---

[1] الفرقان بین الحق والباطل ص ۱۴۵ [2] ایضاً [3] الرد الاقوم علی فصوص الحکم ص ۴۲

کے ساتھ حسنِ ظن رکھتا تھا، اور ان کی میری نگاہ میں بڑی عزت تھی، اس لئے کہ ان کی تصنیفات "فتوحاتِ مکیہ" "کنہ المحکم المربوط" "الدرۃ الفاخرۃ" "مطالع النجوم" وغیرہ میں بڑے اچھے علمی فوائد اور نکات ملتے تھے، لیکن اس وقت تک مجھے ان کے مقصود کی حقیقت کا علم اور "فصوص الحکم" وغیرہ کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا، ہم اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ مذاکرہ اور طلب حق میں مشغول تھے، اور اس کی پیروی کرتے تھے، اور حقیقت طریق معلوم کرنا چاہتے تھے، جب حقیقت واضح ہوگئی تو ہم کو (اس سلسلہ میں) اپنا فریضہ اور کرنے کا کام معلوم ہوگیا، اس عرصہ میں مشرق سے معتبر مشائخ تشریف لائے، اور انھوں نے طریقۂ اسلامیہ اور دینِ اسلامی کی حقیقت اور ان لوگوں (ابنِ عربی، صدر رومی، تلمسانی ابنِ سبعین) کی حقیقتِ حال دریافت کی تو اس کی شرح و تفصیل ضروری معلوم ہوئی، اسی طرح سے اطرافِ شام سے کچھ مخلص و صادق طالبین و سالکین نے فرمائش کی کہ قائلین وحدۃ الوجود کے اقوال کا خلاصہ اور ان کا مدعا اختصار و جامعیت کے ساتھ لکھا جائے، جناب والا اپنے نورِ قلب، ذکاوتِ طبع، اخلاص اور اس خیر خواہی کے ساتھ جو اسلام و اہل اسلام اور برادرانِ طریقت کے ساتھ رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں کوئی ایسا قدم اٹھائیں، جس سے اللہ تعالےٰ کی رضا، دنیا و آخرت میں اس کی مغفرت کی امید واثق ہو۔

اس کے بعد وہ بڑی تفصیل سے ان عقائد و نظریات اور مذاہب کا جائزہ لیتے ہیں، جو اتحاد و حلول کے بارہ میں مسیحی فرقوں (یعقوبیہ، نسطوریہ، ملکانیہ) اور بعض مسلمان کہلانے والے فرقوں (روافض اور جہمیہ) کے درمیان شائع و ذائع تھے، نیز اتحاد معین، اتحاد مطلق، حلول معین، حلول مطلق کی تشریح و تفصیل کرتے ہیں، اور جو لوگ ان کے قائل ہوئے، ان کا ذکر فرماتے ہیں، اس سے ان کی وسعتِ نظر اور مذاہبِ سابقہ سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، پھر شیخ ابن عربی کا مسلک اور تحقیق بڑی تدقیق اور احتیاط کے ساتھ (جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے "فتوحات" و

"فصوص" کا بڑی دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا، اور ان کے کلام کا سرا اور کلید ان کے ہاتھ آگئی تھی جس سے ان کے علوم و حقائق کا سمجھنا ان کے لئے آسان ہوگیا تھا) بیان کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کا اور وحدۃ الوجود کے دوسرے داعیوں کا فرق اور ابن عربی کے قول کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے، اسی کے ساتھ وہ اس کے نتائج اور لوازم فاسدہ بیان کرتے ہیں، اور غایت بے تعصبی کے ساتھ ان کو شک و احتمال کا پورا حق دیتے ہیں، اور ان کے دوسرے اتحادیوں کے درمیان فرق کرتے ہیں، ایک جگہ اسی خط میں لکھتے ہیں:۔

لكنّ ابن عربي اقربهم الى الاسلام واحسن	ابن عربی ان لوگوں میں اسلام سے قریب تر ہیں، اور
كلاما فى مواضع كثيرة، فانه يفرق بين	ان کا کلام بہت سے مقامات پر نسبتاً بہتر ہے، اس لئے
المظاهر والظاهر فيقر الامر والنهى	وہ مظاہر اور ظاہر میں فرق کرتے ہیں، امر و نہی اور شرائع
والشرائع على ما هى عليه ويامُر بالسلوك	و احکام کو اپنی جگہ رکھتے ہیں، مشائخ نے جن اخلاق و
بكثير مما امر به المشائخ من الاخلاق	عبادات کی تاکید کی ہے ان کو اختیار کرنے کا مشورہ
والعبادات ولهذا كثير من العبّاد ياخذون	دیتے ہیں، اس لئے بہت سے عابد و صوفی ان کے کلام
من كلامه سلوكهم فينتفعون بذالك	سے سلوک کو اخذ کرتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے حقائق کو
وان كانوا لا يفقهون حقائقه ومن	اچھی طرح نہیں سمجھتے، ان میں سے جو ان حقائق کو سمجھ لیتے
فهمها منهم ووافقه فقد تبيّن قوله[1]	ہیں اور ان کی موافقت کرتے ہیں، ان پر ان کے کلام
	کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

وهذه المعانى كلها هى قول صاحب	یہ تمام مضامین صاحب فصوص کے اقوال ہیں، اللہ تعالٰی
الفصوص والله تعالى اَعْلَمُ بما مات	ہی کو علم ہے کہ ان کا خاتمہ کس چیز پر ہوا، اللہ تعالٰی

[1] مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المنبجی مندرجہ "جلاء العینین" ص۵۷

الرجل علیہ واللہ یغفر لجمیع المسلمین	تمام مسلمان مردوں اور عورتوں زندہ و مردہ کی
والمسلمات والمومنین والمومنات	مغفرت فرمائے اے ہمارے پروردگار ہماری اور ہمارے
الاحیاء منھم والاموات ربنا اغفرلنا	ان... بھائیوں کی مغفرت فرمادے جو ہم سے پہلے ایمان
ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان	کے ساتھ چلے گئے اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کی
ولا تجعل فی قلوبنا غلاّ للذین امنوا	طرف سے کھوٹ نہ رکھ اے ہمارے پروردگار تو بڑی
ربنا انک رؤف رحیم۔[1]	شفقت والا مہربان ہے۔

پھر صدر رومی[2] کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ھوابعد عن الشریعۃ والاسلام"[3] اس کے بعد تلمسانی، اور ابن سبعین کی پرزور تردید کرتے ہیں، وہ سب سے زیادہ ناراض تلمسانی سے ہیں، جن کے متعلق حمیّتِ دینی میں ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلے ہیں۔

واما الفاجر التلمسانی[4] فھو اخبث	باقی رہا تلمسانی فاسق تو اس گروہ میں اس کی خباثت
القوم واعمقھم فی الکفر، فانہ لا یفرق	سب سے بڑھی ہوئی تھی، اور کفر میں وہ سب سے گہرا ہے
بین الوجود والثبوت کما یفرق ابن	اس لئے کہ وہ وجود و ثبوت کے درمیان اس طرح
عربی، ولا یفرق بین المطلق والمعین	بھی فرق نہیں کرتا جس طرح ابن عربی کرتے ہیں، اور
کما یفرق الرومی ولکن عندہ ما ثم	نہ مطلق و معین میں تمیز کرتا ہے جس طرح صدر الدین
غیرہ ولا سوی بوجہ من الوجوہ وان	قونوی سے منقول ہے اس کا مسلک تو یہ ہے کہ خدا
العبد انّما یشھد السوی مادام محجوبًا	کی ذات سے مغایر و ماسوا کا وجود ہی نہیں، بندہ کو
فاذا انکشف حجابہ رأی انہ ما ثم غیر،	اگر ماسوی کا مشاہدہ ہوتا ہے تو محض اس وقت تک

---

[1] مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المنبجی مندرجۂ جلاء العینین ص۵۷ [2] علامہ صدر الدین قونوی [3] ایضاً ص۵۷

[4] تلمسانی اپنے معتقدین کے حلقہ میں العفیف التلمسانی کے لقب سے مشہور ہیں۔

يبين له الامر ولهذا كان يستحل جميع المحرمات۔[1] الخ

جب تک کہ وہ محجوب ہے جب یہ حجاب مرتفع ہو جائیگا تو وہ دیکھے گا کہ ماسوی کا وجود نہیں اس وقت اس کو حقیقتِ حال کا علم ہوگا، اسی بنا پر یہ تلمسانی تمام محرمات کو حلال سمجھتا تھا۔

آخر میں وہ ایک نکتہ کی بات یہ لکھتے ہیں کہ :۔

"فرقہ جہمیہ کے متکلمین کسی چیز کی عبادت نہیں کرتے، اور اس فرقہ کے متعبدین (شائقین عبادت) ہر چیز کی عبادت کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کے متکلم کے دل میں کوئی خدا پرستی اور شوقِ عبادت نہیں، وہ اپنے کو سلبی صفات (صفات عدم وموات) سے موصوف کرتا ہے، لیکن متعبد کے دل میں خدا پرستی اور عبادت کا جذبہ ہے اور قدرتی بات ہے کہ قلب موجود کی طرف مائل ہوتا ہے، معدوم کی طرف نہیں، اس لئے اس کو (مجبوراً) مخلوقات کی پرستش کرنی پڑتی ہے، یا تو وجود مطلق کی یا بعض مظاہر کی، جیسے آفتاب، ماہتاب، انسان، بت وغیرہ، اس طرح اتحادیوں کا قول (وحدۃ الوجود) دنیا کے ہر شرک پر حاوی ہے، وہ اللہ تعالٰے کی توحید کے قائل وعامل نہیں بلکہ اس قدرِ مشترک کی توحید کے قائل ہیں، جو اس کے اور مخلوقات کے درمیان ہے، اس لئے وہ دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں" وھم بربھم یعدلون" اسی بنا پر ایک معتبر شخص کا بیان ہے کہ ابن سبعین ہندوستان جانے کا ارادہ رکھتا تھا کہتا تھا کہ اسلام کی سرزمین میں اس کی گنجائش نہیں، ہندوستان کے لوگ[2] چونکہ مشرک ہیں، ہر چیز کی عبادت کرتے ہیں، یہاں تک کہ درختوں اور جانوروں تک کی (اس لئے ان کے ساتھ اچھی گزرے گی) اور یہی "اتحادیوں" کے قول کی حقیقت ہے، میں ذاتی طور پر کچھ لوگوں کو جانتا ہوں جو فلسفہ اور کلام کے ساتھ اشتغال رکھتے ہیں، وہ انہی اتحادیوں کے طریق پر خدا پرست اور عابد بنتے ہیں، وہ جب اللہ تعالٰے کی صفت

---

[1] جلاء العینین ص۵۸ [2] ہندوستان کے قدیم باشندے۔

بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں ہے، ویسا نہیں ہے، اور اس کی صفت میں مسلمانوں کی طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ مخلوقات کی طرح نہیں ہے، لیکن خالق کی ان صفات کا انکار کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام نے بیان کی ہیں، اور جب ان میں سے کسی پر ذوق اور وجد غالب آتا ہے تو اتحادیوں کا راستہ اختیار کرتا ہے، اور کہنے لگتا ہے کہ تمام موجودات خدا ہی ہیں، جب اس سے کہا جاتا ہے کہ کہاں تو وہ نفی (کہ خدا نہ ایسا ویسا) اور کہاں یہ اثبات (کہ سب موجوداتِ خدا ہی ہیں) تو کہنے لگتا ہے کہ وہ میرا وجدان تھا، یہ میرا ذوق ہے، اس گمراہ سے کوئی کہے کہ جو ذوق اور وجد اعتقاد کے مطابق نہ ہو تو ان میں سے ایک یا دونوں باطل ہوں گے، اذواق اور مواجید درحقیقت معارف و اعتقادات کے نتائج ہیں، اس لئے کہ قلب کی معرفت اور اس کا حال دونوں متلازم ہیں، چنانچہ بقدر علم و معرفت کے وجد، محبّت اور حال ہوتا ہے، یہ لوگ اگر انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا راستہ اختیار کرتے جنھوں نے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کا حکم دیا اور اس کی وہی صفات بیان کرتے جو اس نے اپنی خود بیان کیں اور اس کے انبیاء نے بیان کیں اور سابقین اولین کی پیروی اختیار کرتے تو ہدایت کے راستہ پر چلتے اور یقین کی حلاوت اور قلب کی طمانیت ان کو حاصل ہوتی، کسی نے صحیح کہا ہے[1] کہ انبیاء علیہم السلام کے یہاں اللہ تعالےٰ کی صفات کا اثبات مفصّل اور (جو صفات اس کے لائق نہیں) ان کی نفی مجمل ہے "ان الرّسل جاؤا باثبات مفصل ونفی مجمل"۔ بخلاف اس کے بددین اہل تعطیل (جہمیہ وفلاسفہ جن سے اتحادی متأثر ہیں) نفی کے وقت تو خوب تفصیل سے کام لیتے ہیں، اور اثبات کے وقت محض اجمال پر اکتفا کرتے ہیں، قرآن مجید صفات ثبوت سے بھرا پڑا ہے اور اس میں بڑی تفصیل ہے "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ"، "وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"، "اِنَّهٗ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ"

---

[1] خود امام نے اپنی تصنیفات میں جابجا یہ بات کہی ہے۔

"وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا" اور نفی کے موقع پر ایک جامع مانع بات یہ کہہ دی "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" "لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" "هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا" "سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝"

اس عقیدہ سے جو اخلاقی فتنہ اور بدنظمی ولاقانونی پھیل رہی تھی، اور فسّاق اہلِ ہوس نے اس کو جس طرح آڑ بنالیا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

"اس عقیدہ کے مدّعی خواہشاتِ نفس، بوالہوسی اور اعتقادی خرابیوں کے جامع ہیں، اور اس کا نتیجہ کہیں کہیں یہ ظاہر ہوا ہے کہ بعض لوگ لڑکوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالےٰ کی تجلی ہے، اور یہ مظہر جمال خداوندی ہیں، بعض بعض بوسہ دیتے ہیں، اور اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ تو خدا ہے، بعض لوگ اپنی اولاد پر دست درازی کرتے ہیں، اور الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ"[1]

یہ وہ زمانہ تھا کہ الملک الناصر محمد بن قلاؤون برائے نام سلطان تھا، اور امیر رکن الدین بیبرس الجاشنگیر مدار المہام اور سلطنت کے سیاہ سپید کا مالک تھا، جاشنگیر شیخ نصر المنبجی کا معتقد و مرید تھا، اور ان کو شیخ ابن عربی سے بغایت اعتقاد تھا، شیخ کے متعلق ابن تیمیہؒ کے جو خیالات تھے، اور جن کا وہ تقریراً و تحریراً وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہتے تھے، اس کی اطلاع مصر پہونچتی رہتی تھی، اور یہ شیخ نصر المنبجی کی برافروختگی کے لئے کافی وجہ تھی، جاشنگیر جو عام ترک امراء کی طرح معمولی پڑھا لکھا اور فوجی اور انتظامی قابلیت کا آدمی تھا، اپنے شیخ کی رائے سے متأثر تھا، اور ابن تیمیہ کے متعلق وہی رائے رکھتا تھا، جو اس کے شیخ کی رائے تھی، شام سلطنتِ مصر کا ایک صوبہ اور کلّیۃً اس کے ماتحت تھا، اور سلطان مصر کو ایسے تمام اشخاص کو طلب کرنے اور ان کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق تھا، جو اس کی رائے میں "امنِ عامہ" کے لئے مضر یا کسی "شورش" کا باعث تھے، عام طور پر اس بارہ میں ذاتی رجحانات یا اہلِ دربار کی خواہشات کام کرتی تھیں،

[1] الرد الاقوم علیٰ فصوص الحکم ص ۵۲

اور اس وقت بھی صورتِ حال یہی تھی کہ مدار المہام سلطنت کے شیخ و مقتدی نصر المنبجی کو ابن تیمیہ سے کد تھی، اور وہ ان کو زک پہونچانا چاہتے تھے۔

ابن تیمیہ مصر میں

بہر حال ۵ رمضان ۷۰۵ھ کو ابن تیمیہ کی طلبی کا فرمان شام پہنچا، ان کے احباب و تلامذہ کو اس سے بڑی تشویش پیدا ہوئی، نائب السلطنت نے (جو ان کا ہمدرد اور معتقد تھا) ان کو روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں سلطان سے خط و کتابت اور معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ابن تیمیہ سفر کے لئے آمادہ تھے، اور انھوں نے کہا کہ مصر کے سفر میں بہت سے مصالح اور منافع پیشِ نظر ہیں، بالآخر ان کے احباب و معتقدین نے بادیدۂ پُرنم ان کو رخصت کیا، مشائعت کرنے والوں کا بڑا ہجوم تھا، اور لوگ بڑے متأثر تھے۔

دمشق سے چل کر انھوں نے غزّہ کی جامع مسجد میں درس دیا، جس میں بڑا اجتماع تھا۔

اسیری و رہائی

۲۲ رمضان کو وہ مصر پہونچے، جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ قلعہ میں ایک بڑی مجلس منعقد ہوئی، جس میں قضاۃ اور اعیانِ سلطنت شریک ہوئے، ابن تیمیہ نے وہاں گفتگو کا آغاز کرنا چاہا، لیکن ان کو اجازت نہیں دی گئی، بعض حاضرین نے ان کے عقائد و مسائل[1] پر اعتراضات کئے، انھوں نے جب جواب دینے کے لئے حمد و ثنا کے ساتھ تقریر کا آغاز کیا تو ان سے کہا گیا کہ ہم آپ کا خطبہ سننے کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں، انھوں نے دریافت کیا کہ میرے مقدمہ میں حَکَم کون ہے؟ کہا گیا کہ قاضی ابن مخلوف مالکی،[2] انھوں نے کہا کہ آپ تو میرے

---

[1] یہ عقائد و مسائل وہی قدیم کلامی مسائل تھے جن پر بارہا دمشق میں بحث ہو چکی تھی اور ابن تیمیہ نے ان پر مستقل کتابیں اور رسائل لکھے تھے، مثلاً "استواء علی العرش" کی حقیقت، کلام باری کی حقیقت اور حروف و صوت کی بحث [2] یہ مصر میں ابن تیمیہ کے بڑے حریف اور مقابل تھے۔

حریف اور مدّمقابل ہیں، آپ حَکَم کیسے بن سکتے ہیں؟ اس پر ان کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے ابن تیمیہ کے خلاف فیصلہ صادر کردیا[1]، جس کے نتیجہ میں وہ کچھ عرصہ بُرج میں قید رہے، پھر عید کی رات کو وہ مشہور قید خانہ میں جس کو مصر میں "جُب" (کنواں) کہتے تھے، اپنے بھائی شرف الدین عبداللہ اور زین الدین عبدالرحمٰن کے ساتھ منتقل کردیئے گئے[2]، اگلے سال (۷۰۶ھ) میں عید کی رات نائب مصر اور بعض قضاۃ و فقہاء کی طرف سے اس بات کی سلسلہ جنبانی ہوئی کہ ابن تیمیہ کو آزاد کردیا جائے، بعض حاضرین نے یہ شرط کی کہ وہ اپنے بعض عقائد سے رجوع کا اعلان کریں، ابن تیمیہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے صاف انکار کردیا، چھ مرتبہ ان کو دعوت دی گئی کہ وہ خود آکر اس مسئلہ پر گفتگو کرلیں، مگر انھوں نے منظور نہیں کیا اور ان کا جواب یہی رہا کہ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْہِ[3]۔

بنائے اختلاف اور مسلک کی توضیح خود شیخ الاسلام کی زبان سے

خوش قسمتی سے خود شیخ الاسلام کا ایک مستقل رسالہ جس میں انھوں نے مصر کی مجلس مباحثہ، پھر حبس و اسارت کے واقعات، رہائی کی سلسلہ جنبانی اور انکار اور اپنے مسلک کی توضیح خود کی ہے، حال میں شائع ہوا ہے، اس رسالہ سے بہت سے نئے اور ضروری حالات پر روشنی پڑتی ہے، یہاں اس کے کچھ جستہ جستہ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں[4]۔

"ایک دن میرے پاس داروغۂ جیل آیا، اور اس نے کہا کہ نائب (مصر) سلام کہتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ آخر کب تک جیل میں رہنا ہے؟ کیا نکلنے کا ارادہ نہیں؟ کیا اب بھی آپ "اسی بات" پر قائم ہیں؟ میں نے

---

[1] اس مجلس کی سرگذشت خود امام ابن تیمیہ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھی ہے جو "المحنۃ" کے نام سے حال میں شائع ہوا ہے [2] ابن کثیر ص ۳۸ [3] ایضاً ص ۴۲ [4] یہ رسالہ دمشق کے مشہور کتب خانہ "الظاہریہ" میں شیخ کے برادرِ حقیقی اور رفیق زندان شیخ شرف الدین ابن تیمیہ کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا، ہمارے فاضل دوست شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ سابق امام حرم کی حسن مساعی اور شیخ محمد نصیف کے اہتمام سے وہ چند دوسرے رسائل کے ساتھ شائع ہوگیا ہے، جس کا نام "مجموعۂ علمیہ" ہے۔

خیال کیا کہ اس شخص کی زبانی پیغام بھیجنا مناسب نہیں (کہ معلوم نہیں پورے طور پر ادا کر پائے یا نہیں؟) تو میں نے اس سے کہا کہ نائب صاحب کو سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ مجھے معلوم نہیں کہ "وہ بات" کیا ہے، مجھے ابھی تک یہی معلوم نہیں کہ میں کس جرم میں قید کیا گیا ہوں اور میرا قصور کیا ہے، نیز اس پیغام کا جواب میں ملازمین کی زبانی نہیں دینا چاہتا، آپ اپنے معتبر لوگوں میں سے چار ایسے شخصوں کو بھیجیں جو سمجھدار بھی ہوں، اور راست گفتار اور امین بھی، تاکہ میں ان سے پوری بے کم وکاست بات کہہ سکوں، اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ اس قضیہ میں بہت دروغ گوئی اور تحریف سے کام لیا گیا ہے۔

اس کے بعد داروغہ آیا، اور اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا جس کو میں پہچانتا نہیں تھا، لیکن لوگوں نے بیان کیا کہ ان کا نام علاء الدین الطبرسی ہے، لوگ جو ان سے واقف تھے، ان کی تعریف بھی کرتے ہیں، لوگ جانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے صبر وتحمل اور تلخ بات سننے کی قوت عطا فرمائی ہے، اور ادنیٰ مخاطب سے بھی میں انصاف کے ساتھ گفتگو کرتا ہوں، چہ جائے کہ حکام اور ذمہ دارانِ حکومت سے، لیکن انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے مطالبہ کے منظور کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے ایک محضر بھی نکالا جس میں خلافِ واقعہ اور غلط باتیں لکھی تھیں، اور جس میں اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی دعوت تھی، میں جب ان کو اس کا جواب دیتا، اور پیغام سپرد کرتا، تو وہ کچھ سننے کے لئے تیار نہ ہوتے، اور اسی پر اصرار کرتے کہ میں اس مطالبہ کو منظور کرلوں اور وعدہ کروں کہ پھر اپنے مسلک کی طرف رجوع نہ کروں گا (اگرچہ قرآن وحدیث میں مباحثہ میں رفق ولین کا حکم ہے، مگر جب ظلم کیا جائے تو شدت، اور خودداری کا بھی حکم ہے) میں نے سلسلۂ کلام میں ان سے کہا کہ اس معاملہ میں مجھے فیصلہ کا حق نہیں، یہ معاملہ اللہ اور رسولؐ اور تمام عالم کے مسلمانوں کا ہے، مجھے اللہ کے دین کے تغیر وتبدل

کا اختیار نہیں، اور میں تمہاری اور کسی دوسرے کی وجہ سے دین اسلام سے ہٹ نہیں سکتا، اور نہ کذب و بہتان کا اقرار کر سکتا ہوں۔

جب میں نے دیکھا کہ وہ اس پر اصرار کرتے ہیں تو میں نے سختی سے بات کی، اور میں نے کہا کہ یہ فضول باتیں چھوڑو، اور جاؤ اپنا کام کرو، میں نے تم سے اس کی درخواست نہیں کی تھی کہ تم مجھے جیل سے نکالو، اس وقت اوپر کا دروازہ بند تھا، میں نے کہا کہ دروازہ کھولو، میں جاتا ہوں گویا گفتگو ختم ہے۔

میں نے قاصد سے کہا تھا کہ میں نے ان مسائل میں جو کچھ لکھا یا کہا ہے، وہ ہمیشہ سوال و استفتاء کے جواب میں تھا، میں نے کسی سے اس مسئلہ پر ابتداءً مراسلت نہیں کی، نہ کسی کو از خود مخاطب بنایا، ایک طالب حق میرے پاس آتا ہے، اور بار بار مجھ سے سوال کرتا ہے، کیا از روئے دین اس کی گنجائش ہے کہ میں کتمانِ حق سے کام لوں، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "من سئل عن علم یعلمہ فکتمہ ألجمہ اللہ یوم القیامۃ بلجام من النار"[1] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ"[2] کیا میں تمہارے کہنے سے طالب حق کے جواب دینے سے احتراز کروں تاکہ میرا انجام وہ ہو (جو آیت میں بیان کیا گیا ہے) کیا سلطان مجھ کو اس کا حکم دیتے ہیں، یا کوئی اور مسلمان لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ تم ان بے اصل باتوں کی بنا پر جو تم تک پہنچی ہیں، بادشاہ کے حکم کو آڑ بنانا چاہتے ہو۔

---

[1] جس شخص سے (دین کی) کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا اس کو علم ہے اور وہ اس کو ظاہر نہ کرے اور کتمان سے کام لے، اللہ تعالیٰ اس کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام ڈالے گا۔

[2] بیشک جو لوگ ان کھلی کھلی باتوں اور ہدایت کو جو ہم نے نازل کر دیا ہے، اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں کہ ہم نے ان کو لوگوں کے لئے کتاب میں بیان کر دیا، یہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں (سورۂ بقرہ۔ ۱۵۹)

اس پر قاصد نے کہا کہ جناب والا! بادشاہ کا نام تو درمیان میں نہ لائیے کوئی بادشاہ کی شان میں گفتگو نہیں کرتا! میں نے کہا کہ جی ہاں اس وقت کوئی بھی بادشاہ کے معاملہ میں کچھ کہنے سننے کی جرأت نہیں کرتا، یہ فتنہ اسی وجہ سے ہوا ہے' یہ ہم نے شام ہی میں سن لیا تھا کہ یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ بادشاہ پر حرف زنی کی گئی ہے' اور ان کو الزام لگایا گیا ہے' لیکن ہم سمجھتے تھے کہ کوئی بھی اس کو باور نہیں کرے گا.

میں نے اس سے کہا کہ اس معاملہ کا نقصان مجھ پر عائد نہیں ہوگا، مجھے کس بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے اگر میں اس مقدمہ میں قتل کر دیا گیا تو میں بڑے درجہ کی شہادت پاؤں گا، اور یہ میرے حق میں ایک بڑی سعادت ہوگی، قیامت میں مجھے راضی کیا جائے گا، اور جو لوگ اس میں ساعی بنیں گے، قیامت تک وہ لعنت کے مستحق ہوں گے' اس لئے کہ ساری امتِ محمدی کو معلوم ہے کہ میں حق پر مارا جا رہا ہوں جس کے ساتھ اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا، اور اگر میں محبوس کر دیا گیا تو خدا کی قسم میرا محبوس ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم ترین نعمت ہوگی اور مجھے کسی ایسی چیز کا بھی خوف نہیں' جو لوگ مجھ سے چھین لیں گے' نہ کسی مدرسہ کی صدر مدرسی یا اہتمام' نہ کوئی جائداد، نہ دولت، نہ حکومت' اور عہدہ اور نہ کوئی اور چیز' لیکن اس معاملہ کا ضرر تم ہی پر عائد ہوگا، اس لئے کہ جن لوگوں نے اس معاملہ میں شام میں بیٹھ کر ریشہ دوانی کی ہے میں جانتا ہوں کہ ان کا مقصود تمہارے خلاف سازش کرنا اور تمہارے دین و حکومت کو نقصان پہنچانا ہے' ان میں سے بعض تاتاریوں کے ملک میں گئے اور بعض اب بھی وہاں مقیم ہیں' انہی لوگوں نے تمہارے دین و دنیا کے بگاڑنے کا ارادہ کیا ہے اور مجھے محض آڑ بنایا ہے' اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ میں تمہارا دوست اور خیر خواہ ہوں' اور تمہارے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی چاہتا ہوں' اس معاملہ میں بہت سی باتیں ابھی تک سربستہ راز ہیں' وہ اپنے وقت پر منکشف

ہوں گی، ورنہ میرے اور مصر میں کسی کے درمیان نہ کوئی عداوت تھی، نہ مخالفت، اور میں ہمیشہ سے اہلِ مصر کا محب اور ان کے اور ان کے حکام کا اور علماء کا حامی اور دوست رہا ہوں۔

اس نے کہا کہ میں نائب السلطان کو کیا جا کر جواب دوں؟

میں نے کہا کہ سلام کہنا اور پورا پیغام پہنچا دینا۔

اس نے کہا کہ آپ نے تو بہت سی باتیں کہی ہیں!

میں نے کہا کہ خلاصہ یہ ہے کہ اس محضر میں جو کچھ ہے اس کا بڑا حصہ جھوٹ ہے۔

البتہ یہ جملہ استوی حقیقۃ (ضرور میں نے کہا ہے) اور مالکی اور غیر مالکی علماء میں سے متعدد نے لکھا ہے کہ اس پر اہلِ سنت والجماعت کا اجماع ہے، اور اس کا سلف اور اس امت کے پیشواؤں اور اکابر علماء میں سے کسی نے انکار نہیں کیا، بلکہ میرے علم میں تو کسی عالم نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے تو میں ایسے اجماعی عقیدہ کو جس کا کسی عالم نے انکار نہیں کیا ہے کیسے چھوڑ دوں؟ علامہ ابو عمر ابن عبد البر کہتے ہیں "اهل السنة مجمعون على الاقرار بالصفات الواردة كلها فى القران والسنة، والايمان بها وحملها على الحقيقة لا على المجاز، الا انهم لا يكيفون شيئًا من ذلك ولا يحدون فيه صفة محصورة، واما اهل البدع الجهمية والمعتزلة كلها والخوارج فكلهم ينكرها، ولا يحمل شيئًا منها على الحقيقة ويزعمون ان من اقرّبها مشبهة وعند من اقرّبها نافون للمعبود، والحق فيما قاله القائلون بما نطق به كتاب الله وسنة رسوله وهم ائمة الجماعة"۔

الشیخ العارف ابو محمد عبد القادر گیلانی "غنیۃ الطالبین" میں فرماتے ہیں "وهو بجهة العلو مستو على العرش محتوٍ على الملك محيط علمه بالاشياء" آگے فرماتے ہیں "ولا يجوز وصفه بانه فى كل مكانٍ بل يقال انه فى السماء على العرش كما قال الرحمٰن على العرش استوىٰ"

وينبغي اطلاق صفة الاستواء من غير تاويل وانه استواء الذات على العرش"۔[1]

ابنِ مخلوف (تاویل سے) جس عقیدہ کا اظہار کرتے ہیں، وہ خود امام مالک ان کے ائمہ و اصحاب اور ابوالحسن اشعری اوران کے ائمہ و اصحاب کے نصوص کے خلاف ہے ان سب نے اسی کی تصریح کی ہے، جو ہم کہتے ہیں، اسی بنا پر حنابلہ اور اشعریہ کی مصالحت ہوگئی، اور لوگوں کا اتفاق ہوا، جب حنابلہ نے ابوالحسن اشعری کا قول دیکھا تو انھوں نے کہا کہ یہ الشیخ الموفق[2] کے قول سے بہتر ہے، اور اس طرح دلوں کے کینے نکل گئے، اور فقہاء شافعیہ وغیرہ کی زبان سے نکلا کہ "الحمد للہ علی اتفاق کلمۃ المسلمین"۔

میرا بھی یہی عقیدہ ہے کہ "هومستوعلى العرش حقيقة بذاته بلا تكييف ولا تشبيه" اس نے کہا کہ اس کو آپ لکھ دیجئے اور اسی کی پابندی کیجئے، میں نے کہا کہ وہ انہی لفظوں میں اس عقیدہ میں لکھا ہوا ہے، جو تمہارے پاس موجود ہے اور اس پر دمشق میں بحث ہوچکی ہے، اور اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اب میں اس میں کیا اضافہ کروں؟

میں نے اس سے کہا کہ میں نے پچاس کتابوں سے زیادہ مہیا کی ہیں، جو تمام تر محدثین، صوفیہ، متکلمین اور فقہاء، مذاہبِ اربعہ کی کتابیں ہیں، سب میری مؤید ہیں، اور میں اپنے مخالفین کو تین سال کی مہلت دیتا ہوں کہ اس کے خلاف ایک حرف بھی ائمۂ اسلام سے ثابت کردیں، اب میں کیا کروں۔

جب طبرسی چلے گئے تو کچھ دیر کے بعد داروغہ آیا، اور اس نے کہا کہ نائب السلطان آپ کو سلام کہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ اپنے قلم سے اپنا عقیدہ لکھ دیجئے، میں نے کہا کہ نائب صاحب کو سلام کہو اور میری طرف سے عرض کرو کہ اگر میں اس وقت کچھ لکھوں گا تو کہنے والا کہے گا کہ شیخ نے اپنے عقیدۂ سابق میں کمی زیادتی کی یا اپنا عقیدہ بدل دیا، اسی طرح جب دمشق میں انھوں نے عقیدہ کی تحریر کا مطالبہ کیا،

---

[1] شیخ نے اس موقع پر اس مضمون کی تائید میں اکابر علماء مذاہب اربعہ کی بہت سی نقول نقل کی ہیں، ان میں سے یہاں انہی دونوں نقلوں پر اکتفاء کی گئی۔ [2] شیخ موفق الدین ابنِ قدامہ جن کا رجحان حنابلہ میں تاویل کی طرف ہے۔

تو میں نے وہی چیز پیش کی جو پہلے لکھی جا چکی تھی، میں نے کہا کہ یہی وہ عقیدہ ہے جو شام کی تینوں مجلسوں میں پڑھا جا چکا ہے، اور نائب شام سرکاری ڈاک کے ساتھ اس کو بھیج چکا ہے اور یہ سب تحریریں آپ کے پاس موجود ہیں، اور عقیدہ کوئی ایسی چیز نہیں جو میں اپنی طرف سے ایجاد کروں، یہاں تک کہ روزانہ ایک نئے عقیدہ کا اعلان کروں، میرا عقیدہ وہی ہے جس کا پہلے اظہار کر چکا اور تحریر وہی ہے جو آپ کے پاس موجود ہے، آپ اس کو دیکھ لیجئے۔

وہ واپس گیا اور پھر آیا اور کہا کہ آپ اپنے قلم سے کچھ لکھ دیجئے، میں نے کہا کہ میں کیا لکھ دوں؟ اس نے کہا کہ مثلاً معافی نامہ اور یہ کہ آپ کسی سے تعرض نہ کریں گے، میں نے کہا کہ ہاں مجھے یہ منظور ہے، کسی کو ایذا پہنچانا میرا مقصود نہیں، نہ کسی سے انتقام لینا چاہتا ہوں نہ کسی سے دار و گیر کرنے کا ارادہ ہے، اور میں ہر اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے میرے ساتھ زیادتی کی، میں نے یہ لکھ دینا چاہا، پھر میں نے کہا کہ اس کے لکھنے کا دستور نہیں اس لئے کہ انسان کا اپنے حق کو معاف کر دینا کسی تحریر کا محتاج نہیں ہے۔

شیخ نصر المنبجی کو اس حقیقت حال کی اطلاع ضرور کر دینی چاہیئے تاکہ اپنی تدبیر سے کچھ اس کی اصلاح اور انتظام کریں، میرا مقصود محض اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، جس چیز کا اصل خطرہ ہے وہ یہ کہ اہل مصر کے آپس کے اختلافات اور ایک دوسرے کے بارہ میں ان کے اقوال سے کہیں فساد نہ برپا ہو جیسا کہ ابھی تک دیکھنے میں آیا ہے اور شام میں جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے، حالانکہ شام میں اتفاق کی صورت مصر سے زیادہ ہے، اور میں بخدا فساد کی آگ بجھانے میں (خواہ مصر میں ہو خواہ کہیں اور) اعانت کرنے میں سب سے پیش پیش رہوں گا، اور خیر کے قائم کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا اور ابن مخلوف خواہ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں میں حتی الامکان ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کو نفع پہنچانے سے کبھی دریغ نہیں کروں گا، اور ان کے دشمن کی ان کے مقابلہ میں کبھی مدد نہیں کروں گا، اور اصل سہارا اور مدد اللہ کی ہے، یہی میری نیت اور میرا عزم ہے، حالانکہ میں تمام امور اور حالات سے واقف ہوں،

لیکن مجھے علم ہے کہ شیطان مومنین کے دلوں میں فساد ڈال دیتا ہے' اور میں اپنے مسلمان بھائیوں کے مقابلہ میں کبھی شیطان کا معاون نہیں بنوں گا۔

یہ چکر اور یہ پریشانی اسی طرح رفع ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور اس سے استغفار اور توبہ کی جائے اور سچے دل سے اس کی پناہ لی جائے" فانہ سبحانہ لاملجأ منہ الا الیہ ولا حول ولا قوۃ الّا باللّٰہ"

باقی رہا استغاثہ کا مسئلہ تو تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے' اور دینِ اسلام کا یہ بدیہی اور قطعی مسئلہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کی عبادت' کسی سے دعا، اور کسی سے استغاثہ' اور کسی پر توکل جائز نہیں' اور یہ کہ جس نے کسی مقرّب فرشتہ یا مبعوث پیغمبر کی عبادت کی' یا اس سے دعا کی' یا اس سے استغاثہ کیا' تو وہ مشرک ہے' کسی مسلمان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ یہ کہے کہ اے جبرئیل' اے میکائیل' اے ابراہیم' اے موسیٰ' یا رسول اللہ میری مغفرت فرمایئے یا مجھ پر رحم کیجئے یا مجھے رزق دیجئے' یا میری مدد فرمایئے یا میری فریاد سنئے یا میرے دشمن سے مجھے پناہ دیجئے اور اسی طرح کی باتیں' بلکہ یہ سب خصائصِ الوہیت ہیں' اور بڑے اہم اور مشہور مسائل ہیں جن کی علماء تشریح کر چکے ہیں' اور اللہ اور رسول کے حدود اور حقوق میں فرق بیان کر چکے ہیں[۱]' یہ اصول اسلام میں سے ہے تو اگر قاصد (ابن مخلوف) دینِ اسلام اور دینِ نصاریٰ میں امتیاز نہ کر سکتے ہوں جو حضرت مسیح اور ان کی والدہ محترمہ سے دعا کرتے ہیں تو پھر میں کیا کروں' لیکن جو سیدہ نفیسہ[۲] کو رب بنالے' اور کہے کہ وہ خوفزدہ کو پناہ دیتی ہیں' اور مصیبت زدہ کی فریاد سنتی ہیں' اور مدد کرتی ہیں' اور وہ ان کے دامنِ عاطفت اور وجاہت میں ہے' اور ان کا سجدہ کرتا ہے' اور ان سے گریہ وزاری کے ساتھ ایسی ہی دعا کرتا ہے جیسے کہ

۱؎ اس موقع پر شیخ نے اس مضمون کی آیات و احادیث جمع کردی ہیں' ملاحظہ ہو رسالہ "المحنۃ" شامل رسالہ "مجموعہ علمیہ" صفحہ ٦۰-٦۲

۲؎ سیدہ نفیسہ اہل بیت رسول میں سے ہیں' اور ان کی قبر قاہرہ میں ہے جس کی عوام بڑی تعظیم کرتے ہیں۔

رب السمٰوٰت والارض سے دعا کرنے میں گڑگڑاتا ہے، اور ایسے زندہ پر بھروسہ کرتا ہے جس کا انتقال ہو گیا ہے، اور اس زندہ پر بھروسہ نہیں کرتا، جو ہمیشہ زندہ رہے گا، اور جس کو فنا نہیں تو اس میں شک نہیں کہ ایسی ہستی کو شریک کرنا جو سیدہ نفیسہ سے افضل ہے، ان کو شریک کرنے سے زیادہ قوی ہو گا۔[1]

باقی رہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق (میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں) مثلاً آپ کی محبت کا اپنے نفس، متعلقین اور مال پر مقدم رکھنا، اور آپ کی تعظیم و توقیر اور احترام و عظمت اور اتباع و اطاعت اور آپ کی سنت کی پیروی وغیرہ وغیرہ تو وہ بڑے عظیم الشان ہیں، اسی طرح سے دعا میں آپ کو وسیلہ بنانا مستحسن ہے، باقی آپ سے دعا اور آپ سے استغاثہ (آپ کی دہائی دینا) تو وہ حرام ہے، میں نے اس موضوع (حقوق رسول) پر ایک کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرّسول" تصنیف کی ہے، جس میں اس مسئلہ کی ایسی تحقیقات اور تفصیلات ہیں کہ میرے علم میں اس سے پہلے کسی تصنیف میں نہیں ملتیں، اسی طرح سے ان اصول و قواعد ایمان کے بارہ میں بہت سے مضامین اور رسائل لکھ چکا ہوں جو دین کے بارہ میں مفید ترین چیزیں ہیں۔

شیخ (نصر) کی اطلاع میں یہ بات آجانی چاہیئے کہ مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ معاملہ کہیں ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے اور بے قابو نہ ہو جائے، اور کوئی ایسی بات نہ پیش آئے جس کا نقصان ان کو اور ابن مخلوف وغیرہ کو برداشت کرنا پڑے، اس لئے کہ مجھ سے ایسی بات کی فرمائش کی گئی ہے جو اس نقصان کا سبب بن سکتی ہے، میں نے اس کو منظور نہیں کیا، اس لئے کہ میں ان کا مخلص ہوں، واللہ میں نے ان کے ساتھ کبھی فریب نہیں کیا، اگر فریب کیا ہوتا تو اس بات کا اظہار نہ کرتا (کہ مجھ سے ایسی بات کی فرمائش کی جارہی ہے جس میں ان کا نقصان ہے) میں ان دونوں کا نیکی اور خدا ترسی کے کام پر معاون ہوں۔

آپ یہ بھی ان سے کہہ دیجئے کہ وہ بنیاد جس پر معاملات درست ہو سکتے ہیں یہ ہے کہ ہر شخص

---

[1] اس موقع پر شیخ نے توحید کی آیات و احادیث نقل کی ہیں، ملاحظہ ہو "المحنۃ" ص ۶۳

اللہ تعالٰی کی طرف رجوع کرے، اور (رمضان کے) اس مبارک عشرہ میں توبہ کرے، جب قلوب اور اندرون درست ہو جائیں گے تو ظواہر خود بخود درست ہو جائیں گے" اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ"

جیل کے اندر اصلاح و تعلیم اور اس کے اثرات

صاحب "الکواکب الدریّہ" شیخ الاسلام کے معاصر اور رفیقِ درس شیخ علم الدین البرزالی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :-

"شیخ جب مجلس میں پہونچے تو دیکھا کہ قیدی لہو و لعب اور تفریحات میں مشغول ہیں، اور اسی طرح اپنا دل بہلاتے اور وقت کاٹتے ہیں، شطرنج، چوسر وغیرہ کا زور ہے، نمازیں بے تکلف قضا ہوتی ہیں، شیخ نے اس پر اعتراض کیا، اور قیدیوں کی نماز کی پابندی، اور اللہ تعالٰی کی طرف توجہ، اعمالِ صالحہ، تسبیح و استغفار اور دعا کی طرف متوجہ کیا اور سنت کی تعلیم اور اعمالِ خیر کی ترغیب شروع کر دی، یہاں تک کہ علم و دین کی ایسی مشغولیت شروع ہو گئی کہ یہ جیل خانہ بہت سی خانقاہوں اور مدارس سے زیادہ بارونق اور بابرکت نظر آنے لگا، لوگوں کو ان کی ذات سے ایسا تعلق اور جیل کی اس دینی و علمی زندگی سے ایسی دلچسپی ہو گئی کہ بہت سے قیدی رہائی پانے کے بعد بھی ان کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور انہی کی خدمت میں رہنا پسند کرتے تھے"[1]

چار مہینے کے بعد (۱۴ صفر ۷۰۸ھ) کو دوبارہ ان کی رہائی کی کوشش کی گئی، قاضی القضاۃ بدر الدین بن جماعہ نے خود ان سے ملاقات کی، اور دیر تک گفتگو رہی، لیکن وہ نکلنے پر رضامند نہ ہوئے بالآخر ۲۳ ربیع الاول کو امیر حسام الدین مہنا بن عیسٰی ملک العرب[2] خود جیل خانہ گئے، اور شیخ کو قسم دی،

---

[1] الکواکب الدریہ صد ۱۸۱ [2] امیر حسام الدین عربی النسل امراء کے خاندان کے فرد اور شام کے ایک بڑے ذی وجاہت اور (باقی صد ۸۹ پر)

اور اپنے ساتھ نائب مصر کے مکان پر لائے، امیر حسام الدین ان کو اپنے ساتھ دمشق لیجانا چاہتے تھے، لیکن نائب السلطنت نے مشورہ دیا کہ شیخ ابھی کچھ روز مصر میں قیام فرمائیں تاکہ لوگوں کو ان کے علم و فضل کا اندازہ ہو اور ان سے استفادہ کریں۔

ابن تیمیہ کی اخلاقی بلندی

اس عرصہ میں ابن تیمیہ کی سیرت کی بلندی اور نمایاں ہوئی، انھوں نے کسی طاقت کے سامنے گردن نہیں خم کی اور نہ کسی دنیاوی ترغیب یا مالی منفعت سے ان کا دامن داغدار ہوا، انھوں نے سلطانی خلعت اور عطایائے سلطانی کے قبول کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔

ان کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے جیل سے باہر آتے ہی اپنے تمام مخالفین کو اور ان تمام لوگوں کو جنھوں نے ایذا رسانی کی کوشش کی تھی، بلا استثناء معاف کر دیا، اور اس کا صاف اعلان کر دیا کہ ان کو کسی سے کوئی شکایت نہیں اور نہ وہ کسی سے مواخذہ کریں گے، اپنی رہائی کے بعد انھوں نے شام جو خط لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں:۔

تعلمون رضی اللہ عنکم انی لا احب	اللہ تعالے آپ سے راضی ہو آپ کو معلوم ہے کہ میں
ان یوذی احدٌ من عموم المسلمین	نہیں چاہتا کہ عامۂ مسلمین میں سے کسی کو بھی ایذا
فضلا عن اصحابنا شیئ اصلا لا ظاہرا	پہونچے کسی طرح کی بھی ظاہری یا باطنی، چہ جائے کہ
او باطنًا، ولا عندی عتب علی احد	یہ پسند کروں کہ ہمارے احباب (علماء و اہلِ دین)

(باقی ص۸۸ کا) طاقت ور رئیس تھے، شامی ہونے کی وجہ سے وہ ابن تیمیہ کے مجاہدانہ کارناموں اور اصلاحی کوششوں سے بہ نسبت مصریوں کے زیادہ واقف تھے، اس لئے انھوں نے ابن تیمیہ کی رہائی میں خاص دلچسپی لی، ان کے خلوص، علو خاندان اور حریت پسندی کی وجہ سے ابن تیمیہ نے بھی ان کی پیش کش قبول کی، اور جیل سے باہر آنے پر آمادہ ہو گئے۔

منهم ولا لوم اصلاً بل لهم عندي من الكرامة والاجلال والمحبة اضعاف ما كان، كل بحسبه، ولا يخلوا الرجل اما ان يكون مجتهداً، او مخطئاً، او مذنباً، فالاول ماجور مشكور، والثاني مع اجره على الاجتهاد معفو عنه، والثالث فالله يغفرلنا وله ولسائر المومنين۔

کو میری وجہ سے کوئی ایذا پہونچے مجھے نہ کسی سے شکایت ہے نہ کسی پر ملامت، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی عزت وعظمت اور محبت میرے دل میں پہلے سے کئی گنا زیادہ ہے اور وہ ہر ایک مرتبہ کے مطابق، انسان (کسی شخص کے ساتھ اختلاف و نزاع کرتے ہیں) یا تو مجتہد ہوتا ہے یا غلط کار یا گنہگار، مجتہد تو ثواب اور شکریہ دونوں کا مستحق ہے، غلط کار قابلِ معافی ہے، رہا گنہگار تو اللہ ہماری، اس کی اور تمام مومنین کی مغفرت فرمائے۔

لا احب ان ينتصر من احدٍ بسبب كذبه عليّ او ظلمه او عدوانه، فاني قد احللت كل مسلم، وانا احب الخير لكل المسلمين، واريد لكل مؤمن من الخير ما اريده لنفسي والذين كذبوا وظلموا اهم في حلّ من جهتي۔[1]

میں نہیں چاہتا کہ کسی شخص سے اس وجہ سے انتقام لیا جائے کہ اس نے مجھ پر بہتان باندھا تھا یا ظلم یا زیادتی کی، اس لئے کہ میں نے ہر مسلمان کو معاف کر دیا ہے اور میں تمام مسلمانوں کے لئے بھلائی چاہتا ہوں، اور ہر مومن کے لئے اسی چیز کا طالب ہوں جس کا اپنے لئے، وہ تمام لوگ جو جھوٹ بولے اور جنھوں نے ظلم کیا، وہ میری طرف سے بری الذمہ اور آزاد ہیں، میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔

---

[1] ابن تیمیہ (محمد ابوزہرہ) ص۶۲۳

درس وافادہ

جیل سے آنے کے بعد ابن تیمیہ درس وافادہ میں مشغول ہو گئے، مصر کی فضا ان کے لئے ابھی سازگار نہ تھی، علماء وقضاۃ نے ان کے متعلق مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، گروہ صوفیہ بھی (جس میں توحید وجودی کا ذوق اچھا خاصا پایا جاتا تھا) ان سے بدگمان اور آزردہ تھا، مذاہبِ اربعہ میں سے صرف حنبلی اور عقائد میں سے صرف "عقیدۂ سلف" کی وکالت اور نمائندگی کے لئے ملک میں کوئی طاقتور اور مؤثر شخصیت موجود نہ تھی[1]، ورنہ دوسرے مذاہب کے بڑے قاضی اور عالم موجود تھے، ان سب وجوہ کی بنا پر ابن تیمیہ نے مصر میں کچھ عرصہ قیام اور درس وافادۂ عام کا ارادہ کر لیا، اور ان کے باقاعدہ اور بے قاعدہ درس اور مجالس شروع ہو گئیں، خالص علمی اور کلامی مسائل پر انھوں نے قاہرہ کے مشہور مدارس بالخصوص صالحیہ میں کئی درس دیئے جن سے خواص نے فائدہ اٹھایا اور ان کے اصلی خیالات وعقائد سے واقف ہوئے۔

اس درس وافادہ کا سلسلہ چھ مہینے جاری رہا، جس سے عوام وخواص نے دینی وعلمی فائدہ اٹھایا اور عام طور پر لوگ ان کے خلوص، غیر معمولی ذہن ودماغ اور علمی کمالات کے گرویدہ ہوئے۔

ابن تیمیہ کا خط والدہ کے نام

ابن تیمیہ کا مصر آنا اچانک ہوا تھا، اور یہ اندازہ نہ تھا کہ ان کو یہاں اتنے عرصہ قیام کرنا ہوگا، ان کی والدہ اور سارا کنبہ شام میں تھا، جو ان کی بخیریت واپسی کے لئے چشم براہ تھا، ابن تیمیہ نے دینی مصالح کے پیش نظر جب کچھ عرصہ مصر میں قیام کا فیصلہ کیا تو انھوں نے والدہ محترمہ کو اس ارادہ کی

---

[1] اتفاق سے اس وقت قاضی حنبلی بہت محدود علم وفہم کے آدمی تھے، اور ان کی وجہ سے حنابلہ کا پہلو بہت کمزور تھا۔
(ملاحظہ ہو ابن کثیر صفحہ ۳۸ ج ۱۴)

اطلاع دی اور ان سے اجازت طلب کی، یہ خط لطیف جذبات، پاک محبت، فرزندانہ سعادت مندی اور مردانہ حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا آئینہ ہے، اور بے ساختہ اور بے تکلف زبان میں لکھا گیا ہے اس لئے پورا نقل کرنے کے قابل ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

من احمد بن تیمیة الی الوالدة السعیدة اقرّ اللہ عینیها بنعمه واسبغ علیها جزیل کرمه وجعلها من امائه و خدمه۔	احمد بن تیمیہ کی جانب سے مخدومہ والدہ صاحبہ کی خدمت میں، اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے، اور ان کو اپنے احسانات سے مالامال فرمائے، اور ان کو اپنی مقبول بندیوں میں شامل فرمائے۔
سلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاته، انا نحمد الیکم اللہ الذی لا الٰه الا هو وهو للحمد اهل، وهو علیٰ کلّ شیٍٔ قدیر، ونسأله ان یصلّی علیٰ خاتم النبیین وامام المتقین محمد عبده ورسوله صلی اللہ علیه وسلم وعلیٰ آله وسلم تسلیمًا۔	السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس خدائے پاک کا شکر گذار ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور وہ لائق حمد و ستائش ہے، اور ہر چیز پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ کا درود و سلام اپنے رسول اور بندۂ خاص جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر جو خاتم النبیین، امام المتقین ہیں اور ان کے آل پر۔
کتابی الیکم عن نعم من اللہ عظیمة، ومنن کریمة والآءٍ جسیمة نشکر اللہ علیها ونسأله المزید عن فضله ونعم اللہ کلما جاءت فی نمو وازدیاد	میں یہ عریضہ آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں اور حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے اوپر بڑی نعمتیں بڑے انعامات اور بڑے عظیم الشان عطیے پاتا ہوں جن پر اس کی بارگاہ میں شکر گذار اور مزید کا

واياديه جلّت عن التعداد وتعلمون
ان مقامنا الساعة في هذه البلاد
انما هو لامورٍ ضرورية متى اهملناها
فسد علينا أمر الدين والدنيا ولسنا
والله مختارين للبعد عنكم ولو حصلنا
الطيور لسرنا اليكم ولكن الغائب
عذره معه وانتم لو اطلعتم على
باطن الامور فانكم . ولله الحمد .
ما تختارون الساعة الا ذلك، ولم
نعزم على المقام والاستيطان شهرًا
واحدًا بل كل يوم نستخير الله ولكم
وادعوا لنا بالخيرة فنسأل الله
العظيم ان يخير لنا وللمسلمين ما فيه
الخيرة في خير وعافية .

طلب گار ہوں، اللہ کی نعمتیں روز افزوں اور
اس کے احسانات لاتعداد ہیں آپ کی اطلاع
کے لئے لکھ رہا ہوں کہ اس وقت ہمارا مصر میں
قیام چند ایسے ضروری امور کی بنا پر ہے کہ اگر
ہم ان سے غفلت برتیں تو دین و دنیا کی خرابی
اور نقصان کا اندیشہ ہے، خدا کی قسم ہم اپنے
اختیار اور خواہش سے یہاں ٹھہرے ہوئے
نہیں ہیں اور ہم نے آپ سے دوری خود اختیار
نہیں کی ہے (اپنے جذبہ اور شوق کا حال
تو یہ ہے کہ) جی چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں اور
ہم اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جائیں، لیکن دور افتادہ
کا صحیح صحیح حال اور اس کی معذوری سمجھ میں نہیں
آسکتی، وہ اپنے حالات تو خود ہی جانتا ہے
اگر آپ کو حقیقت حال معلوم ہو جائے تو آپ
بھی (اپنے دینی شوق اور بلند ہمتی کی بنا پر) یہی
فیصلہ کریں گی کہ اس وقت میرا مصر ہی میں
ٹھہرنا انسب ہے، جہاں تک ہمارے ارادہ کا
تعلق ہے ہم نے ایک مہینہ بھی مصر میں قیام
کرنے اور سکونت اختیار کرنے کا کبھی عزم نہیں کیا،

بلکہ ہم روزانہ اپنے اور آپ کے لئے اللہ سے خیر کی
دعا کرتے رہتے ہیں آپ بھی ہمارے لئے اس کی دعا
کیجئے کہ اللہ تعالیٰ خیر مقدر کرے اور اسی چیز کا
فیصلہ فرمائے جو ہمارے حق میں بہتر ہو۔

وقد فتح الله من ابواب الخير والرحمة
والهداية والبركة مالم يكن يخطر بالبال
ولا يدور في الخيال، ونحن في كل وقت
مهمومون بالسفر مستخيرين الله سبحانه
وتعالى فلا يظن الظان انا نؤثر على
قربكم شيئاً من امور الدنيا قط بل
لا نؤثر من امور الدين ما يكون قربكم
ارجح منه ولكن ثم أمور كبار نخاف
الضرر الخاص والعام من اهمالها
والشاهد يرى مالا يرى الغائب
والمطلوب كثرة الدعاء بالخيرة
فان الله يعلم ولا نعلم ويقدر و
لا نقدر وهو علام الغيوب وقال
النبي صلى الله عليه وسلم من سعادة
ابن ادم استخارته الله ورضاه

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے خیر و رحمت اور ہدایت
و برکت کے ایسے ایسے دروازے کھولے ہیں جو پہلے
وہم و گمان میں بھی نہیں تھے، ہم کو ہر وقت سفر کی
فکر ہے اور اللہ سے استخارہ کرتے رہتے ہیں کوئی
یہ خیال نہ کرے کہ ہم آپ کے قرب پر دنیا کی کسی
دولت کو ترجیح دیتے ہیں، بلکہ دین کے امور میں سے
بھی (نوافل وغیرہ کے درجہ کی چیزوں میں سے)
کسی ایسی چیز کو ترجیح دینے کے لئے تیار نہیں
جن کے مقابلہ میں آپ کا قرب اور آپ کی خدمت
دینی اعتبار سے افضل و اعلیٰ ہے، لیکن کچھ
ایسے اہم امور و مسائل درپیش ہیں جن کے چھوڑ
دینے سے ہم کو عمومی اور خصوصی ضرر کا اندیشہ ہے
اور اس کا اندازہ اسی کو ہو سکتا ہے، جو موقع پر
پر موجود ہے شنیدہ کے بود مانند دیدہ، آپ سے
درخواست ہے کہ اس کی دعا کثرت سے کریں کہ

بما يقسم الله له ومن شقاوة ابن
آدم ترك استخارة الله وسخطه بما
يقسم الله له والتاجر يكون مسافرًا
ويخاف ضياع ماله فيحتاج ان يقيم حتى
يستوفيه وما نحن فيه أمر يجل عن
الوصف ولا حول ولا قوة الا بالله
والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته
كثيرًا كثيرًا وعلى سائر من في البيت
في الكبار والصغار والاهل والاصحاب
واحدًا واحدًا والحمد لله رب
العالمين وصلى الله على سيدنا محمد
وآله وصحبه وسلم تسليمًا۔

اللہ تعالےٰ ہمارے لئے ایسی چیز کا فیصلہ فرمائے
جو ہمارے حق میں بہتر ہو (قیام یا سفر) اس لئے
کہ اللہ تعالےٰ جانتا ہے، ہم بے خبر ہیں، اسی کو
صحیح اندازہ ہے، ہم بے اندازہ ہیں، وہ سب چھپی
ڈھکی چیزوں سے واقف ہے، آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کی سعادتمندی
یہ ہے کہ وہ اللہ سے خیر طلب کرتا ہو اور اس کا
فیصلہ اسی پر چھوڑتا ہو اور پھر جو فیصلہ فرمائے
اس پر راضی ہو جاتا ہو اور بدبختی اور شقاوت ہے کہ
وہ استخارہ اور خیر طلبی چھوڑ دے اور اس کے فیصلہ
سے ناراض اور غیر مطمئن ہو، والدہ صاحبہ! آپ
جانتی ہیں کہ تاجر کبھی جب کبھی پردیس میں ہوتا ہے
اور اس کی رقمیں اور مال پھیلا ہوا ہوتا ہے تو
وہ بھی اتنا انتظار کرتا ہے اور مجبورًا قیام اختیار
کرتا ہے کہ وہ اپنی سب رقمیں وصول کرلے اور
اپنا مال سمیٹ لے، اور ہم تو جس بڑے کام اور
جس عظیم مقصد کے لئے ٹھہرے ہوئے ہیں وہ تو چیز ہی
کچھ اور ہے، اس سے تجارت کو کیا نسبت؟ بس
سب سہارا اور آسرا اللہ ہی کا ہے، آپ پر اور گھر کے

سب چھوٹوں بڑوں پر اور سب متعلقین اور گھر والوں

پر بہت بہت سلام ہو، وصلے اللہ علی سیدنا محمد

وآلہ وصحبہ وسلم تسلیماً۔

دوبارہ اسیری

مصر "وحدتِ وجود" کے عقیدہ اور خیال کا مستقل مرکز تھا، مشہور صاحبِ حال شاعر ابن الفارضؒ جنھوں نے ۶۳۲ھ میں وفات پائی اس خیال کے پرجوش داعی معلوم ہوتے ہیں، اور ان کے اشعار میں جا بجا اس کے مضامین ملتے ہیں، ابن تیمیہ اس عقیدہ کی برملا تردید کرتے تھے، اور اپنے درس و مجالس میں ان اقوال و اعمال پر جرح و اعتراض کرتے رہتے تھے، جو ان کی تحقیق کے مطابق کتاب و سنت کے خلاف اور صوفیۂ متاخرین کے اضافات میں سے ہے، وہ اپنی کتابوں میں جا بجا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ عدی بن مسافر اموی جیسے محقق و راسخ صوفیۂ کرام کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں، لیکن اپنے معاصر مشائخ و صوفیہ پر تنقید کرنے سے تامل نہیں کرتے جو ان کے اعتقاد کے مطابق فلسفۂ یونان اور مصری و ہندی اشراق سے متاثر تھے، شیخ کی ان تقریروں اور تنقیدوں سے تصوف کے حلقوں میں برہمی پیدا ہوئی اور مصر کے مشہور شیخ طریقت ابن عطاء اللہ الاسکندری (صاحب الحکم) نے گروہ صوفیہ کی طرف سے حکام کے یہاں ابن تیمیہ کے خلاف نالش کی، صوفیوں کا ایک بڑا گروہ خود قلعہ میں ابن تیمیہ کی شکایت کرنے گیا، سلطان نے ان شکایتوں سے متاثر ہو کر حکم دیا کہ "دار العدل" میں مجلس منعقد ہو، اور اس معاملہ کی تحقیق کی جائے اس مجلس میں ابن تیمیہ نے خود شرکت اور اپنے مقدمہ کی وکالت کی، ان کی مدلل اور پرزور تقریر سے سب لوگ خاموش ہو گئے، اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکی۔

لیکن ان کے خلاف شورش دبی نہیں، اب ان کے خلاف یہ الزام بھی تھا کہ وہ علانیہ اس بات کی

تبلیغ کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی دہائی نہیں دی جاسکتی، اور خود سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے استغاثہ بھی درست نہیں، یہ شکایت جب پیش ہوئی تو بعض علماء نے کہا کہ اس بات میں تو کوئی قباحت نہیں، قاضی القضاۃ نے صرف اتنا کہا کہ اس میں کچھ بے ادبی ضرور ہے، لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ بات حدِ کفر تک پہونچتی ہے، اس لئے یہ شکایت بھی بے نتیجہ رہی۔

مگر اس روز روز کی شکایت اور شورش سے حکومت تنگ آگئی تھی، اس نے شیخ کو تین امور میں سے کسی ایک امر کو اختیار کر لینے کا مشورہ دیا، یا تو اپنے وطن دمشق چلے جائیں، یا اسکندریہ میں قیام اختیار کریں، مگر دونوں جگہ ان کو بعض شرائط کی پابندی کرنی ہوگی[1]، یا جیل جانا منظور کریں، شیخ نے آخری شکل کو ترجیح دی، لیکن ان کے تلامذہ و احباب نے دمشق کے سفر کے لئے اصرار کیا، اور انھوں نے ان کے اصرار سے اس کو منظور کر لیا، اور ۱۸ شوال ۷۰۷ھ کو وہ روانہ بھی ہوگئے، لیکن اسی روز ان کو مصر واپس لایا گیا، اور کہا گیا کہ حکومت کی مصلحت یہی ہے کہ وہ جیل میں رہیں، لیکن قضاۃ و علماء اس مرتبہ متردد تھے، کہ وہ کس الزام کے تحت جیل جائیں، قاضی مالکی شمس الدین التونسی نے صاف کہا کہ ان کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں ہوسکی، نور الدین مالکی کو بھی توقف تھا، اور وہ خاموش تھے، شیخ نے علماء و قضاۃ کی اس ذہنی کشمکش کو دیکھ کر خود فیصلہ کر دیا کہ وہ از خود جیل جانے کے لئے تیار ہیں، نور الدین الزواوی نے کہا کہ وہ ایسی جگہ رکھے جائیں، جو ان کے شایان شان ہو، حکومت کی طرف سے کہا گیا کہ وہ کوئی استثناء اور رعایت کے لئے تیار نہیں "الدولۃ ما ترضی الا الحبس" (حکومت تو ان کو اسی جگہ رکھنا چاہتی ہے جس کا نام جیل خانہ ہے) چنانچہ قضاۃ کے محبس میں ان کو بھیج دیا گیا، اور یہ اجازت دی گئی کہ ان کی خدمت کے لئے کوئی آدمی رہ سکتا ہے[2]۔

اس محبس میں ابن تیمیہ کے مشاغل و معمولات جاری رہے، یہ دراصل ایک نظر بندی کی شکل تھی،

---

[1] غالباً اہم شرط یہ تھی کہ وہ اپنے عقائد اور مخصوص خیالات کی عمومی تبلیغ نہ کریں۔ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن کثیر ج ۱۴ ص ۴۶

طلبہ اور علماء ان سے ملاقات کر سکتے تھے، اور استفادہ اور مذاکرہ کرتے تھے، اہم مسائل میں ان سے فتویٰ بھی لیا جاتا تھا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد مدرسۂ صالحیہ میں فقہاء و قضاۃ کا اجتماع ہوا اور ان کی متفقہ خواہش اور تجویز سے ابن تیمیہ کو رہا کر دیا گیا، لوگوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور پہلے سے زیادہ ان کی طرف رجوع ہوا۔

سیاسی تغیر اور ابن تیمیہ پر سختی

دفعتاً مصر کے سیاسی حالات میں ایسا تغیر ہوا کہ ابن تیمیہؒ کے لئے مشکلات بہت بڑھ گئیں، اور ان کے حریف کو ان کے خلاف آزادی سے ہر قسم کی کارروائی کا موقع مل گیا، اس وقت تک اصل سلطان مصر و شام ناصر بن قلاوؤن تھا، جو ابن تیمیہؒ کے علم و فضل اور خلوص کا معتقد اور ان کا ہمدرد تھا، ابن تیمیہ ہی نے اس کو تاتاریوں کے مقابلہ پر آمادہ کیا تھا، اور اس نے ان کی شجاعت، ایمانی قوت اور استقامت خود دیکھی تھی، ۷۰۸ھ میں سلطان نے بہت سے اسباب کی بنا پر جو اس کی بددلی کا باعث تھے، سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کی، اور کرک میں قیام اور وہاں کی محدود حکومت پر قناعت کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے اس فیصلہ سے رکن الدین بیبرس جاشنگیر کے لئے تختِ مصر خالی ہو گیا، اور اس نے اپنی خود مختار سلطنت کا اعلان کر دیا، اب وہ مصر و شام کا مطلق العنان فرمانروا اور اس کے شیخ نصر المنبجی اس طویل و عریض سلطنت کے روحانی سرپرست اور مشیر خاص تھے، ابن تیمیہؒ اپنے دینی عقائد و تحقیقات کے علاوہ (جو شیخ نصر المنبجی کے رجحانات کے صریحاً مخالف تھے) خود سلطان ناصر بن قلاوؤن کے ہمدرد اور حامی سمجھے جاتے تھے، اس لئے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے دینی اور سیاسی محرک دونوں جمع ہو گئے۔

چنانچہ اس تغیر کے بعد ہی ابن تیمیہ کی اسکندریہ جلاوطنی اور نظربندی کا سرکاری فرمان صادر ہوا،

اور وہ صفر ۷۰۹ھ کی آخری تاریخ کو اسکندریہ بھیج دیئے گئے، کہا جاتا ہے کہ حکومت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس نئے شہر میں جو تصوف اور اہل تصوف کا قدیمی مرکز ہے، ممکن ہے کوئی شخص ان کا کام تمام کر دے اور حکومت بغیر کسی بدنامی اور الزام کے اس دردِ سر سے نجات پائے[1]۔

لیکن اسکندریہ میں شیخ نے بہت جلد معتقدین و تلامذہ کا حلقہ پیدا کر لیا، اور ان کی طرف رجوع عام شروع ہو گیا، وہاں بھی وہ خاموش اور بے کار نہیں بیٹھے، کتاب و سنت کی اشاعت اور شرک و بدعات کی تردید ان کا مشغلہ تھا، لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت اور اعتقاد پیدا ہو گیا، اور بہت جلد انھوں نے مقبولیت عام حاصل کر لی، ان کے بھائی شرف الدین ابن تیمیہ جو وہاں ان کے رفیق اور شریک زنداں تھے، اہلِ دمشق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

وانقلب اهل الثغر اجمعين الى الاخ مقبلين	اہلِ اسکندریہ کو برادر محترم کی طرف بڑی توجہ ہو گئی
عليه مكرمين له، وفى كل وقت ينشر من	اور ان کے دل میں ان کی بڑی عزت ہے، وہ ہر وقت کتاب
كتاب الله وسنة رسوله ما تقربه عين	و سنت کی اشاعت کرتے رہتے ہیں جس سے اہل ایمان کی
المومنين وذلك شجى فى حلوق الاعداء......	آنکھیں ٹھنڈی اور دشمنوں کو کوفت ہوتی ہے......
واستقر عند عامة المومنين و خواصهم	شیخ کی محبت اور عظمت عام و خاص مومنین کے دل
من امير و قاض و فقيه، و مفت، و شيخ و	میں بیٹھ گئی ہے کیا حاکم، کیا قاضی، کیا فقیہ، کیا مفتی،
جماعة المجتهدين الا من شذ من	کیا مشائخ اور جماعت مجتہدین سوائے بے خبر
الاغمار الجهال مع الذلة والصغار محبة	جاہلوں کے سب ان کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو گئے
الشيخ وتعظيمه وقبول كلامه والرجوع	ہیں، ان کا کلام پسند کرتے ہیں اور ان کے احکام کی
الى امره ونهيه[2]۔	تعمیل کرتے ہیں۔

---

[1] ابن کثیر ج ۱۴ ص ۴۹ [2] ایضاً ص ۵۰

اسکندریہ میں اس وقت فرقۂ سبعینیہ کے خیالات اور وحدت وجود کے مسلک کا بڑا غلبہ تھا، اور بعض اشخاص اس کے پُرجوش داعی اور مبلغ تھے، خواص سے نکل کر عوام میں بھی یہ عقائد وافکار مقبول ہو رہے تھے، ان دقیق مسائل ومتشابہات کا عوام کے اعمال واخلاق پر جو خراب اثر پڑسکتا ہے اور ان میں شریعت کے معاملہ میں جو بیباکی، اور آزادی پیدا ہونی چاہئے، وہ پیدا ہو رہی تھی، ابن تیمیہؒ نے بڑی قوت اور جوش کے ساتھ اس کی تردید اور مخالفت کی، اور ان کے قیام کے زمانہ ہی میں جس کی مدت آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں، ان کا زور ٹوٹ گیا، اور عوام وخواص ان سے منحرف ہو گئے، ابن تیمیہؒ نے ان میں سے بہت سے آدمیوں سے توبہ کرائی، اور ان کے ایک بڑے داعی اور اس خیال کے علمبردار نے بھی توبہ کی۔[1]

اسکندریہ میں ابن تیمیہؒ کی قیامگاہ بڑی وسیع وخوش منظر تھی، اس کی ایک کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی، ایک کھڑکی شہر کی طرف، لوگ آزادانہ ان کے پاس آتے جاتے تھے، اور استفادہ ومذاکرہ کرتے تھے۔

رکن الدین جاشنگیر کا زوال

ابن تیمیہؒ جاشنگیر اور اس کے شیخ کے زوال کی علانیہ پیش گوئی کرتے رہتے تھے، اور فرماتے تھے، "زالت ایامہ وانتہت ریاستہ وقرب انقضاء اجلہ"[2] ابھی اس کی سلطنت کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ سلطان ناصر بن قلاؤوں نے زمام سلطنت ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا، اور ۱۳ رشعبان ۷۰۹ھ کو اس نے دمشق کا رخ کیا، اہل شام نے جن کو اس سے بہت گہرا تعلق خاطر تھا، پرجوش استقبال کیا، ۱۷ رشعبان کو وہ بڑے تزک واحتشام کے ساتھ دمشق میں داخل ہوا، دمشق سے اس نے مصر کا رخ کیا، اہل مصر نے بھی اس کے استقبال کی تیاری کی، رکن الدین جاشنگیر نے حالات دگرگوں ہوتے دیکھے تو خود سلطنت سے استعفاء دے دیا، عید کے روز سلطان کی سواری مصر میں داخل ہوئی اور اس نے ۱۱ مہینے کچھ دن کی

[1] مکتوب شیخ شرف الدین ابن تیمیہؒ بنام اہل دمشق، ابن کثیر ج ۱۴ ص ۵۰ [2] ایضاً ص ۴۹

بے تعلقی کے بعد عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی، جاشنگیر نے مصر سے فرار اختیار کیا، ۷ ر ذی القعدہ کو امیر سیف الدین نائب شام کے ہاتھ آگیا اور مصر میں قتل کر دیا گیا۔

مورخین کا اتفاق ہے کہ جاشنگیر اپنی مدار المہامی کے زمانہ میں بڑا مقبول اور باوقار و باہیبت وزیر سلطنت تھا، اس کی خود مختار سلطنت اور اس کا ادبار ساتھ ہی ساتھ شروع ہوا، اپنی سلطنت کا اعلان کرنے کے بعد ہی سے اس کا سارا کر و فر اور اقبال مندی اور مقبولیت ختم ہو گئی، اور اس کے زوال کے دن شروع ہو گئے، اور بنتے ہوئے کام بگڑتے چلے گئے، مورخ مصر مقریزی نے صاف صاف لکھا ہے۔

وکان رحمہ اللہ خیّراً عفیفاً کثیر الحیاء	مرحوم صاحب خیر، محتاط، باحیاء، باوقار اور
وافر الحرمۃ جلیل القدر مهاب السطوۃ	صاحبِ شوکت امیر تھا، لیکن جب سے اس نے سلطان کا
فی ایام امارتہٖ فلما تلقب بالسلطنۃ	لقب اختیار کیا اور بادشاہی کا خلعت پہنا اس کی
ورسم باسم الملک اتضع قدرہٗ و	شان میں کمی آگئی، اس کو کمزور سمجھا جانے لگا، لوگوں کو
استضعف جانبہ وطمع فیہ وتغلب	اس کے خلاف جرأت پیدا ہوئی، امراء اور
علیہ الامراء والممالیک ولم تنجح مقاصدہٗ	غلاموں نے خودسری اختیار کی، وہ اپنے مقاصد میں
ولا سعد فی شئ من تدبیرہٖ الی ان	ناکام رہا، اور اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی یہاں تک کہ
انقضت ایامہ واناخ بہ حمامہٗ۔[1]	اس کا دور ختم ہوا، اور اس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔

کیا عجب ہے کہ اس کا یہ غیر متوقع زوال ایک مخلص داعی حق کی مخالفت و ایذا کا نتیجہ اور اس مشہور شعر کی تفسیر ہو ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

[1] خطط مصر جلد ۲ ص ۴۱۸

ابن تیمیہ کی رہائی اور شاہانہ عزت افزائی

ابن تیمیہ کے معاصر شیخ علم الدین البرزالی کا بیان ہے کہ سلطان جب عید کے دن مصر میں داخل ہوا ہے تو اس کو سب سے زیادہ عجلت اور فکر اس کی تھی کہ ابن تیمیہ کو رہا کرکے عزت و حرمت کے ساتھ مصر لایا جائے، چنانچہ اگلے ہی روز (۲ شوال ۷۰۹ھ کو) اسکندریہ ان کی طلبی کا پروانہ پہنچا، اور وہ ۸ شوال کو مصر کے لئے روانہ ہو گئے، ایک جم غفیر نے ان کو بڑے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔

ابن تیمیہ دربار شاہی میں پہنچے تو سلطان نے خود چند قدم بڑھ کر ان کا استقبال کیا سلطان کے ساتھ مصر و شام کے قضاۃ اور اکابر علماء بھی تھے، قاضی جمال الدین ابن القلانسی جو قاضی لشکر تھے، اور خود اس مجلس میں اس وقت موجود تھے، ابن تیمیہ کی آمد اور سلطان کے استقبال کا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

"جس وقت سلطان کو اطلاع ملی کہ ابن تیمیہ پہونچ گئے ہیں، وہ سرو قد کھڑا ہو گیا، اور ایوان سلطنت کے کنارہ تک چل کر آیا، وہاں دونوں کی ملاقات اور معانقہ ہوا، سلطان ابن تیمیہ کو لئے ہوئے قصر شاہی کی اس منزل کی طرف آیا، جس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے، وہاں دونوں تنہا ایک گھڑی بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر دونوں دربار کی طرف اس ہیئت سے آئے کہ شیخ کا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ میں تھا، سلطان بیٹھ گیا، اس کے دائیں جانب ابن جماعۃ قاضی مصر، بائیں طرف ابن الخلیلی وزیر سلطنت تھے، ابن تیمیہ سلطان کے سامنے اس کی مسند کے پاس بیٹھے تھے، وزیر نے اس وقت یہ درخواست پیش کی کہ اہل ذمّہ (غیر مسلم رعایا) کو سفید عماموں کے استعمال کی اجازت حسب دستور سابق دے دی جائے[1]، انھوں نے خزانہ شاہی کو سات لاکھ

---

[1] پچھلے تلخ تجربوں نے علمائے اسلام کو اس نتیجہ پر پہنچا دیا تھا کہ اسلامی سلطنت کی غیر مسلم رعایا کے لباس میں (باقی ص۱۰۳ پر)

سالانہ کی پیشکش کی ہے، یہ موجودہ ٹیکس کے علاوہ ہوگا، اس وقت اہلِ مجلس پر سکوت طاری تھا، قضاۃ واکابر علماء سب خاموش تھے، اس میں علامہ ابن الزملکانی بھی تھے، سلطان نے قضاۃ وعلماء کی طرف خطاب کرکے فرمایا کہ آپ اس بارہ میں کیا کہتے ہیں؟ اس پر بھی کسی نے کچھ نہیں کہا، اس موقع پر ابن تیمیہ اپنے گھٹنوں کے بل پر بیٹھ گئے اور بڑے جوش وغصہ کے ساتھ گفتگو کرنی شروع کی، اور وزیر پر سختی سے جرح کی، ان کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی، اور سلطان ان کو نرم کرنے کی کوشش کررہا تھا، اس وقت ابن تیمیہ نے اس طرح گفتگو کی کہ دوسرا شخص اس کی جرأت نہیں کرسکتا تھا، انھوں نے سلطان کو مخاطب کرکے کہا کہ "بڑے افسوس کی بات ہوگی کہ آپ کے اس پہلے دربار کا افتتاح اس کارروائی سے ہو کہ آپ فانی دنیا کی حقیر منفعت کے لئے اہلِ ذمّہ کی مدد کریں، اللہ نے آپ پر کتنا بڑا احسان کیا کہ آپ کی کھوئی ہوئی سلطنت ملادی، آپ کے دشمن کو ذلیل وخوار کیا، اور حریفوں پر آپ کو فتح دی، سلطان نے یہ سن کر کہا کہ یہ قانون تو جاشنگیر کا بنایا ہوا ہے، ابن تیمیہ نے جواب دیا کہ یہ تو آپ ہی کے فرمان سے ہوا، جاشنگیر تو اس وقت آپ کا نائب تھا، سلطان کو ابن تیمیہ کی یہ حق گوئی

(باقی صـ۱۰۲ کا) کچھ امتیازی نشان ضروری ہے، صلیبی جنگوں کے بعد مصر وشام میں بکثرت ایسے عیسائی رہ گئے تھے، جو دوسرے ملکوں سے آئے تھے، اور بیرونی حملہ آوروں کے لئے رضاکارانہ طریقہ پر جاسوسی کی خدمات انجام دیتے تھے، یوں بھی مسلمان سوسائٹی میں گھس مل کر اپنے اثرات پھیلاتے تھے، ۷۲۱ھ کے واقعات میں ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ۶ جمادی الاولیٰ کو قاہرہ میں بڑے ہولناک طریقہ پر آگ لگی، خوبصورت مکانات، عالیشان محل اور بعض مسجدیں بھی اس کی زد میں آگئیں، لوگوں پر اس حادثہ کا اتنا اثر تھا کہ مسجدوں میں قنوت نازلہ پڑھی گئی، بعد میں تحقیق ہوئی کہ یہ بعض عیسائیوں کی شرارت تھی، اس وقت سے یہ حکم صادر ہوا کہ عیسائی نیلا لباس پہنیں عماموں میں گھنٹیاں رکھیں اور کہیں ان سے کام نہ لیا جائے، اس پر آتش زنی کے واقعات کا سلسلہ ختم ہوا، ان تجربات کی بنا پر کچھ عرصہ سے مصر میں عیسائیوں کو حکم تھا کہ وہ زرد رنگ کے عمامے باندھیں سلطان ناصر کی دوبارہ آمد پر عیسائیوں نے کوشش کی تھی کہ یہ قانون منسوخ ہوجائے۔

پسند آئی، اور یہ قانون بدستور رہا۔[1]

مصر میں سنّتِ یوسفی

ابن القلانسی کا بیان ہے کہ ابن تیمیہ نے خود مجھ سے کہا کہ سلطان جب مجھے تنہائی میں لے گیا تو اس نے مجھ سے ان قضاۃ کے قتل کے بارہ میں فتویٰ لینا چاہا جنھوں نے جاشنگیر کی حمایت کی تھی، اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا، اور وہ فتوے نکال کر دکھائے بھی، اس کے ساتھ مجھ سے یہ بھی کہا کہ انہی لوگوں نے آپ کے خلاف شورش برپا کی، اور آپ کو تکلیف پہنچائی، اس کا مقصد یہ تھا کہ میں اس سے متأثر ہو کر ان کے قتل کا فتویٰ دے دوں، میں اس کا منشاء سمجھ گیا، اور میں نے ان قضاۃ وعلماء کی مدح سرائی شروع کی، اور اس کی شدت سے مخالفت کی کہ سلطان کے ہاتھ سے ان کو کوئی گزند پہنچے، میں نے اس سے کہا کہ اگر آپ نے ان کو قتل کر دیا تو آپ کو ان کا بدل نہیں ملے گا، اس نے پھر (مجھے مشتعل کرنے کے لئے) کہا کہ انھوں نے تم کو نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کی اور بارہا تمہارے قتل کی سازشیں کیں، میں نے کہا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، جس نے مجھے تکلیف پہنچائی، اس پر میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں، میں اسے بالکل معاف کرتا ہوں، اور جس نے اللہ اور رسولؐ کا قصور کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے خود انتقام لے گا، میں اپنے نفس کا انتقام نہیں لیتا" میں برابر اس کو سمجھاتا رہا، یہاں تک کہ سلطان نے ان کا قصور معاف کر دیا۔[2]

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ مصر میں ابن تیمیہ کے سب سے بڑے حریف و مدمقابل قاضی مالکیہ ابن مخلوف کہتے تھے کہ ہم نے ابن تیمیہ جیسا عالی ظرف و فراخ حوصلہ نہیں دیکھا کہ ہم نے تو ان کے خلاف سلطنت کو آمادہ کیا (اگرچہ ہمارا مقصد پورا نہیں ہوا) لیکن ان کو جب قدرت حاصل ہوئی تو ہم کو

---

[1] ابن کثیر جلد ۱۴ صفحہ ۵۴ [2] ایضاً

صاف معاف کر دیا، اور الٹے ہماری طرف سے وکالت اور مدافعت کی۔[1]

مجلس سلطانی کے بعد شیخ قاہرہ میں آگئے، اور حسب معمول درس و تدریس اور اصلاح و تبلیغ کے کام میں منہمک ہوگئے، ان کی رہائی کا شہرہ سن کر شائقین علم اور ان کے محبّین و معتقدین چاروں طرف سے امنڈ آئے، علمائے شہر نے حاضر ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا، اور معذرت کی، انھوں نے سب سے کہہ دیا کہ میری طرف سے سب کو معافی ہے، میرا کسی پر کوئی مطالبہ نہیں، اس طرف سے اطمینان پا کر اور یہ اندازہ کر کے کہ ان کو ابھی اپنے کام کی تکمیل کے لئے دار السلطنت میں رہنا ہے، انھوں نے گھر ایک مفصل خط لکھا جس میں حالات کی اطلاع تھی، اور کچھ ضروری کتابیں طلب کی تھیں۔

ابن تیمیہ کی باعزت رہائی کے بعد جب ان کے مخالفین نے دیکھا کہ ان کے اقبال کا ستارہ اور بلند ہو گیا اور کسی علمی مسئلہ کی بنا پر اب ان کے خلاف شورش برپا کرنی مشکل ہے تو انھوں نے عوام کو ان کے خلاف اشتعال دلایا اور عوام کو ابن تیمیہ کے خلاف (کم سے کم مصر میں جہاں عوام ان سے زیادہ واقف نہ تھے) اشتعال دلانا کچھ مشکل کام نہ تھا، چنانچہ ۴ رجب ۷۱۱ھ کو چند ناخدا ترس انسانوں نے ان پر دست درازی کی، اور ان کو ایذا پہنچائی، لیکن محلہ حسینیہ (جہاں عام شہرت کے مطابق سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک دفن ہے[2]) کے باشندے شیخ کا انتقام لینے کے لئے جمع ہو گئے، شیخ نے ان کو منع کر دیا، اور ان سے فرمایا۔

اما ان یکون الحق لی او لکم او للہ، فان	تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو (ان سے انتقام
کان الحق لی فھم فی حلّ منہ وان کان	لینا) میرا حق ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ
لکم فان لم تسمعوا منّی ولم تستفتونی	سبکدوش ہیں، اور میرا کوئی مطالبہ نہیں، یا تمہارا
فافعلوا ما شئتم وان کان الحق للہ	حق ہے تو اگر تم میری بات سننے کے لئے تیار نہیں

[1] ابن کثیر جلد ۱۴ صفحہ ۵۴ [2] اس کی تردید میں امام ابن تیمیہ کا مستقل رسالہ "رأس سیدنا الحسین" چھپ چکا ہے۔

فالله یاخذ حقه ان شاء۔ اور مجھ سے دریافت بھی نہیں کرتے تو جو جی میں آئے کرو،

تیسری اور آخری شکل یہ ہے کہ یہ اللہ کا حق ہے تو اللہ

اگر چاہے گا اپنا حق لے لے گا۔

اسی ردّ و کد میں نماز عصر کا وقت آگیا، امام جامع مسجد (غالباً جامع حسینی) جماعت کی شرکت کے لئے جانے لگے، ہمدردوں نے اس سے روکا، لیکن شیخ نے کوئی پروا نہیں کی، اور چلے گئے ان کے ساتھ ان کے حامیوں کا ایک بڑا گروہ بھی گیا۔

اس کے بعد ایک مرتبہ ایک عالم نے برسر مجلس ان کو بہت سخت سست کہا، اس کے بعد ان کو اپنی غلطی محسوس ہوئی، یا اندیشہ ہوا کہ حکومت کچھ دار و گیر کرے تو شیخ سے معذرت کی شیخ نے کھلے دل سے معاف کر دیا، اور فرمایا "لا انتصر لنفسی" میں اپنا انتقام نہیں لیتا۔[1]

ابن تیمیہ نے مصر کے قیام میں صرف درس و تدریس اور کتاب و سنت کی اشاعت پر اکتفا نہیں کی، بلکہ دار السلطنت کے قیام سے فائدہ اٹھا کر سلطان کو بعض نہایت مفید مشورے دیئے، اور اس سے بعض ضروری اور مفید فرمان جاری کروائے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ۷۱۲ھ میں دمشق فرمان سلطانی پہنچا کہ کسی کو کوئی عہدہ کسی مالی پیشکش یا رشوت کی بنا پر نہ دیا جائے اس لئے کہ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ نااہل اور خائن لوگ عہدوں پر سرفراز ہو جائیں گے، اور اہل اور امانت دار محروم رہیں گے، ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ فرمان ابن تیمیہ کی تجویز اور کوشش کا نتیجہ تھا[2] اسی طرح ایک دوسرا فرمان صادر ہوا کہ قاتل پر کسی کو دست درازی کرنے کا اختیار نہیں حکومت اس کو گرفتار کرے گی اور شرع شریف کے مطابق اس کا قصاص ہوگا، ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ بھی ابن تیمیہ کی تجویز سے ہوا۔[3]

---

[1] ابن تیمیہ محمد ابو زہرہ۔ [2] ابن کثیر جلد ۱۴ صـ ٦٦ [3] ایضاً۔

دمشق واپسی

شوال ۷۱۲ھ میں تاتاریوں کے حملہ کے ارادہ کی مسلسل اطلاعیں مل رہی تھیں بالآخر سلطان نے خود مصر سے نکل کر ان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ۸ شوال کو دمشق کا رخ کیا ۲۳ شوال کو وہ دمشق میں داخل ہوا، سلطان کی معیت میں ابن تیمیہ بھی تھے، جو پورے سات سال کے بعد اپنے وطن مالوف آرہے تھے، لوگوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا، اہلِ شہر نے بڑی مسرّت کا اظہار کیا، مردوں کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں عورتیں بھی ان کو دیکھنے کے لئے باہر تک آئیں، شیخ کا یہ سفر بہ نیت جہاد تھا، لیکن دمشق آکر معلوم ہوا کہ تاتاری واپس گئے، شیخ نے دمشق سے بیت المقدس کی زیارت کی نیت کر لی، کچھ روز وہاں قیام کر کے بعض دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے یکم ذی القعدہ کو دمشق واپس آئے اور ہمہ تن اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

مسائلِ فقہیہ کی طرف توجہ خصوصی

اس مرتبہ دمشق واپسی کے بعد اگرچہ شیخ الاسلام اپنے قدیم دینی و علمی واصلاحی مشاغل میں مشغول ہو گئے اور حسب معمول درس و افتاء اور تصنیف کا کام شروع کر دیا، لیکن اس مرتبہ ایک خاص بات یہ تھی کہ ابھی تک ان کی زیادہ تر توجہ عقائد و اصول اور ان کلامی مسائل کی طرف تھی، جو اشاعرہ و حنابلہ کے درمیان مابہ النزاع تھے، لیکن اس مرتبہ ان کی توجہ خصوصیت کے ساتھ فقہی مسائل اور جزئیات کی طرف منعطف ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ پہلے موضوع پر بقدر ضرورت مواد و دلائل فراہم کر چکے ہیں، اور ان کی تقریروں، درس اور تصنیفات سے حق واضح ہو چکا ہے، اب انھوں نے اپنی علمی خصوصیتوں اور خداداد ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ فقہی مسائل کی طرف توجہ کی۔

ابن تیمیہ کا خاندان پشتوں سے حنبلی چلا آرہا تھا، خود ان کے اکثر فتاویٰ مذہب حنبلی کے

مطابق ہیں[1] لیکن انھوں نے سرتاسر مذہب حنبلی کی پابندی نہیں کی، کتاب و سنت کے ذخیرہ پر ان کی جیسی وسیع نظر تھی، مذاہب فقہیہ، ان کے اصول اور دلائل کا جیسا استحضار ان کو حاصل تھا، اس کے بعد ان کے لئے مشکل تھا کہ وہ مذہب حنبلی کے دائرہ میں محدود رہیں، اور سو فی صدی اس کی پابندی کریں، اس لئے وہ بعض اوقات ائمہ اربعہ کے مذاہب میں اس مذہب کو ترجیح دیتے جس کے دلائل ان کے نزدیک زیادہ قوی تھے، اور جس کے ساتھ صحابہ و تابعین کی زیادہ جماعت ہوتی، وہ اپنے علمی تبحر، قوت استنباط اور استقلال فکر کے باوجود ائمۂ اربعہ کی علمی عظمت حسن اجتہاد، دیانت و تقویٰ اور عقلی تفوق کے بڑے قائل اور معترف تھے، ان کے نزدیک وہ حضرات طالب حق، متبع سنت اور راسخ فی العلم تھے، ان کے اجتہادات کا ماخذ کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کے نصوص اور اجماع اور شرعی قیاس ہے، اور وہ اس بارہ میں متبع تھے، مبتدع نہ تھے، اس لئے وہ اپنے زمانہ کے ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، جو ان کے بارہ میں بیباکانہ الفاظ بولتے اور ان پر زبان طعن دراز کرتے، انہی لوگوں کی زبان بندی اور ائمۂ مجتہدین کی حمایت و نصرت کے لئے انھوں نے ایک مستقل رسالہ "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" تصنیف کیا، جو اس موضوع کی بہترین تصنیفات میں سے ہے، اس رسالہ کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

یجب علی المسلمین بعد موالاۃ اللہ ورسولہ	مسلمانوں پر اللہ اور اس کے رسول کی دوستی اور محبت کے
موالاۃ المومنین کما نطق بہ القرآن خصوصا	بعد اہل ایمان کی دوستی اور محبت واجب ہے جیسا کہ
العلماء الذین ہم ورثۃ الانبیاء الذین	قرآن مجید میں صاف صاف موجود ہے، خصوصاً ان علماء کی
جعلہم اللہ بمنزلۃ النجوم یہتدی	دوستی اور محبت جو وارث انبیاء تھے، اور جن کو اللہ تعالیٰ
بہم فی ظلمات البر والبحر، وقد اجمع	نے ان ستاروں کا مرتبہ عطا فرمایا جن سے تاریکیوں
المسلمون علی ہدایتہم ودرایتہم	میں روشنی اور رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، تمام مسلمانوں کا

[1] ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵۔

اذ كل امة قبل مبعث محمد (صلى الله
عليه وسلم) علمائها شرارها الا المسلمين
فان علمائهم خيارهم فانهم خلفاء
الرسول فى امته والمحيون لما مات من سنته
بهم قام الكتاب وبه قاموا، وبهم نطق
الكتاب وبه نطقوا وليعلم انه ليس احد
من الائمة المقبولين عند الامة قبولا
عامًا يتعمد مخالفة رسول الله صلى الله
عليه وسلم فى شئ من سنة دقيق ولا جليل
فانهم متفقون اتفاقا يقينيا على وجوب
اتباع الرسول وعلى ان كل احد من الناس
يؤخذ من قوله ويترك الا رسول الله صلى الله
عليه وسلم واذا وجد لواحد منهم قول
قد جاء حديث صحيح بخلافه فلا بد له
من عذر فى تركه، وجميع الاعذار ثلاثة
اصناف (احدها) عدم اعتقاده
ان النبى (صلى الله عليه وسلم) قاله
(والثانى) عدم اعتقاده ارادة تلك
المسئلة بذلك القول (الثالث) اعتقاده

اس پر اتفاق ہے کہ یہ حضرات صاحبِ ہدایت اور
صاحبِ درایت تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی
بعثت سے قبل دوسری امتوں کے علماء شرار امت
تھے لیکن اس امت کے علماء خیار امت ہیں اس لئے کہ
وہ اس امت میں رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے
جانشین ہیں وہ سنتوں کے زندہ کرنے والے ہیں، ان سے
کتاب اللہ کی رونق اور رواج ہے اور وہ اس کے
علمبردار ہیں، وہ کتاب اللہ کے ترجمان اور شارح اور
کتاب اللہ ہی ان کی ورد زبان اور دلیل و برہان
ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ ان ائمہ میں سے جو عام طور پر
مسلمانوں میں مقبول و معتمد ہیں کوئی بھی ایسا نہیں
تھا، جو جان بوجھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کسی
چھوٹی یا بڑی سنت کی مخالفت کرتا ہو، اس لئے کہ
وہ سب یقینی طور پر اس پر متفق تھے کہ آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع واجب ہے اور آپ ہی کی
تنہا وہ ذات ہے جس کے سب اقوال واحکام واجب
القبول ہیں (ورنہ دوسرے کا کوئی قول قبول کیا جاسکتا
ہے اور کوئی ترک بھی کیا جاسکتا ہے) ان ائمہ میں سے
اگر کسی کا کوئی ایسا قول پایا جائے جو کسی صحیح حدیث

ان ذلك الحكم منسوخ۔[1]

کے خلاف ہو تو ضرور اس امام کا کوئی عذر ہوگا، اس کے ترک کرنے میں یہ عذر عموماً تین قسموں سے خارج نہیں (اولاً) وہ امام اس کا قائل ہی نہ ہو کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا فرمایا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے (ثانیاً) اس کا خیال ہو کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ نکلتا ہی نہیں اور یہ حدیث کی مراد ہی نہیں ہے (ثالثاً) اس کی تحقیق یہ ہو کہ یہ حکم منسوخ ہے۔

تین طلاقوں کا مسئلہ

باایں ہمہ جس طرح انھوں نے مذہبِ حنبلی کے دائرہ سے بعض اوقات باہر قدم نکالا ہے اور دلائل کی بنا پر دوسرے مذاہب کو ترجیح دی ہے اسی طرح بعض مسائل میں شاذ و نادر انھوں نے کل مذاہبِ اربعہ کے خلاف بھی فتویٰ دیا ہے اور اپنے نزدیک براہِ راست کتاب و سنت کے نصوص اور دلائل کی پیروی کی ہے، یہ مسائل (جن میں انھوں نے مجموعی طور پر ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا ہے) دو چار سے زیادہ نہیں، ان میں سب سے مشہور مسئلہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں (خواہ بیک لفظ خواہ بالفاظ متعددہ) دے دیں تو اگرچہ اس نے باتفاق ائمہ و جمہور امت بدعت کی بات اور خلافِ شرع کام کیا، اور گنہگار ہوا لیکن ان طلاقوں کا حکم کیا ہے؟ کیا وہ واقع ہو گئیں، اور عورت باین ہو گئی اور اب رجعت کرنا شرعاً ممکن نہیں ہے (جب تک کہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کی

---

[1] رفع الملام عن الائمۃ الاعلام۔

صحبت سے متمتع ہو، پھر طلاق دے، پھر پہلا مرد نکاح کرے) یا تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوگی، اور رجعت ممکن ہے، ائمۂ اربعہ اور ائمۂ فقہ و حدیث (اوزاعی، نخعی، ثوری، اسحٰق ابن راہویہ، ابو ثور، بخاری) اور جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک یہ ہے کہ باوجود بدعت و معصیت کے ارتکاب کے یہ تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی، اور رجعت ممکن نہیں ہے، امام نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں "وقد اختلف العلماء فی من قال لامرأته انت طالق ثلاثا فقال الشافعی ومالك وابو حنيفة واحمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلاث" علامہ ابن رشد "بدایۃ المجتہد" میں لکھتے ہیں "جمهور فقهاء الامصار على ان الطلاق بلفظ الثلاث حكمه حكم الطلقة الثالثة" شیخ الاسلام کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم "زاد المعاد" میں فرماتے ہیں "وهذا قول الائمة الاربعة وجمهور التابعين وكثير من الصحابة"

ان حضرات کے دلائل میں متعدد مرفوع حدیثیں منقول ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاقوں کو یا تین سے زائد طلاقوں کو تین طلاقیں قرار دیا اور عورت کو بائن ہو جانے کا فتویٰ دیا۔[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے بعض رفقاء و تلامذہ کا مسلک یہ تھا کہ یہ تین طلاقیں ایک ورجعی شمار ہوگی، اور مرد اس کے بعد اسی طرح رجوع کر سکتا ہے، جیسے ایک طلاق کے بعد کر سکتا تھا، وہ لکھتے ہیں، "وهذا القول منقول عن طائفة من السلف من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم مثل الزبير بن عوام، وعبد الرحمن بن عوف، ويروى عن علی، وعن ابن مسعود، وابن عباس وهو قول داؤد واكثر اصحابه ويروى عن ابى جعفر محمد (الباقر) ابن علی بن حسين وابنه جعفر (الصادق) ولهذا ذهب الى ذلك من ذهب من الشيعة"[2]

---

[1] ان حدیثوں کے متن و اسناد میں فریق ثانی نے کلام کیا ہے اور فریق اول نے محدثانہ طریق پر اس کا جواب دیا ہے [2] فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۳ ص ۳۵

شیخ الاسلام اپنے اس مسلک کے ثبوت کے لئے قرآن وحدیث اور قیاس سے استدلال کرتے ہیں[1]۔

اس مسئلہ میں واقعہ یہ ہے کہ خواہ وہ منفرد نہ ہوں اور ان سے پہلے سلف میں کسی کا یہ مسلک رہا بھی ہو، تو بھی اس میں شک نہیں کہ اس کی شہرت انہی کی ذات سے ہوئی، اور انھوں نے اس کی علمبرداری کی، اسی وجہ سے جب انھوں نے اس مسئلہ میں اپنی تحقیق اور رائے کا اظہار کیا تو اس سے عام طور پر فقہی حلقوں میں ایک استعجاب اور انتشار پیدا ہوا۔

حلف بالطلاق کا مسئلہ اور نظربندی

لیکن بہرحال تین مجموعی طلاقوں کا مسئلہ ایک خالص فقہی اور خانگی مسئلہ تھا جس کا اثر ایک خاندان کی زندگی پر پڑتا تھا، مگر دوسرا مسئلہ جس میں انھوں نے مذاہبِ اربعہ اور مشہور مسلک سے اختلاف کیا، اور جو معاملات اور سیاست اور رعیت و حکومت کے تعلقات تک پر اثرانداز ہوتا تھا، وہ حلف بالطلاق کا مسئلہ تھا۔

اس زمانہ میں حلف بالطلاق کا عام رواج ہو گیا تھا، لوگ کسی بات پر زور دینے کے لئے یا اپنی صداقت یا عزم ظاہر کرنے کے لئے بے تکلف طلاق کا سہارا لیتے تھے، اور اس کو درمیان میں لے آتے تھے، مثلاً میں ضرور ایسا کروں گا نہیں تو طلاق ہے (علیّ الطلاق لأفعلن کذا) میں یہ ہرگز نہیں کروں گا، نہیں تو طلاق (علیّ الطلاق لأمتنعن عن کذا) یا تمہیں ایسا کرنا ہوگا، نہیں تو طلاق ہے (علیّ الطلاق لتفعلن کذا) یا میں نے یہ چیز اتنے دام میں خریدی ہے، اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو طلاق (علیّ الطلاق اشتریتها بکذا) ابن تیمیہ دیکھتے تھے، کہ یہ دراصل قسم اور تاکید کا ایک طریقہ ہے، لیکن لوگ زور دینے اور یقین پیدا کرنے کے لئے طلاق کا لفظ بیچ میں لے آتے ہیں، اور ان کا ارادہ کبھی طلاق کا نہیں ہوتا،

---

[1] مفصل بحث اور تفصیلی استدلال کے لئے ملاحظہ ہو، حافظ ابن قیم کی کتاب "زاد المعاد" بحث "فی من طلق ثلاثاً بکلمۃ واحدۃ" ج ۴ اور "اغاثۃ اللھفان"۔

اس لئے یہ دراصل قسم ہی کی ایک قسم ہے، مگر طلاق معلق سمجھ لئے جانے کی وجہ سے اس پر طلاق کے احکام جاری کئے جاتے ہیں، اور سیکڑوں خاندان اور گھرانے اس کی وجہ سے اُجڑ جاتے ہیں، اور خانگی زندگی میں سخت انتشار اور ابتری پیدا ہو رہی ہے۔

پھر حجّاج بن یوسف کے زمانہ سے بیعت کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لئے بیعت کے صیغہ میں بھی طلاق کے الفاظ داخل کر دیئے گئے ہیں، اور یہ لفظ جزو بیعت بن گئے ہیں کہ "اگر میں نے فلاں کی بیعت توڑی تو میری بیویوں کو طلاق"۔

ابن تیمیہ نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد فتویٰ دینا شروع کر دیا کہ یہ محض ایک حلف کی صورت ہے اور اس کے خلاف کرنے کی حالت میں یا بیان کے خلاف واقعہ ہونے کی صورت میں قسم کھانے والا حانث ہوگا، اور اس پر قسم کا کفّارہ لازم آئے گا، طلاق واقع نہیں ہوگی۔

اگرچہ ابن تیمیہؒ نے اپنے اس فتوی کی تائید میں مذاہب اربعہ میں سے بعض ائمہ اور ان کے بعض اصحاب کے اقوال بھی پیش کئے ہیں[1]، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ فتویٰ ان مذاہب کے مشہور اور مفتیٰ بہ قول کے خلاف تھا، اور ایک نئی تحقیق اور ان کا اجتہاد معلوم ہوتا تھا، اس لئے اس فتویٰ سے عام طور پر ایک اضطراب پیدا ہوا، اور علماء و قضاۃ نے اس کی ضرورت سمجھی کہ ان کو اس فتویٰ سے باز رہنے کا مشورہ دیا جائے، تاکہ زیادہ اضطراب اور انتشار نہ پیدا ہو، حافظ ابن کثیر ۷۱۸ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

"پنجشنبہ ۱۵ ربیع الاول کو قاضی القضاۃ شمس الدین بن مسلم نے امام ابن تیمیہ سے ملاقات کی اور ان کو مشورہ دیا کہ حلف بالطلاق کے مسئلہ میں وہ آئندہ فتویٰ نہ دیں، شیخ نے ان کا مشورہ قبول کیا، اور ان کی خاطر اور اہل افتاء کی رعایت سے اس کا وعدہ کیا، جمادی الاولیٰ کے شروع میں مصر سے

---

[1] اس مسئلہ کی صحیح صورت اور فریقین کے دلائل سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو شیخ محمد ابو زہرہ مصری کی کتاب "ابن تیمیہ" میں بحث "الحلف بالطلاق" ص ۴۲۷، ۴۳۶

فرمان سلطانی بھی آیا جس میں ابن تیمیہ کو حلف بالطلاق کے مسئلہ میں فتویٰ دینے سے روکا گیا تھا، ایک مجلس عام میں یہ فرمان پڑھا گیا، اور امام نے اس کو منظور کیا، اور شہر میں اس کا اعلان ہو گیا، اس فرمان سلطانی سے پہلے ہی اہلِ افتاء کی ایک جماعت قاضی ابن مسلم سے ملاقات کر چکی تھی، ان کے مشورہ سے قاضی صاحب نے ابن تیمیہ سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اس مسئلہ میں سکوت کریں اور انھوں نے اختلاف اور ہنگامہ سے بچنے کے لئے اس کو منظور کر لیا تھا[1]"

معلوم ہوتا ہے کہ فرمان سلطانی کے صدور کے بعد اس خیال سے کہ حکومت کو اس مسئلہ میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں، اور کسی عالم کو حکومت کے خوف سے اپنے علم اور عقیدہ کو چھپانا جائز نہیں یا اس لئے کہ مسئلہ میں ان کا اطمینان اور شرح صدر بڑھ گیا تھا، انھوں نے اپنی تحقیق کے مطابق فتوے دینا شروع کر دیا، اور حکومت کے امتناعی احکام کی کوئی پرواہ نہیں کی، اس لئے کہ ابن کثیر ۷۲۰ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"پنجشنبہ ۲۲ رجب کو دار السعادۃ میں نائب السلطنت کی موجودگی میں ایک مجلس منعقد کی گئی جس میں مذاہبِ اربعہ کے قاضی و مفتی اور شیخ الاسلام نے شرکت کی، شرکائے مجلس نے اعتراض کیا کہ انھوں نے (ابن تیمیہ نے) مسئلہ طلاق میں پھر فتویٰ دینا شروع کر دیا ہے، چنانچہ نائب السلطنت نے قلعہ میں نظر بند کئے جانے کا حکم جاری کیا، اور وہ (۲۲ رجب ۷۲۰ھ) کو قلعہ میں محبوس کر دیئے گئے۔

لیکن یہ مدت اسیری کچھ زیادہ طویل نہیں ہوئی، پانچ مہینے اٹھارہ دن کے بعد ۱۰ محرم ۷۲۱ھ کو براہِ راست مصر سے ان کی رہائی کے احکام آئے، اور وہ آزاد کر دیئے گئے[2]"

آخری اسیری

۷۲۱ھ سے ۷۲۶ھ تک تقریباً ساڑھے پانچ سال شیخ الاسلام پوری آزادی اور انہماک

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱۴ صـ۸۷ [2] ایضاً

کے ساتھ درس و تصنیف افتاء اور وعظ میں مشغول رہے، اس عرصہ میں وہ زیادہ تر مدرسہ حنبلیہ میں یا اپنے مخصوص مدرسہ میں جو قصاصین میں واقع تھا، درس دیتے تھے، اس عرصہ میں انھوں نے اپنی پرانی کتابوں اور رسائل پر نظر کی، اور بعض نئی تصنیفات کیں۔

شاید وہ اس عرصہ میں بہت زیادہ مفید کام کرتے، اور ان کے قلم سے بعض اہم موضوعات پر کچھ بیش قیمت اور نادر کتابیں نکلتیں لیکن ان کا علمی تفوق اور بعض مسائل پر تفرد ان کے معاصرین اور خود ان کے لئے ایک بڑا ابتلاء تھا جس کی ان کو بار بار بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی، پھر بھی زیادہ دن اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا تھا، تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ایک نیا مسئلہ زیر بحث آگیا، جو خواص و عوام سب کے لئے جاذبِ توجہ تھا، اور جو مسئلۂ طلاق کی طرح خالص فقہی مسئلہ نہ تھا بلکہ اس میں جذباتی عنصر بھی شامل تھا، اور جس میں قلوب کو مضطرب کرنے کی زیادہ صلاحیت تھی، یہ مسئلہ زیارت قبر نبوی (علی صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام) کا تھا۔

ابن تیمیہ نے سترہ سال پہلے یہ فتویٰ دیا تھا کہ کسی قبر کی زیارت کے لئے (خواہ وہ قبر انور ہو، علی صاحبہ الف صلاۃ وسلام) اہتمام سے سفر کر کے جانا (جس کو عربی میں شدّ الرحل کہتے ہیں) جائز نہیں، اس لئے کہ حدیث میں آتا ہے "لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد، المسجد الحرام ومسجدی ھذا والمسجد الاقصیٰ"، کجاوے نہ کسے جائیں (اہتمام سے سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف، مسجدِ حرام (خانۂ کعبہ) میری مسجد (مسجد نبوی) اور (مسجد اقصیٰ)، (بیت المقدس) پھر وہ حسب معمول اس کی شرعی حکمتیں اور اس کی مخالفت کی صورت میں اس کی قباحتیں اور نقصانات گناتے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس اہتمام سفر سے شرک و مشرکانہ عقائد و اعمال کا دروازہ کھلتا ہے، لوگ اس زیارت کو عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھنے لگتے ہیں، وہاں پہونچ کر حدود شریعت سے تجاوز کرتے ہیں اور توحید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اس بات کا کہ قبر مبارک

ان اعمال ورسوم سے محفوظ رہے، جو جاہلی قوموں اور یہود و نصاریٰ میں شائع و ذائع تھے، اس قدر اہتمام تھا کہ فرمایا "لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد"[1] (اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ کی جگہ بنا لیا) نیز بڑے اہتمام سے دعا فرمائی "اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد اشتد غضب اللہ علیٰ قوم اتخذوا قبور انبیائھم مساجد"[2] (اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا دینا جس کی عبادت کی جائے، اللہ کا غصہ ان لوگوں پر سخت ہوا جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبور کو سجدہ گاہ بنا لیا) نیز ارشاد فرمایا "لا تتخذوا قبری عیداً وصلّوا علیّ فان صلاتکم حیثما کنتم تبلغنی"[3] نیز آپ نے اسی لئے کسی میدان میں دفن ہونا پسند نہیں کیا، بلکہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں مدفون ہوئے جو ایک محفوظ جگہ ہے، اس سب کا مقتضا یہ ہے کہ قبر انور کو ان تمام خطرات سے محفوظ رکھا جائے، اور اہتمام سے جوق در جوق زیارت کی نیت سے آنے کی اجازت نہ دی جائے، البتہ جو لوگ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نیت سے آئیں وہ مسنون طریقہ سے زیارت کریں اور صلوٰۃ وسلام بھیجیں جیسا کہ صحابہ و تابعین کا دستور تھا۔[4]

مختلف اسباب و محرکات کی بنا پر ستّرہ[1] برس پہلے کا یہ فتویٰ نکالا گیا، اور اس کی تشہیر کی گئی، ایک طرف اس سے عام مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی، جو اس زیارت کو بڑی سعادت اور نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے، اور اس کا ذوق و شوق رکھتے تھے، اور ان کو بارگاہِ نبوت میں کمی ادب کی جھلک نظر آئی،

---

[1] بخاری ومسلم [2] مالک مرسلا، مسند امام احمد [3] سنن ابی داؤد وغیرہ [4] جہاں تک ان مقاصد کا تعلق ہے (کہ توحید کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے، اور شرک و مشرکانہ اعمال و رسوم کے ذرائع مسدود کئے جائیں، اور ان کی اجازت نہ دی جائے) کسی صاحبِ علم کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے لئے زیارت قبر نبوی کو مطلقاً روکنا ذکاوت حس اور تشدد سے خالی نہیں معلوم ہوتا، اور یہ بات نہ ان کی علمی و دینی عظمت کے منافی ہے نہ ہمارے حسن اعتقاد اور ان کے کمالات کے اعتراف کے لئے مانع، نہ یہ مسئلہ اتنا سنگین تھا کہ اس کے لئے ان کو محبوس کیا جائے اور اسی حالت اسیری میں وہ دنیا سے رخصت ہوں۔

دوسری طرف اس میں علماء کو جمہور امت کی مخالفت اور خود سری اور خود رائی نظر آئی، اور شاید یہی ان کی مخالفت کا اصل محرک تھا۔

بہر حال اس اختلاف نے اتنی اہمیت اختیار کی، اور اس کا اتنا چرچا ہوا کہ حکومتِ وقت نے (علماء کی توجہ دہانی سے یا اپنی انتظامی مصلحتوں سے) اس میں دخل دینا مناسب سمجھا اور ۷ شعبان ۷۲۶ھ کو ان کے محبوس کیئے جانے کا فرمان صادر ہوا، شیخ نے اس اطلاع کا بڑا خیر مقدم کیا، اور اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، انھوں نے اپنے حبس کی اطلاع پاتے ہی فرمایا "انا کنت منتظرًا ذلك وهذا فيه خير كثير ومصلحة كبيرة" (میں تو اس کا منتظر ہی تھا، اس میں بڑی خیر اور بہت بڑی مصلحت ہے۔)

شیخ قلعۂ دمشق میں منتقل کر دیئے گئے جہاں ان کے لئے ایک ایوان خالی کر دیا گیا اس کا انتظام کیا گیا کہ باہر سے پانی کا چشمہ قلعہ میں لایا جائے، ان کی خدمت اور راحت کے لئے اجازت دی گئی کہ ان کے بھائی زین الدین ابن تیمیہ بھی ان کے ساتھ قیام کریں، حکومت نے ان کے مصارف کے لئے ایک معقول رقم بھی مقرر کی۔

ان کے محبوس ہو جانے کے بعد لوگوں کو انتقامی کارروائی کرنے کا موقع ملا اور ان کے حاسدین و مخالفین نے ان کے مخصوص دوستوں اور شاگردوں پر دست درازی کی، بعض حضرات کو جانوروں پر سوار کرا کے گشت کرایا گیا، اور تشہیر کی گئی، پھر قاضی القضاۃ کے حکم سے ایک جماعت کو قید بھی کر دیا گیا، کچھ دنوں کے بعد سب کو رہا کر دیا گیا، لیکن شیخ الاسلام کے مایۂ ناز شاگرد اور جانشین حافظ ابن قیم اپنے استاد اور شیخ کے ساتھ ہی رہے، اور ان کی وفات کے بعد رہا ہوئے۔[1]

---

[1] ابن تیمیہ محمد ابوزہرہ صف۸

اہلِ علم ودین کا تاسّف اور احتجاج

شیخ الاسلام کی اسارت اور نظربندی جہاں حاسدین ومخالفین کی ایک قلیل جماعت کی شادمانی اور تسکینِ قلب کا سامان بنی، وہاں ہزاروں اہلِ علم اور لاکھوں مسلمانوں کو اس پر سخت تاسّف اور رنج ہوا، اور انھوں نے اس کو سنت کے مقابلہ میں بدعت کی فتح اور حق اور اہلِ حق کے لئے ایک ذلّت کے مرادف سمجھا، سلطنت کے مختلف گوشوں سے اور بڑے بڑے اہل علم واہلِ دین کی جانب سے سلطان معظم (الملک الناصر) کی خدمت میں ایسے خطوط اور عرائض پہونچے جس میں اس واقعہ پر دلی تأثر اور استعجاب کا اظہار کیا گیا تھا، اس سلسلہ کا صرف ایک خط جو علمائے بغداد نے سلطان کی خدمت میں بھیجا تھا، نقل کیا جاتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کی دعوت اور شہرت تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیل گئی تھی، اور تمام اہلِ حق کو ان کی ذات سے خاص تعلق اور شیفتگی تھی، علمائے بغداد لکھتے ہیں :-

لما قرع اهل البلاد المشرقية والنواحي	بلادِ مشرق اور ملکِ عراق کے باشندوں کو جب اس کا
العراقية التضييق على شيخ الاسلام	علم ہوا کہ شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ پر تنگی کی
تقي الدين احمد بن تيمية سلّمه الله	جارہی ہے، تو اہلِ اسلام کو اس سے بڑی گرانی اور
عظم ذلك على المسلمين وشقّ على	اہلِ دین کو اس سے بڑی کوفت ہوئی، اور دیکھا گیا کہ
ذوي الدّين وارتفعت رؤس	ملحدین کو اس سے بڑی مسرت اور عزّت حاصل ہوئی،
الملحدين وطابت نفوس اهل الأهواء	اور اہلِ اہوی اور مبتدعین کے دل باغ باغ ہوئے
والمبتدعين، ولما رأى علماء اهل	جب ان اطراف کے علماء کو اس واقعہ کی اہمیت
هذه الناحية عظم هذه النازلة من	کا علم ہوا، اور انھوں نے دیکھا کہ اہل بدع اور
شماتة اهل البدع واهل الاهواء	اہلِ باطل، اکابر فضلاء اور ائمۂ علماء کی اس ذلت

باکابر الفضلاء وائمة العلماء انهوا حال	اور ابتلاء پر خوشیاں منارہے ہیں تو انھوں نے
هذا الامر الفظيع والامر الشنيع الى الحضرة	اس ناگوار واقعہ اور اس کے اثرات کی اطلاع
الشريفة السلطانية زادها الله شرفًا،	بارگاہ سلطانی میں دینا ضروری سمجھا اور انھوں نے
وكتبوا اجوبتهم في تصويب ما اجاب به	شیخ کے فتاویٰ کی تائید میں اپنے جوابات لکھ کر روانہ
الشيخ سلمه الله في فتاواه وذكروا من	کئے، انھوں نے شیخ کے علم اور ان کے فضائل و کمالات
علمه وفضائله بعض ما هو فيه، وحملوا	کے متعلق اپنے تاثرات اور معلومات بھی قلمبند کئے،
ذلك بين يدى مولانا ملك الامراء	اور اس سب کو ملک معظم کی خدمت ہمایوں میں
اعز الله انصاره وضاعف اقتداره	پیش کردیا، اس سب کا محرک و باعث سوائے دینی
غيرةً منهم على هذا الدين ونصيحة	غیرت و حمیت اور اسلام اور سلاطین اسلام کی
للاسلام وامراء المؤمنين۔[1]	خیر خواہی کے کچھ نہ تھا۔

قلعہ میں شیخ کے مشاغل

عرصۂ دراز کے بعد شیخ کو سکون کے لمحات اور یکسوئی کی دولت حاصل ہوئی، غالبًا اسی پر انھوں نے فرمایا تھا (فيه خير كثير ومصلحة كبيرة) انھوں نے اس خلوت و انقطاع کی پوری قدر کی، اور پورے انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ عبادت و تلاوت میں مشغول ہوگئے، اس سے جو کچھ وقت بچتا تھا وہ مطالعہ و تصنیف اور اپنی کتابوں کی تنقیح و تصحیح میں صرف کرتے تھے، جو خود ایک مستقل عبادت تھی، اس فرصت میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ اور ورد تلاوتِ قرآن تھا، وہ اس محبس میں دو سال رہے، اس مختصر مدت میں انھوں نے اپنے بھائی شیخ زین الدین ابن تیمیہ کے ساتھ قرآن مجید کے اسّی دور کئے۔[2]

---

[1] العقود الدرية ص ۳۵ اور الكواكب الدرية ص ۱۹۵ [2] البداية والنهاية ص ۱۳۸

جیل میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا زیادہ تر حصہ تفسیر سے متعلق تھا، اس کا سبب بھی غالباً تلاوت کی کثرت اور قرآن مجید میں غور و تدبر تھا، بعض مسائل پر بھی انھوں نے رسائل اور جوابات لکھے، باہر سے جو اہم اور خاص علمی سوالات اور فقہی استفسارات آتے ان کے جوابات دیتے، اس طرح سوائے عمومی درس و وعظ کے ان کے سب کام جاری تھے، اور کثرت تلاوت اور عبادت کا اضافہ تھا۔

نئی پابندیاں اور سامان مطالعہ و تحریر سے محرومی

شیخ جیل خانہ میں جو کچھ لکھتے تھے، لوگ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا، دوسرے رسائل و مسائل کے علاوہ جو انھوں نے جیل میں تحریر کیے ان کا ایک مستقل رسالہ مسئلۂ زیارت میں تھا جس میں انھوں نے مصر کے ایک مالکی المذہب قاضی عبداللہ بن الاخنائی کی تردید کی تھی[1]، اس میں انھوں نے ثابت کیا تھا کہ قاضی موصوف بہت قلیل العلم اور ناواقف آدمی ہیں، قاضی صاحب نے سلطان سے اس کی شکایت کی اور اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا، سلطان نے فرمان جاری کیا کہ شیخ کے پاس جتنی کتابیں کاغذ قلم دوات ہے، لے لیا جائے، اور ان کے پاس کوئی ایسا سامان نہ رہے جس کی مدد سے وہ تصنیف و تالیف کر سکیں۔

۹ جمادی الاخریٰ ۷۲۸ھ کو اس فرمان کی تعمیل کی گئی اور پڑھنے لکھنے کا سارا سامان بحق حکومت ضبط کر لیا گیا، یکم رجب کو ان کے سب مسودات اور اوراق جیل سے اٹھا کر عادلیہ[2] کے بڑے کتب خانہ میں داخل کر دیئے گئے، یہ کتابوں کی ساٹھ جلدیں اور ۱۴ کاغذ کے شیرازے تھے جن میں وہ لکھتے پڑھتے تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ "الاخنائیہ" مطبوعہ مصر [2] یہ عمارت المکتبۃ الظاہریۃ کے سامنے ہے، اسی میں ابن خلکان نے اپنی مشہور تالیف "وفیات الاعیان" لکھی، اور ابنِ مالک صاحبِ الفیہ نے درس دیا، آج کل اس میں المجمع العلمی العربی کا مرکز ہے۔

کوئلہ سے تحریر و تصنیف

شیخ نے اس پر بھی کسی جزع و فزع کا اظہار نہیں کیا، اور نہ حکومت سے کوئی شکایت کی، ان سے جب قلم و دوات لے لئے گئے تو انھوں نے منتشر اوراق پر کوئلہ سے لکھنا شروع کیا، ان کے متعدد رسائل اور تحریریں کوئلہ سے لکھی ہوئی ملیں، اور عرصہ تک اسی حالت میں محفوظ رہیں، اس مجبوری اور بے سروسامانی کی حالت میں وہ شاکر اور راضی برضا معلوم ہوتے ہیں، ان کو اس کا بھی احساس ہے کہ ان کو میدانِ جہاد کی فضیلت حاصل ہے، اور صورتِ حال میں کوئی تغیر نہیں ہوا، ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

نحن وللہ الحمد فی عظیم الجہاد فی سبیلہ	ہم بحمد اللہ بہت بڑے جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول ہیں،
بل جہادنا فی ھذا مثل جہادنا یوم قازان	ہمارا یہاں کا جہاد واقعۂ قازان، جہاد کوہستان جہمیوں
والجبلیۃ، والجہمیۃ والاتحادیۃ وامثال	اور اتحادیوں (وحدۃ الوجود کے قائلین) وغیرہ کے
ذلک، وذلک من اعظم نعم اللہ علینا وعلی	مقابلہ میں ہمارے گذشتہ جہاد سے کم نہیں ہے، یہ
الناس ولکن اکثر النّاس لایعلمون[1]۔	اللہ تعالیٰ کا ہم پر اور لوگوں پر بہت بڑا احسان ہے،
	لیکن اکثر لوگ اس کی حقیقت سے واقف نہیں۔

تسلیم و رضا اور حمد و شکر

ایک دوسرے خط میں ان کی ایمانی کیفیت اور تسلیم و رضا کی شان اس طرح جھلکتی ہے:۔

کل ما یقضیہ اللہ تعالیٰ فیہ الخیر والرحمۃ	اللہ تعالیٰ بندہ کے لئے جو کچھ فیصلہ فرمائے اسی میں خیر
والحکمۃ، انّ ربّی لطیف لما یشاء انہ	اور رحمت اور حکمت ہے (انّ ربّی لطیف لما یشاء)

---

[1] ابن تیمیہ محمد ابوزہرہ۔

هو القوی العزیز العلیم الحکیم ولا یدخل
علی أحد ضرر الا من ذنوبه" ما اصابك
من حسنة فمن الله وما اصابك من
سیئة فمن نفسك" فالعبد علیه ان
یشکر الله ویحمده دائما علی کل حال
ویستغفر من ذنوبه، فالشکر یوجب
المزید من النعم والاستغفار یدفع
النقم، ولا یقضی الله للمرء من قضاء
الا کان خیرا له ان اصابته سراء
شکر، وان اصابته ضراء صبر فکان
خیرا له۔

بیشک وہ قوی، غالب اور علیم وحکیم ہے، انسان کو
صرف اپنے گناہوں سے نقصان پہنچتا ہے ما اصابك
من حسنة فمن الله وما اصابك من سیئة
فمن نفسك (تجھے جو بھلائی بھی پہونچے وہ اللہ کی
طرف سے ہے، اور جو تجھے برائی پہنچے، وہ تیرے نفس کی
طرف سے ہے) اس لئے بندہ کا فرض ہے کہ اللہ تعالےٰ
کا ہر حال میں شکر اور اس کی حمد کرے اور اپنے گناہوں سے
استغفار، اس لئے کہ شکر تازہ نعمتوں اور مزید انعامات کا
موجب ہے اور استغفار غضب اور سزا کو دفع کرتا ہے
اور اللہ تعالےٰ انسان کے لئے جو کچھ فیصلہ فرماتا ہے وہ
اس کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا
ہے کہ مومن کو جب مسرت اور نعمت حاصل ہوتی ہے تو
شکر کرتا ہے جب مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو صبر سے
کام لیتا ہے اور یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔

ان کو اس حالت میں بھی اپنے مسلک کی صحت اور بے گناہی کا یقین ہے، وہ اپنا جرم اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ایک مسئلہ شرعی میں حاکمِ وقت کی بات نہیں مانی اور جس کو وہ حق... سمجھتے تھے اس پر اڑے رہے لیکن وہ اپنے اس جرم کا اعتراف کرتے ہیں، اور اس کو ایمان و توحید کا مقتضاء سمجھتے ہیں۔

غایة ما عندهم انه خولف مرسوم
بعض المخلوقین والمخلوق کائنا من

ان کا بڑے سے بڑا الزام یہ ہے کہ ایک انسان کی
(جو دوسرے انسانوں کی طرح خدا کا ایک بندہ ہے)

کان اذا خالف امر اللہ تعالیٰ ورسولہ لم یجب، بل لا تجوز طاعتہ فی مخالفۃ امر اللہ ورسولہ باتفاق المسلمین۔

حکم عدولی کی گئی، مخلوق خواہ حاکم وقت ہو یا سلطانِ دوراں جب اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت کرے گا تو اس کی بات کبھی نہیں مانی جائے گی، بلکہ باتفاق مسلمین اللہ اور رسول کی مخالفت کی حالت میں اس کی اطاعت جائز ہی نہیں۔

زندگی کے آخری دن اور وفات

شیخ الاسلام کے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے اسیؔ دور ختم کرنے کے بعد جب نیا دور شروع کیا، اور سورۂ قمر کی اس آیت پر پہنچے "اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍۙ فِىْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ" تو بجائے میرے عبداللہ بن محب اور عبداللہ الزرعی کے ساتھ دور شروع فرمایا، یہ دونوں نہایت صالح شخص تھے، اور آپس میں حقیقی بھائی تھے، شیخ کو ان کی قرأت بہت پسند تھی، ابھی یہ دور ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ زندگی کے دن پورے ہو گئے۔

مرض وفات شروع ہوا، تو نائب دمشق (حاکم دمشق) عیادت کے لئے آیا، مزاج پرسی کے بعد اس نے بڑی معذرت کی، اور کہا مجھ سے اگر کوئی تقصیر ہوئی یا تکلیف پہونچی ہو تو للہ معاف کر دیا جائے، شیخ نے جواب میں فرمایا:۔

انّی قد احللتك، وجمیع من عادانی وھو لایعلم انّی علی الحق، واحللت السلطان المعظّم الملك الناصر من حبسہ ایّای، لكونہ فعل ذلك مقلدًا

میں نے تم کو بھی اپنی طرف سے معاف اور سبکدوش کر دیا ہے، اور ان سب لوگوں کو بھی جنھوں نے مجھ سے دشمنی کی، اور ان کو میرا حق پر ہونا معلوم نہیں تھا، اور سلطان معظم الملک الناصر سے بھی میرا کوئی مطالبہ اور

معنٰ ورًا ولم یفعله لحظ نفسه، وقد احللت کل احد مما بینی وبینه الا من کان عدو اللہ ورسولہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

دار و گیر نہیں کہ انھوں نے مجھے محبوس کیا، اس لئے کہ انھوں نے یہ علماء کے اعتماد اور ان کی تقلید میں کیا ہے اور وہ معذور ہیں، اس میں ان کی نفسانیت شامل نہیں میں نے ہر شخص کو اپنے معاملہ میں معاف کر دیا ہے، صرف اس شخص کو نہیں کیا، جو اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے۔

انتقال سے بیس۲۰ بائیس۲۲ روز پہلے طبیعت خراب ہوئی، پھر درست نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ۲۲ر ذی القعدہ ۷۲۸ھ کی شب میں وقت موعود آپہنچا، اور اس مجمع کمالات ہستی نے سرسٹھ۶۷ سال کی عمر میں دنیا سے کوچ کیا، "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ"۔

شیخ الاسلام کی وفات کی اطلاع قلعہ کے موذن نے مینار پر چڑھ کر دی، برجوں پر جو چوکیدار متعین تھے، انھوں نے وہاں سے اعلان کیا، شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر پھیل گئی، قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا، اور اذن عام دے دیا گیا، لوگ جوق در جوق آتے تھے، اور زیارت کر کے جاتے تھے، بہت سے لوگ فرط محبت میں اس پیشانی کو بوسہ دیتے تھے، جو گھنٹوں خاک پر اپنے مالک کے سامنے ٹکی رہتی تھی۔

غسل سے پہلے ہی لوگوں نے قرآن مجید ختم کئے، مردوں کے بعد عورتوں کو آنے کی اجازت ہوئی اور انھوں نے زیارت کی، غسل کے وقت صرف وہی لوگ رہ گئے جن کو غسل دینا تھا۔

جنازہ کی کیفیت اور تدفین

غسل کے بعد ایک نمازِ جنازہ قلعہ میں ہوئی، شیخ محمد تمام نے نماز پڑھائی، نماز کے بعد جنازہ باہر لایا گیا، قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے سب راستے ہجوم سے بھرے ہوئے تھے، چار گھڑی دن چڑھے جنازہ جامع مسجد (جامع اموی) میں پہونچا، ہجوم کا یہ حال تھا کہ فوج جنازہ کو اپنے گھیرے میں

لئے ہوئے تھی، ورنہ جنازہ کی حفاظت اور انتظام مشکل تھا، مجمع کا کوئی اندازہ نہ تھا، اس ہجوم خلائق میں کسی نے بلند آواز سے پکار کر کہا "هٰكذا تكون جنائز ائمة السنة" (سنت کے پیشواؤں کا جنازہ اسی شان کا ہوتا ہے) یہ سن کر اور کہرام مچ گیا۔

ظہر کے بعد نمازِ جنازہ ہوئی، لحظہ بلحظہ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ میدان، گلیاں، بازار سب بھر گئے، ہر طرف مجمع ہی مجمع نظر آتا تھا، بازار بند تھا، اور کھانے کی دوکانیں سب بند تھیں بہت سے لوگوں نے روزہ کی نیت کر لی کہ آج کھانے پینے کا ہوش نہیں۔

نماز جنازہ کے بعد جنازہ اٹھا، کاندھا دینے کا موقع نہ تھا جنازہ انگلیوں و سروں پر جا رہا تھا، ہر طرف گریہ و بکا کی صدائیں بلند تھیں، ہر زبان اور ہر لب پر مدح و توصیف اور دعا کے الفاظ تھے، لوگ فرطِ عقیدت میں رومال اور کپڑے پھینک پھینک کر جنازہ سے مس کراتے تھے، شدتِ ازدحام سے لوگوں کے پاؤں کے جوتے اور کھڑاویں نکل گئیں اور پگڑیاں اور رومال گر گئے، لوگ جنازہ کے دیکھنے اور اس کی مشائعت میں ایسے محو اور مستغرق تھے کہ ان کو اپنے کپڑوں اور جوتوں کا ہوش نہ تھا، جنازہ سروں پر جا رہا تھا کبھی کچھ آگے بڑھ جاتا تھا کبھی پیچھے کھسک جاتا تھا کبھی ٹھہر جاتا تھا، سوق الخیل میں پہنچکر مجمع کا کوئی حد و حساب نہیں رہا، جنازہ وہاں رکھا گیا، چھوٹے بھائی زین الدین عبدالرحمٰن نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی، نماز کے بعد مقبرۃ الصوفیہ میں اپنے بھائی شرف الدین عبداللہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔[1]

---

[1] یہ قبرستان جو بڑے بڑے مشاہیر اہلِ قلم و صلاح (مثلاً ابن عساکر، ابن الصلاح، ابن الاثیر، ابو الحجاج المزی، حافظ عماد الدین ابنِ کثیر وغیرہ) کا مدفن ہے، اب بالکل ناپید ہو گیا ہے، اس پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہیں، صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی قبر جامعہ سوریہ کے ہال اور اسپتال کی ایک عمارت کے سامنے ابھی تک موجود ہے۔ ۱۰ شوال ۱۳۷۰ھ (۲۸ جولائی ۱۹۵۱ء) کو علامۂ شام شیخ محمد بہجۃ البیطار کی معیت و رہبری میں راقم سطور نے اس کی زیارت کی، علامۂ موصوف نے واقعہ سنایا کہ یونیورسٹی کی کسی تعمیر کے سلسلہ میں شب بھر میں اس مقبرہ کو کھود ڈالا گیا، صبح جب اس کی اطلاع ہوئی تو صدر جمہوریہ شکری القوتلی نے عیسائی

(باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

جنازہ صبح کے وقت قلعہ سے نکلا تھا، لیکن ہجوم کی کثرت کی وجہ سے کہیں عصر کی اذان کے وقت دفن کی نوبت آئی، بظاہر سارا شہر جنازہ کی مشایعت میں تھا، حاضرین کا کم سے کم اندازہ ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کیا گیا ہے، ۱۵ ہزار صرف عورتوں کا اندازہ ہے، جو جنازہ میں شریک تھیں، جو بالاخانوں اور چھتوں سے دیکھ رہی تھیں، اس کے علاوہ ہیں، جنازہ میں ایسا ہجوم دمشق کی تاریخ میں دیکھا نہیں گیا، ممکن ہے بنی امیہ کے زمانہ میں جب دمشق کی آبادی بہت تھی، اور وہ دار الخلافہ تھا کسی کے جنازہ میں ایسا ازدحام ہوا ہو۔[۱]

نمازِ جنازہ غائبانہ

اکثر اسلامی ممالک میں یہاں تک کہ اقصائے جنوب اور اقصائے مشرق میں غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی، ابنِ رجب "ذیل طبقات الحنابلہ" میں لکھتے ہیں:۔

وصلی علیہ صلاۃ الغائب فی غالب بلاد	اکثر قریب و بعید ممالکِ اسلامیہ میں نمازِ جنازہ غائبانہ
الاسلام القریبۃ والبعیدۃ حتّٰی فی الیمن	پڑھی گئی، یہاں تک کہ یمن اور چین میں بھی نمازِ جنازہ
والصّین واخبر المسافرون انہ نودی	ہوئی، مسافروں نے بیان کیا کہ چین کے ایک بعید ترین
باقصی الصّین للصّلاۃ علیہ یوم	شہر میں جمعہ کے دن نمازِ جنازہ (غائبانہ) کا اعلان
جمعۃ "الصّلاۃ علی ترجمان القرآن"۔	ان الفاظ میں ہوا کہ "ترجمان قرآن کی نمازِ جنازہ ہوگی"

(باقی ص۱۲۵ کا) وائس چانسلر کو تنبیہ کی کہ ابن تیمیہؒ کی قبر اگر مندرس ہوگئی تو میں سلطان ابن سعود کو کیا جواب دوں گا جن سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں، چنانچہ وہ قبر باقی رکھی گئی جو ابھی تک محفوظ ہے۔

[۱] یہ ساری تفصیل ابنِ کثیر نے شیخ علم الدین البرزالی کے حوالہ سے لکھی ہے، جو شیخ الاسلام کے معاصر اور رفیق درس تھے۔ ج ۱۴ ص۱۳۶-۱۳۹

نمایاں صفات اور کمالات

خداداد حافظہ اور ذہانت

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے دور میں علومِ اسلامیہ میں جو مجتہدانہ مقام حاصل کیا، اور تفسیر و حدیث و فقہ میں بیک وقت اپنی امامت، تبحّر اور غیر معمولی عبور کا جو نقش اپنے زمانہ پر قائم کیا، اس میں بہت بڑا دخل ان کے غیر معمولی حافظہ اور ذہانت کو تھا، جو ایک موہبتِ خداوندی اور ایک نعمتِ خداداد تھی، ابن تیمیہ کے عصر میں اسلامی علوم اتنی وسعت اختیار کر چکے تھے اور منقولات کا اتنا بڑا ذخیرہ مجتمع ہو گیا تھا کہ جو شخص غیر معمولی حافظہ کا مالک نہ ہوتا، وہ نہ اس وسیع ذخیرہ پر عبور حاصل کر سکتا تھا، نہ مختلف فیہ اور مابہ النّزاع مسائل میں اپنے نامور اور متبحّر معاصرین کے سامنے لب کشائی کی جرأت کر سکتا تھا، اور نہ کسی مسئلہ میں کسی پیشرو عالم سے اختلاف کا حق رکھتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ابن تیمیہ کو جو حافظہ اور قوت استحضار عطا فرمائی تھی، اس کی مدد سے انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، علم الخلاف (اختلافات ائمہ) علم کلام، تاریخ، سیر و آثار، علم رجال، لغت و نحو، کے اس وقت تک کے ذخیرہ پر عبور حاصل کر لیا، جتنی کتابیں اور ماخذ و مواد اس وقت موجود تھا، اور وہاں تک ان کی دسترس تھی، انھوں نے اس کا مطالعہ کیا، اور ان کے قوی اور امانت دار حافظہ نے اس کو محفوظ کر لیا، اور انھوں نے اپنی علمی اور تصنیفی زندگی میں اس سے اس طرح مدد لی، جیسا کہ ایک تجربہ کار جنگ آزما اپنے ترکش کے

ذخیرہ سے مدد لیتا ہے۔

ان کے معاصرین ان کے حافظہ کی غیر معمولی قوت، استحضار اور نمایاں ذکاوت و ذہانت کے مدّاح اور معترف ہیں، اور اس پر معاصرین و متاخرین سب کا اتفاق ہے کہ وہ نہایت قوی الحفظ، سریع الفہم اور ذہین و ذکی تھے، ان کے رفیقِ درس علامہ علم الدین البرزالی کہتے ہیں "قلّ ان سمع شیئًا الاحفظہ وکان ذکیًا کثیر المحفوظ"[1] (وہ جو کچھ بھی سنتے یاد کر لیتے، کم اس میں تخلّف ہوتا، وہ نہایت ذہین تھے اور کثرت سے ان کو چیزیں یاد تھیں) حافظ ذہبی جو فنِ رجال کے امام اور مورخ اسلام ہیں فرماتے ہیں "ما رأیت اشد استحضارًا للمتون وعزوھا منہ، وکانت السنۃ بین عینیہ وعلی طرف لسانہ"[2] (میں نے ان سے زیادہ متون (حدیث کے الفاظ اور اصلی عبارات) کا یاد رکھنے والا، اور بر وقت ان سے کام لینے والا اور ان کا صحیح حوالہ دینے والا اور نسبت کرنے والا نہیں دیکھا، حدیث کا ذخیرہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے اور زبان کی نوک پر تھا) ان کے حافظہ کے لئے سب سے بڑی شہادت ان کے معاصرین کا یہ قول تھا کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ کہہ دیں کہ میں نہیں جانتا وہ حدیث ہی نہیں ہے، حدیث کا ذخیرہ جتنا عظیم اور وسیع تھا، اور اس کو ہر وقت مستحضر رکھنا جتنا مشکل کام تھا، اس کے بعد حدیث کے بارہ میں تنہا ان کے حافظہ اور علم پر اعتماد اور ان کے قول پر فیصلہ جب ہی ہو سکتا تھا جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے، اور ان کا حافظہ کبھی ان سے بے وفائی اور خیانت نہیں کرتا تھا، حافظ ذہبی کہتے ہیں "یصدق علیہ ان یقال کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیۃ فلیس بحدیث"[3] (ان کے متعلق یہ کہنا درست ہوگا کہ جس حدیث کو ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں ہے۔)

ان کے بعض معاصرین نے یہاں تک کہا ہے کہ کئی صدی سے ایسا قوی الحفظ انسان پیدا نہیں ہوا، علامہ کمال الدین ابن الزملکانی جو شیخ الاسلام کے ایسے معاصر تھے، جو مجلس مناظرہ میں ان کے

---

[1] الرد الوافر ص۶۶ [2] القول الجلی ص۱۰۱ [3] الکواکب ص۱۴۵

حریف رہے ہیں، اور بہت سے مسائل میں ان کو ان سے سخت اختلاف رہا ہے، ان کے اس وصفِ خداداد کی شہادت ان الفاظ میں دیتے ہیں :۔

لم یرمن خمس مائۃ سنۃ او قال	پانچ سو سال سے یا چار سو سال سے (ناقل کو اس
اربع مائۃ سنۃ ۔ والشک من الناقل۔	میں تردد ہے کہ پانچ سو سال کہے یا چار سو سال) ایسا
احفظ منہ[1]۔	قوی الحفظ آدمی پیدا نہیں ہوا۔

ذہانت کے متعلق حافظ ذہبی کے الفاظ ہیں "کان تیوقد ذکاءً" (وہ ذہانت کا ایک شعلہ تھے) دوسری جگہ لکھتے ہیں "کان اٰیۃ من الذکاء وسرعۃ الادراک"[2] (ذہانت اور سرعت فہم میں عجوبۂ روزگار تھے۔)

تبحّر علمی اور جامعیّت

اس خداداد حافظہ اور ذہانت، علم سے خاندانی مناسبت، سخت محنت ومشقت، شوق مطالعہ اور ذوقِ علم اور سب سے بڑھ کر توفیقِ خداوندی سے انھوں نے اسلامی علوم اور رائج الوقت فنون و مضامین میں ایسا تبحّر اور جامعیت کی شان پیدا کر لی تھی کہ ان کے وہ نامور معاصرین جو سِن میں ان سے بڑے اور اپنے زمانہ کے مسلّم الثّبوت استاد اور امام فن تھے، ان کے تبحّر اور جامعیت کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے، اور اس کی شہادت دیتے تھے کہ وہ علم کا دریا اور اسلام کا بولتا ہوا کتب خانہ ہیں، اور ہر فن میں ان کو ایسا دخل ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کا خاص فن ہے، علامہ تقی الدین ابن دقیق العید کا پایہ فنِ حدیث میں مسلّم ہے، اس زمانہ کے علماء بالعموم ان کو اپنا استاد اور بزرگ مانتے تھے ۷۰۰ھ میں جب ابن تیمیہ مصر گئے تو علامہ ابن دقیق العید سے ملاقات ہوئی، اس ملاقات کے بعد علامۂ موصوف نے اپنا تأثر ان الفاظ میں ظاہر کیا:۔

---

[1] الکواکب ص ۱۴۵ [2] الرّد الوافر ص ۲۹

لما اجتمعت بابن تیمیہ رأیت رجلاً	جب ابن تیمیہ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا
العلوم کلھا بین عینیہ یأخذ منھا	محسوس ہوا کہ تمام علوم اس شخص کی آنکھوں کے
مایرید ویدع مایرید۔[1]	سامنے ہیں، جو چاہتا ہے لے لیتا ہے اور جس کو چاہتا
	ہے چھوڑ دیتا ہے۔

علامہ کمال الدین ابن الزملکانی جو خود ایک متبحر عالم اور کثیر الفنون شخص تھے، ان الفاظ میں اپنا استعجاب ظاہر کرتے ہیں:۔

کان اذا سئل عن فن من العلم ظن	جب کسی فن کے اندر ان سے سوال کیا جاتا تو دیکھنے
الرائی والسامع انہ لایعرف غیر	اور سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ اس فن کے سوا کچھ نہیں
ذلک الفن وحکم ان احداً لایعرف	جانتے اور یہ رائے قائم کر لیتا کہ کوئی دوسرا شخص
مثلہ۔[2]	ان کا اس فن میں ہمسر نہیں۔

علامہ تقی الدین ابن السبکی ان کے مشہور حریف ہیں، جنھوں نے مسئلہ شد رحال اور بعض دوسرے فقہی مسائل میں ان کی تردید میں مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور نظم میں بھی ان کے متعلق اظہار خیال کیا ہے،[3] بایں ہمہ حافظ ذہبی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

المملوک یتحقق کبیر قدرہ وزخارۃ	فقیر کو اس کا خوب اندازہ ہے کہ ابن تیمیہ ایک
بحرہ وتوسعہ فی العلوم الشرعیۃ	جلیل القدر عالم، بحر زخار اور علوم شرعیہ وعقلیہ
والعقلیۃ وفرط ذکائہ واجتھادہ	میں متبحر ہیں، اس کو ان کی اعلیٰ ذہانت محنت وغور وفکر
وبلوغہ فی کل ذلک المبلغ الذی	کا بھی خوب اندازہ ہے اور معلوم ہے کہ وہ (علمی کمالات)
لایتجاوزہ الوصف والمملوک	کے ایسے مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں کہ اس کی تعریف

[1] الرد الوافر ص۳۱ [2] ایضاً ص۳۰ [3] ملاحظہ ہو ترجمہ علامہ تقی الدین ابن السبکی (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تاج الدین ابن السبکی)

يقول ذلك دائماً۔[1] مشکل ہے، فقیر اپنی مجلس میں ہمیشہ اس کا اعتراف اور اظہار کرتا رہتا ہے۔

تاریخ ان کا خصوصی فن نہیں تھا، اور نہ انھوں نے اس کو اپنا موضوع بنایا تھا، اس کے باوجود ذہبی جیسے مورخ ونقّاد کا بیان ہے کہ "ومعرفته بالتاريخ والسّير فعجب عجيب" (ان کی تاریخی واقفیت حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے۔)

ان کی تاریخ دانی، وسعتِ نظر اور حاضر دماغی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ان کے تلمیذ رشید حافظ ابنِ قیمؒ نے "زاد المعاد" میں نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک اسلامی ملک میں (غالباً شام یا عراق میں) یہودیوں نے ایک قدیم دستاویز پیش کی جو دیکھنے میں بھی بہت قدیم تحریر اور کاغذ معلوم ہوتا تھا، اس میں یہ درج تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف فرمادیا تھا، اس دستاویز پر حضرت علیؓ، سعد بن معاذؓ اور صحابۂ کرام کی ایک جماعت کے دستخط تھے بعض ناواقف جن کی نظر تاریخ وسیرت اور اس عہد کے حالات پر وسیع اور گہری نہ تھی، دھوکہ میں آگئے اور ان کو اس کی صحت کا یقین ہوگیا اور انھوں نے اس پر عمل کرنے اور یہودیوں سے جزیہ کے ساقط کرنے کا فیصلہ کردیا، جب یہ دستاویز شیخ الاسلام کے سامنے آئی تو انھوں نے اس کو بالکل ناقابلِ اعتبار اور جعلی قرار دیا، اور اس کے جعلی اور مصنوعی ہونے کے ثبوت میں دس دلیلیں پیش کیں، ان میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ اس پر حضرت سعد بن معاذؓ کے دستخط ہیں، حالانکہ جنگِ خیبر سے پہلے ان کی وفات ہوچکی تھی، دوسرے یہ کہ اس میں ذکر ہے کہ یہودیوں سے جزیہ کو ساقط کردیا گیا ہے، حالانکہ جزیہ کا حکم اس وقت تک آیا ہی نہ تھا، اور نہ صحابۂ کرام اس سے واقف تھے، اس کا حکم تو خیبر کے تین سال کے بعد تبوک کے سال

---

[1] الکواکب ص۱۴۶

نازل ہوا ہے، تیسرے یہ کہ اس میں تذکرہ ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہیں لیا جائے گا، یہ ایک مہمل بات ہے اس لئے کہ کیا یہودی کیا غیر یہودی کسی سے بیگار لینے کا دستور نہیں تھا، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم او صحابۂ کرام اس ظلم اور زبردستی سے بالکل پاک تھے، وہ کسی سے بیگار نہیں لیتے تھے، یہ تو جابر بادشاہوں کی ایجاد ہے، جو اس وقت تک چل رہی ہے، چوتھی دلیل یہ ہے کہ اہل علم اہلِ مغازی وسیر، محدثین، وفقہاء ومفسرین میں سے کسی نے اس دستاویز کا ذکر نہیں کیا ہے، اور نہ سلف کے زمانہ میں کبھی وہ نکالی گئی، بہرحال یہ دستاویز بالکل بناوٹی اور بے اصل ہے، اور جعلی ہونے کی داخلی شہادتیں موجود ہیں، شیخ الاسلام کی اس تحقیق سے یہ طلسم ٹوٹ گیا، اور اس جعل کی قلعی کھل گئی۔[1]

ان کے تبحر علمی اور ذہانت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ان کے ایک معاصر شیخ صالح تاج الدین بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حاضر ہوا، ایک یہودی نے تقدیر کا ایک مسئلہ پوچھا تھا، اور اپنا سوال واعتراض آٹھ شعروں میں لکھ کر بھیجا تھا، شیخ نے تھوڑی دیر تأمل کیا، پھر جواب لکھنا شروع کیا، ہم حاضرین مجلس یہ سمجھتے رہے کہ وہ اس کا نثر میں جواب دے رہے ہیں، جب وہ فارغ ہوئے تو کسی نے کاغذ اٹھا کر دیکھا اور ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ ٹھیک اسی قافیہ ردیف میں شیخ نے ۱۸۴ اشعار میں برجستہ اس کا جواب دیا تھا، اس جواب میں اتنے علوم آگئے تھے، کہ اگر ان کی شرح وتفصیل کی جائے تو دو ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔[2]

اس تبحر علمی اور جامعیت کو دیکھ کر ان کے معاصرین اور متأخرین نے ان کے متعلق نہایت بلند کلمات کہے ہیں، اور ان کو نادرۂ روزگار، سرآمد محققین، آخر المجتہدین اور آیۃٌ من آیات اللہ شمار کیا ہے، ابن سید الناس (م ۷۳۴ھ) کہتے ہیں "لم تر عین من رأہ مثلہ ولا رأت عینہ مثل نفسہ"[3] (ان کے معاصرین اور دیکھنے والوں نے ان کا جیسا نہیں دیکھا، اور نہ انھوں نے خود اپنی نظیر دیکھی)

---

[1] زاد المعاد ج ا ص ۳۳۶ فصل واما ھدیہ فی عقد الذمۃ واخذ الجزیۃ۔ الخ [2] الکواکب ص ۱۵۴ [3] ایضاً

حافظ شمس الدین الذہبی جیسے وسیع النظر مورخ اور نقّاد مبصر نے یہاں تک فرمایا ہے :۔

لو حلّفت بین الرکن والمقام لحلفت	اگر رکن و مقام ابراہیم کے درمیان مجھے قسم دے کر
انّی ما رأیت بعینی مثلہ ولا واللہ	پوچھا جائے تو میں حلفیہ کہوں گا کہ نہ میں نے علم میں
رای ھو مثل نفسہ فی العلم۔	ان جیسا دیکھا نہ انھوں نے اپنا جیسا دیکھا۔

شجاعت اور فکری استقلال

ابن تیمیہ کی شجاعت و دلیری اور موت سے بے خوفی ان کے تمام معاصرین حتیٰ کہ ترک سرداروں اور فوجی افسروں کے لئے بھی حیرت انگیز تھی، مغلوں کے مقابلہ میں انھوں نے جس شجاعت و جوانمردی اور جس جرأت و بیباکی کا اظہار کیا اس پر خود قبچق کو جو اپنے زمانہ کا مشہور ترک فوجی افسر اور امیر تھا سخت حیرت تھی، حافظ سراج الدین کے الفاظ ہیں :۔

وکان اذا رکب الخیل یجول فی العدوّ	جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو دشمن کی صفوں
کأعظم الشجعان ویقوم کأثبت	میں اس طرح گھومتے تھے جیسے بڑے سے بڑا بہادر
الفرسان وینکی العدوّ من کثرۃ	اور اس طرح کھڑے رہتے تھے جیسے بڑے سے بڑا
الفتك بھم و یخوض بھم خوض	ثابت قدم شہسوار، وہ دشمن کو اپنے حملوں سے چور
رجل لا یخاف الموت۔[1]	کر دیتے تھے، اور اس بے تکلفی سے فوج میں گھس
	جاتے تھے جیسے ان کو موت کا کوئی ڈر نہیں۔

لیکن یہاں ان کی اس شجاعت کا تذکرہ مقصود نہیں جو جنگ کے میدان اور سلاطین کے مقابلہ میں کلمۂ حق بلند کرنے میں ان سے ظہور میں آئی، اس کی کچھ تفصیل پچھلے اوراق میں گزر چکی ہے،

---

[1] الکواکب ص۱۶۱

یہاں ان کی اس شجاعت کا اظہار مقصود ہے، جو قلمی معرکوں، علمی میدان اور تحقیق اور اظہارِ حق میں ان سے ظاہر ہوئی۔

اہلِ علم ناظرین کو اس کا اندازہ ہے کہ اکثر مسائل میں وہ منفرد نہیں، ان مسائل پر پہلے بھی بحثیں ہوئی ہیں، اور رسائل لکھے گئے ہیں، اور ان کے زمانہ میں بھی ان کے متعدد معاصران کے ہم خیال تھے، مگر جس جرأت و شجاعت اور جس صاف گوئی اور بلند آہنگی کے ساتھ انھوں نے اپنے خیالات و تحقیقات کا اعلان کیا، اور تقریر و تحریر میں بے محابا بیان کیا، وہ ان کا خاص حصہ تھا، توحید خالص کی وضاحت، استغاثہ و استعانت لغیر اللہ کی تردید، بدعات و منکرات زمانہ کی مخالفت، وحدۃ الوجود اور حلول و اتحاد کے خلاف قلمی و لسانی جہاد، مدعیانِ تصوف اور متدعین کی تلبیسات کی پردہ دری میں انھوں نے جس شجاعت و بے خوفی کا اظہار کیا، اور جن مسائل و تحقیقات کو وہ حق سمجھتے تھے، خواہ وہ کلامی مباحث سے متعلق ہوں یا فقہی مذاہب سے، ان کو جس طرح انھوں نے مدلّل و پرزور طریقہ پر بیان کیا، اور ان کے ثبوت کے لئے جو مقدمات و دلائل قائم کئے اور آخر دن تک جس طرح اپنے ان خیالات و عقائد پر قائم رہے، اور ان کے راستہ میں تکلیفیں برداشت کیں، اس سے ان کی نہ صرف شجاعت و استقامت بلکہ عظمت و امامت کا ثبوت ملتا ہے، ذہبی ان کی اس علمی و دینی شجاعت و استقامت کا ذکر ان مدّاحانہ الفاظ میں کرتے ہیں:۔

اطلق عبارات احجم عنہا الاولون	انھوں نے اپنے مفہوم کے لئے ایسی تعبیرات استعمال
والآخرون وھابوا وجسر ھو علیھا	کیں، جن کی متقدمین و متأخرین کو جرأت نہیں ہوسکی
حتّٰی قام علیہ خلقٌ من علماء مصر	تھی، یہاں تک کہ نتیجہ یہ نکلا کہ مصر و شام کے علماء کا
والشام قیامًا لامزید علیہ وبدّعوہ،	ایک انبوہ ان کا مخالف ہوگیا، اور اس نے ان کی
وناظروہ وکاتبوہ وھو ثابتٌ	مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ان علماء نے

لايداهن ولايحابي بل يقول الحق المرّ	ان پر بدعت کاالزام لگایا، مناظرے کئے، مراسلت
الذي اداه اليه اجتهاده وحدّة ذهنه	کی، لیکن وہ ان تمام حالتوں میں اپنے خیال اور عقیدے
وسعة دائرته في السنن والاقوال مع	پر قائم رہے، نہ انھوں نے مداہنت کی نہ کسی کی رورعایت؛
ما اشتهر عنه من الورع وكمال الفكر	بلکہ وہی سچی کڑوی بات کہتے رہے تو جو ان کے اپنے
وسرعة الادراك والخوف من الله	اجتہاد، غور وفکر، ذکاوت اور سنن واقوال پر وسیع نظر
العظيم والتعظيم لحرمات الله فجرى	کی بنا پر سمجھ میں آئی تھی، تنہا یہی بات نہیں تھی، بلکہ
بينه وبينهم حملات حربية ووقعات	اس کے ساتھ ان کا زہد وورع، بالغ نظری، سرعتِ فہم،
شامية ومصرية وكم من نوبة رموه عن	خوفِ خدا، حدود واحکامِ الٰہی کا ادب وتعظیم بھی شامل
قوس واحدة فنجيه الله[1]	تھی، ان کے اور ان کے معاصرین ومخالفین کے
	درمیان بڑے بڑے معرکے اور شام ومصر میں بڑے
	بڑے مقابلے ہوئے، کتنے بار اس کی نوبت آگئی کہ
	سب گروہ ایک طرف تھے، اور وہ تنہا ایک طرف،
	پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے مخالفین کے ضرر سے بچالیا۔

ابن تیمیہؒ اپنے معاصرین میں اپنے علمی تبحّر میں ضرور ممتاز تھے، جیسا کہ ان کے معاصرین نے بلند کلمات میں اس کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کا اصلی امتیاز جس نے ان کو اپنے نامور اور فاضل معاصرین میں یگانۂ روزگار اور تاریخ میں زندۂ جاوید اور یادگار بنا دیا، وہ تنہا ان کا علمی تبحّر نہ تھا، بلکہ ان کا فکری استقلال، ذوق تحقیق اور مجتہدانہ طرز تھا، انھوں نے ان ہی علوم وفنون کا اور انہی کتابوں کا مطالعہ کیا، جن کا ان کے اکثر معاصرین نے مطالعہ کیا تھا، مگر انھوں نے انہی علوم اور کتابوں کے اندر اپنی

---

[1] الرد الوافر ص ۷۱

راہ پیدا کر لی، اور جلد خصوصی مقام حاصل کر لیا، نحو سب نے پڑھی تھی، اور سب سیبویہ کو واجب التقلید امام اس کے قول کو حرف آخر مانتے تھے، لیکن ابن تیمیہ نے "الکتاب" کا بھی (جس کو علمائے نحو، نحو کا صحیفہ اور ناسخ کتب مانتے ہیں) ناقدانہ مطالعہ کیا تھا، ابوحیان نحوی نے جب سیبویہ کا حوالہ دیا، تو انھوں نے صاف کہا کہ کیا سیبویہ کوئی نبی تھا جس پر نحو اتری ہے، اس نے "الکتاب" میں ۸۰ مقامات پر غلطی کی ہے، یونانی منطق و فلسفہ کے مطالعہ سے ان کے زمانے کے اکثر علماء و فقہاء محتاط تھے، اور جنھوں نے مطالعہ کیا تھا، وہ اس سے کم و بیش متأثر تھے، حد یہ ہے کہ فلسفہ کے سب سے بڑے ناقد اور مسلمانوں میں اس کے نبض شناس حجۃ الاسلام غزالی اپنی تصنیفات حتیٰ کہ "احیاء العلوم" کو یونانی الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق کے اثرات سے کلی طور پر محفوظ نہ رکھ سکے، اور ان کی بہت سی تصنیفات میں مؤرخین فلسفہ کو یونانی فلسفہ کی جھلک اور پرچھائیاں نظر آئی ہیں[1]، لیکن ابن تیمیہ نے یونانی منطق اور فلسفہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، اور اس سے وہ کہیں سمجھوتہ کرتے نظر نہیں آتے، انھوں نے کتاب "الرد علی المنطقیین" میں یونانی منطق و فلسفہ کے مسلّم الثبوت مسائل و مقدمات پر ناقدانہ بحث کی ہے، اور ان پر عمل جراحی کر کے اس کے پورے نظام کو مجروح اور اپنے اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کر کے رکھ دیا ہے، فقہ و حدیث میں بحث و نظر کے عرصہ سے کچھ محدود دائرے بن گئے تھے، جن سے باہر قدم نکالنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا، اور عرصۂ دراز سے اس ذخیرہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا، ابن تیمیہ نے بہت سے فقہی مسائل پر، جو طے شدہ سمجھے جاتے تھے، از سر نو غور کیا، اور اپنی تحقیقات کے نتائج پوری شجاعت اور علمی سنجیدگی کے ساتھ پیش کئے جس کا اثر یہ ہوا کہ دماغوں اور علمی حلقوں کی ساکن سطح میں پھر جنبش پیدا ہوئی، اور غور و فکر کا دروازہ کھلا، آخر میں انھوں نے استقلالاً محض کتاب و سنت اور آثار صحابہ کی بنا پر فتوے دینے شروع کئے، حافظ ذہبی ان کی زندگی میں لکھتے ہیں:

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "فلسفۃ الاخلاق فی الاسلام وصلاتہا بالفلسفۃ الاغریقیۃ" اور "تاریخ الاخلاق" از ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ۔

ولہ الآن عدۃ سنین لا یفتی بمذہب	ادھر وہ کئی سال سے (مذاہب اربعہ میں سے) کسی
معین بل بما اقام الدلیل علیہ ولقد	مذہبِ معین کے مطابق فتوے نہیں دیتے، بلکہ جس
نصر السنۃ المحضۃ والطریقۃ	مذہب کی دلیل پاتے ہیں، اس کے مطابق فتوی دیتے
السلفیۃ ببراھین ومقدمات	ہیں، انھوں نے سنتِ خالصہ اور طریقۂ سلف کی
وامور لم یسبق الیہا۔[1]	نصرت میں ایسے دلائل، مقدمات اور وجوہ قائم
	کئے جن میں وہ منفرد ہیں، کسی نے اس سے پہلے ایسے
	دلائل و مقدمات قائم نہیں کئے۔

ان "اجتہادات" میں وہ کبھی کبھی منفرد بھی نظر آتے ہیں، ان سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں، جیسے کہ ہر غیر معصوم سے ہوتی ہیں، ان کے دلائل ہر مسئلہ میں ضروری نہیں کہ قوی اور واجب التسلیم ہی ہوں، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں مخلص تھے، وہ نفس پرستی، خواہشات کی پیروی، سہولت پسندی یا کسی مصلحت کی خاطر کسی امام کے مسلک، کسی مذہب فقہی یا جمہور کے قول کو ترک اور کسی مسئلہ کا استنباط نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ طالبِ حق، دلیل کے پابند اور کتاب و سنت کے متبع تھے، اس بارہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی صاحبِ "فتح الباری" کا یہ ارشاد قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

انہ شیخ مشائخ الاسلام فی عصرہ	وہ بلاشبہہ اپنے زمانہ کے شیخ المشائخ تھے جن مسائل
بلاریب والمسائل التی أنکرت علیہ	میں ان پر اعتراض ہوا ہے، وہ بھی انھوں نے نفسانیت
ما کان یقولہا بالتشھی ولا یصر علی	کی بنا پر نہیں کئے، عموماً جب ان کو اس کی دلیل
القول بہا الابعد قیام الدلیل علیہ	پر اطمینان ہو جاتا تھا جب وہ ان پر اصرار کرتے
غالباً فالذی اصاب فیہ وھو الاکثر	تھے، جن مسائل میں وہ برسرِ حق ہیں، اور وہی تعداد

[1] الرد الوافر ص ۱۷

سیستفاد منہ ویترحّم علیہ بسببہ والّذی اخطأ فیہ لایقلّد فیہ بل ھو معذور لأن ائمّۃ عصرہ شھد والہ بأن ادوات الاجتہاد فیہ حتی کان أشدّ المتعصبین علیہ والعاملین فی ایصال الشرالیہ وھوالشیخ جمال الدّین الزملکانی شھد لہٗ بذالک[1]۔

میں زیادہ بھی ہیں، اس میں ان سے استفادہ کرنا چاہئے، اور ان کی بنا پر ان کے حق میں دعائے خیر کرنی چاہئے جن مسائل میں ان سے غلطی ہوئی، ان میں ان کی تقلید نہیں کرنی چاہئے، وہ ان میں معذور ہیں، اس لئے کہ ان کے زمانہ کے اکابر علما نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان میں شرائط اجتہاد موجود تھے یہاں تک کہ ان کے ایک بہت بڑے حریف جو ان کے درپئے آزار بھی رہتے تھے یعنی شیخ جمال الدین الزملکانی وہ بھی اس کے معترف ہیں۔

اخلاص وانہماک

ابن تیمیہ کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ علمِ دین کی خدمت کے لئے ہمہ تن وقف تھے، انھوں نے زندگی بھر کسی اور چیز سے سروکار نہیں رکھا، ان کے اکثر معاصرین، رفقاء اور ہم عمر جن میں بڑے بڑے مخلص، بڑے بڑے فاضل تھے، حکومت کے مختلف عہدوں پر سرفراز رہے، یا انھوں نے کوئی دینی منصب یا انتظامی ذمہ داری قبول کی، یا عطیۂ سلطانی یا خلعتِ شاہانہ یا انعام واکرام سے سرفراز ہوئے یا حکومت کے وظیفہ خوار رہے لیکن ابن تیمیہ کا دامن ساری عمر ان آلائشوں سے پاک رہا، انھوں نے علم ودین کے اشتغال، افتاء، درس وتدریس، وعظ وارشاد اور تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدقیق کے سوا کسی مشغلہ سے تعلق ہی نہیں رکھا، ان کے ایک معاصر ان کی اس علمی یکسوئی،

---

[1] الردالوافر ص۳۸

دینی انہماک، اور دنیا سے بے لوثی و بے تعلقی کی شہادت ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

ماخالط الناس فی بیع ولاشراء ولا
معاملة ولاتجارة ولامشارکة ولامزارعة
ولاعمارة ولاکان ناظراً او مباشر المال
وقف، ولم یقبل جرایة ولاصلة لنفسه
من سلطان ولا امیر ولاتاجر ولاکان
مدّخراً دیناراً ولادرهماً ولامتاعاً ولا
طعاماً وانّما کانت بضاعته مدة حیاته
ومیراثه بعد وفاته رضی الله عنه
العلم اقتداءً بسید المرسلین، فانّه قال
ان العلماء ورثة الانبیاء، ان الانبیاء
لم یورثوا دیناراً ولادرهماً ولکن
ورثوا العلم فمن اخذ به اخذ بحظ
وافر[1]

انھوں نے لوگوں کے ساتھ بیع وشراء معاملہ
تجارت، شرکت، زراعت، عمارت وغیرہ کسی قسم کا
تعلق نہیں رکھا، نہ کبھی کسی مال وقف کے نگراں
یا متولی رہے نہ کبھی انھوں نے حکومت کا وظیفہ یا کسی
سلطان، حاکم یا تاجر کی پیش کش قبول کی، نہ کبھی انھوں
نے دینار و درہم یا سامان یا خوراک جمع کی، ان کا
سرمایہ اور ان کی پونجی جب تک وہ زندہ رہے
اور جب انتقال کیا تو ان کی میراث بھی علم
تھا اور یہ سنت نبوی ہے، کیونکہ آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، علماء وارثین
انبیاء ہیں انبیاء نے دینار و درہم کبھی اپنی میراث
میں نہیں چھوڑے انھوں نے علم کی میراث چھوڑی،
جس کو یہ میراث ملی وہ بڑا خوش نصیب ہے۔

صاحب "الکواکب الدریۃ" معتبر لوگوں سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

انه کان قد قطع جُلّ وقته وزمانه
فی العبادة حتی انه لم یجعل لنفسه
شاغلة تشغله عن الله وما یزاوله

انھوں نے اپنا سارا وقت اور پورا زمانہ عبادت
میں مصروف کر رکھا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے
اپنی ذات کے لئے کوئی دوسرا شغلہ ہی اختیار

[1] الکواکب الدریہ ص ۱۵۶، ۱۵۷

لامن اھل ولامن مال[1] | نہیں کیا، جوان کو اللہ تعالیٰ سے مشغول کرے اور جس میں وہ منہمک ہوں، نہ گھر والے نہ مال۔

ان کے مشاغل وافکارِ علم ودین کے انہماک اور مصروف زندگی نے (جس کا خاصہ حصہ جیل و نظر بندی میں گذرا) ان کو اس کی بھی مہلت نہ دی کہ وہ نکاح کریں، انھوں نے ساری عمر تجرّد اور طالب علمانہ و مجاہدانہ زندگی میں گزار دی، صاحبِ "الکواکب الدریۃ" ان کے روزمرہ کے معمولات اور نظام الاوقات اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

ولایزال تارۃً فی افتاء النّاس وتارۃً فی قضاء حوائجھم حتیٰ یصلی الظھر مع الجماعۃ ثم کذالک بقیۃ یومہ ثم یُصلّی المغرب ویقرأعلیہ الدرس ثم یُصلّی العشاء ثم یقبل علی العلوم الی ان یذھب طویل من اللیل وھو فی خلال ذلک کلہ اللیل والنھار لایزال یذکر اللہ تعالیٰ ویوحّدہ ویستغفرہ۔[2]

وہ کبھی فتویٰ دینے میں مشغول ہوتے کبھی لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں یہاں تک کہ ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے، پھر دن کا باقی حصہ اسی طرح گزرتا، پھر مغرب پڑھتے، اور اسباق شروع ہو جاتے، پھر عشاء پڑھتے پھر درس و مطالعہ شروع ہو جاتا یہاں تک کہ بڑی رات گزر جاتی، وہ اس اثناء میں دن میں بھی اور رات میں بھی برابر اللہ تعالیٰ کے ذکر اور کلمۂ توحید واستغفار میں مشغول رہتے۔

علم اگر کسی مدرس یا مفتی کے لئے ایک ضرورت، وقتی مشغلہ اور خدمت کی حیثیت رکھتا ہو، تو ابن تیمیہ کی وہ غذا اور اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا، اور ان کی طبیعتِ ثانیہ ہو گیا تھا، شیخ سراج الدین ابو حفص البزار فرماتے ہیں:۔

وکان العلم کأنہ قد اختلط بلحمہ ودمہ | ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم ان کے رگ و ریشہ میں سرایت

---

[1] الکواکب الدریۃ ص ۱۵۶ [2] ایضاً۔

وسائرہ فانہ لم یکن مستعاراً بل کان لہ شعاراً ودثاراً۔[1]

گر گیا ہے اور گوشت پوست بن گیا ہے، علم ان کے لئے کوئی عارضی اور وقتی مانگے کی چیز نہیں تھی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

ان کے اخلاص وللہیت کی ایک بڑی دلیل یہ تھی کہ انھوں نے اپنے حریفوں اور بدخواہوں کو ہر موقع پر معاف کیا اور صاف اعلان کر دیا کہ "احللت کل مسلم عن ایذائہ لی" السلطان الناصر کی واپسی کے بعد اس کے اصرار کے باوجود انھوں نے اپنے سب سے بڑے حریف قاضی ابن مخلوف کو جس طرح معاف کیا، اور سلطان سے ان کی اور تمام شرکاء وعلمائے سلطنت کی جس طرح تعریف وسفارش کی، اس سے ان کی بے نفسی، عالی ظرفی اور اخلاص کا اندازہ ہوتا ہے، اور ثابت ہوتا ہے کہ ان کا سارا اختلاف علمی ودینی بنیاد پر تھا، اس میں نفسانیت اور ذاتیات کا شائبہ بھی نہ تھا، اس اخلاص وانہماک کا نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے ۶۷ سال کی مصروف اور پُر از حوادث واقعات اور تلاطم خیز زندگی میں تصنیفات وتحقیقات اور علمی آثار کا ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا جو اہلِ علم کی ایک پوری جماعت کے لئے سرمایۂ فخر بن سکتا ہے، اسی اخلاص وانہماک کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے زمانہ پر ایسے دیرپا اثرات چھوڑے کہ وہ بجا طور پر ایک نئے دور کے بانی اور ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک کہے جا سکتے ہیں۔

ان کی تصنیفی خصوصیات

ابن تیمیہ کی تصنیفات کچھ منفرد خصوصیات رکھتی ہیں، جو اس عصر کی عام تصنیفات سے ان کو نمایاں طور پر ممتاز کرتی ہیں، اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی صدیاں گذر جانے کے بعد اور بڑے اہم علمی و

---

[1] الکواکب الدریہ ص۱۵۶

ذہنی انقلابات کے باوجود وہ ابھی تک نئی نسل کے دل و دماغ کو متأثر کرتی ہیں، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس عقلیّت پسند اور جدّت طلب دور میں وہ از سر نو مقبول ہو رہی ہیں، ان خصوصیات میں چار چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ ابن تیمیہ کی تقریباً ہر تصنیف کے ناظر پر یہ اثر پڑتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف مقاصدِ شریعت اور روحِ دین کا راز داں ہے، اس کے ہاتھ میں دین کے سرے (اطراف و اصول) آگئے ہیں، اس لئے ہر مبحث میں اس کی بحث اصولی و مرکزی، تشفی بخش، اطمینان آفریں اور موجبِ یقین ہوتی ہے، وہ جزئیات کے بجائے اصول پر زور دیتے ہیں اور بحث کا اس طرح آغاز کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی دین کا مزاج اور اس کی روح ہے، اور بداہتہً و اضطراراً شریعت محمدی کا تقاضا ہے، اپنے معاصرین اور دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں ان کے تفوّق کا راز یہی مقاصدِ شریعت اور روحِ دین کی واقفیت اور ان کی کامیاب ترجمانی ہے، جو ان کی ہر چھوٹی بڑی تصنیف میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے، خصوصاً جب وہ عقائد اور اہم کلامی و فقہی مسائل پر بحث کرتے ہیں۔

۲۔ ان کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں زندگی نظر آتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کتابیں کسی علمی گوشہ یا الگ تھلگ جزیرہ میں نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ عین زندگی کے میدان اور عوام کے بیچ میں لکھی گئی ہیں، ان کی کتابوں سے آسانی کے ساتھ ان کے زمانہ کا تعین کیا جاسکتا ہے، اور اس سوسائٹی کے ذہن و اخلاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس سے ان کا مصنف متعلق تھا۔[1] پھر ان کتابوں سے ان کے جذبات، جوش، پسندیدگی و ناپسندیدگی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصنف دل و دماغ اور انسانی احساسات و جذبات رکھنے والا

---

[1] نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اصحاب الجحیم"۔

انسان تھا محض آلۂ کتابت یا عقلِ محض نہ تھا۔

ان کے طریقۂ تفسیر کی بھی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے ربط ہے، ان کا مصنف آیاتِ الٰہی کو اپنی گرد و پیش کی زندگی اور اپنے معاصر انسانوں پر منطبق کرتا ہے اور ان آیات کے نقطۂ نظر سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے، اور اپنے ہم عصروں اور امت کے مختلف طبقوں کا احتساب کرتا ہے، وہ بتلاتا ہے کہ ان آیات و حقائق سے زندگی میں کہاں انحراف ہو رہا ہے، اور اس کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں[1]، زندگی کے اس وصف نے ان کی تصنیفات کو ایک طویل زندگی، تاثیر اور دل آویزی بخش دی ہے، جو دوسری تصنیفات میں کمیاب اور اکثر نایاب ہے۔

۳۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس پر اتنا مواد اور مسالہ جمع کر دیتے ہیں، جو بیسیوں کتابوں اور سیکڑوں صفحات میں منتشر ہوتا ہے، ان کا یہ طرزِ تصنیف (جو انسائیکلوپیڈیائی طرز کہلایا جا سکتا ہے) ان کی تمام تصنیفات کا نمایاں وصف ہے، خواہ وہ نقلی مباحث پر ہوں یا عقلی مباحث پر، اس طرح ان کی کتابوں میں یکجا اتنا مواد مل جاتا ہے کہ ان کی ایک کتاب اکثر ایک کتب خانہ کی قائم مقام بن جاتی ہے، اور طالبِ علم کو بہت سی کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے[2]، اکثر اس مواد اور نقول کے پیش کرنے میں بحث کا سرا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، اور مطالعہ کرنے والا اقوال و نقول کی کثرت میں گم ہو جاتا ہے، اور اس کو بحث کا سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے، اس دشواری کے باوجود ان کی کتابوں کے اس افادی پہلو کی تحقیر نہیں کی جا سکتی کہ وہ متقدمین و معاصرین کے اقوال و آراء کا ایک مخزن اور اپنے موضوع پر ایک چھوٹا سا "دائرۃ المعارف" ہیں، یہ ان کا بڑا علمی احسان ہے کہ انھوں نے بہت سا قدیم مواد و مسالہ محفوظ کر دیا اور بہت سے آراء و افکار کو اپنی کتابوں میں نقل کر کے ضائع ہونے سے بچا لیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ النور، سورۃ الاخلاص وغیرہ [2] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو "منہاج السنۃ" اور "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح"۔

۴۔ ان کی کتابیں عام کلامی وفقہی تصنیفات سے اس لحاظ سے بھی ممتاز ہیں کہ ان میں اس موضوع کی کتابوں کی طرح خشکی، پیچیدگی، اور "متون" کی شان نہیں ہے، جن میں بالعموم ہر لفظ بندھا ٹکا اور قانونی ہوتا ہے ابن تیمیہ کی تصنیفات میں سلاست، زور، عربیت، اور کہیں کہیں (بلا قصد) بلاغت و ادبیت اور خطابت کی شان پیدا ہو جاتی ہے، جو ان کی کتابوں کو (جو اکثر ضخیم دفتر ہیں) دلچسپ، جاندار اور پرزور بنا دیتی ہے، خصوصاً جب وہ سلف کے طریق کی ترجیح اور ان کی دینی و علمی و عملی و فکری فضیلت و تفوق پر بحث کرتے ہیں، تو ان کے قلم میں بڑا زور اور ان کی بحث میں "رجز" کی شان پیدا ہو جاتی ہے، ان کے معاصرین اور سوانح نگاروں نے ان کے حالات و کمالات کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ ان کی بلاغت و خطابت کا تذکرہ کیا ہے، حافظ ابو حفص کہتے ہیں:۔

یجری کما یجری التیار ویفیض کما یفیض	ان کے کلام میں سیلاب کی سی روانی اور سمندر کی سی
البحر ویصیر منذ یتکلم الی ان یفرغ کالغائب	طغیانی ہوتی ہے گفتگو کے آغاز سے لے کر اختتام تک
عن الحاضرین، مغمضاً عینیہ ویقع	وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہیں ہیں، وہ آنکھیں
علیہ اذ ذاک من المہابۃ ما یرعد القلوب	بند کر لیتے ہیں، اور تقریر فرماتے ہیں، اس وقت ان پر
ویحیّر الابصار والعقول[1]۔	ایسا وقار و جلال سا طاری ہوتا ہے کہ مجلس پر ایک
	رعب سا چھایا ہوا ہوتا ہے۔

ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کی روانی اور علم کی طغیانی ان کی مجلس ہی سے مخصوص نہیں، ان کا قلم بھی ان کی زبان کا شریک ہے، اقشہری نے اپنے سفر نامہ میں اپنا یہی تأثر ظاہر کیا ہے، وہ لکھتا ہے "وقلمہ ولسانہ متقاربان" (ان کا قلم اور ان کی زبان ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔)

ان محاسن کے ساتھ ساتھ ایک مؤرخ و نقاد کے لئے اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان کی کتابو

---

[1] الکواکب ص ۱۵۵

اور مباحث میں انتشار، ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال اور ادنیٰ مناسبت سے ایک دوسری بحث کا آغاز اور طوالت و اطناب بہت پایا جاتا ہے، جو ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والے کے لئے (خصوصاً ان کے طرزِ تصنیف اور اسلوبِ کلام کا عادی نہ ہو) سخت ابتلا و امتحان کا سبب بن جاتا ہے، اس کا بڑا سبب تو ان کی حدّت ذہن، فرطِ ذکاوت، وفورِ علم اور جوش طبیعت ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اور قلم بحث کرتے وقت ایک نقطہ پر جمنے نہیں پاتا، مضامین کا ورود اور انتقال ذہن اس شدّت و سرعت کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ محدود نہیں رہ سکتے، یہی ان کے درس کی خصوصیت تھی، ان کے شاگرد ابو حفص البزار کہتے ہیں:-

کان ابن تیمیۃ اذا شرع فی الدرس یفتح	ابن تیمیہ جب درس کا آغاز کرتے تو اللہ تعالےٰ
اللہ علیہ اسرار العلوم وغوامض ولطائف	ان پر علم کے اسرار، باریک باتیں، لطیف نکات،
ودقائق وفنون ونقول واستدلالات	دقیق مسائل، فنون، علماء کے اقوال ونقول اور
بآیات واحادیث واستشھاد باشعار	کلام عرب کے شواہد وامثال کا دہانہ کھول دیتا
العرب وھو مع ذالک یجری کما یجری	اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ ایک سیلاب اور ایک
التیار ویفیض کما یفیض البحر۔[1]	دریا امنڈ رہا ہے۔

اسی انتقال ذہنی، وفور مضامین ودلائل اور ذہنی تموّج کی وجہ سے ان کے مناظرین کو مجلسِ مناظرہ میں بڑی دقّت پیش آتی تھی، وہ اپنے بحث و مناظرہ میں اتنے مسائل چھیڑ دیتے اور اتنے علوم داخل کر لیتے کہ ان کے حریف کو ایک مرکوز و منضبط بحث کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی، اسی وجہ سے شام اور مصر میں علماء وفقہاء عمومی مجلسوں میں ان سے بحث و مناظرہ کرنے سے احتراز کرتے، اور اکثر معذرت کر دیتے، اس دشواری کو ان کے ایک فاضل ہم عصر اور مناظر شیخ صفی الدین الہندی

---

[1] الکواکب ص ۱۵۵

نے ان الفاظ میں بیان کیا:۔

ما اراک یا ابن تیمیہ الا کالعصفور حیث	ابن تیمیہ تم ایک چھوٹی چڑیا یا (کنجشک) کی طرح ہو
اردت ان اقبضہ من مکان فرّ إلی	جب میں اس کو ایک جگہ سے پکڑنا چاہتا ہوں وہ
مکان آخر[1]	اڑکر دوسری جگہ جا پہنچتی ہے۔

ان کی یہ مزاجی خصوصیت (جو کسی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک زیادتی اور کمال، وفور ذکاوت و علم کا نتیجہ ہے) ان کی تصنیفات میں بھی پائی جاتی ہے، طالبِ صادق اگر صبر و ہمت سے کام لے اور اس دشواری پر عبور حاصل کرے تو اس بحر موّاج سے بڑے قیمتی موتی نکال سکتا ہے۔

لہ نزہۃ الخواطر ج ۲ صفحہ ۱۴۰۔ ترجمہ محمد بن عبدالرحیم الارموی (الشیخ صفی الدین الہندی)۔
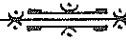
ان غیر معمولی علمی و ذہنی کمالات اور مسلّم اخلاص و تدیّن کے ساتھ ایک سلیم الطبع انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین اور بعض متأخرین نے کیوں اس شدت سے ان کی مخالفت کی[1]، اور ان کی ذات ان کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کیوں موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے؟ ایسے جامع کمالات انسان کی عظمت و قبولیت پر تو سب کا اتفاق ہونا چاہیئے! یہ سوال حق بجانب ہے، اور اس کا مستحق ہے کہ ان کی سیرت اور ان کی معاصر تاریخ کی روشنی میں سنجیدگی سے اس کا جواب دیا جائے۔

۱۔ اوّلاً تو یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے کہ ان کی ذات کے بارے میں شروع سے دو فریق بنے ہوئے ہیں، اور ان میں حریفانہ کشمکش جاری ہے، تاریخ میں جو شخصیتیں بہت ممتاز، غیر معمولی اور خارق عادت کمالات کی حامل ہیں، ان کے بارے میں ہمیشہ سے یہی طرزِ عمل رہا ہے کہ ایک گروہ ان کے معتقدین کا بن گیا ہے، جو ان کی تعریف میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتا ہے، دوسرا گروہ ناقدین و

[1] یاد رہے کہ مخالفت اور اختلاف میں فرق ہے، اختلاف اہلِ علم اور اہلِ تحقیق کا حق ہے اور یہ حق کسی دور میں علماء سے سلب نہیں کیا جا سکتا، یہاں اختلاف سے نہیں، بلکہ مخالفت تضلیل و تکفیر کے اسباب سے بحث ہے۔

مخالفین کا ہے، جو ان کی تنقید بلکہ تنقیص میں انتہا پسند اور غالی نظر آتا ہے، عظیم الشان اور غیر معمولی شخصیتوں کے بارے میں تاریخ کا یہ ایک ایسا مسلسل اور متواتر تجربہ ہے کہ بعض فلاسفۂ تاریخ اور نفسیات "عظمت و عبقریت" کے مبصّرین نے اس کو قاعدہ کلیہ اور شرط عظمت و عبقریت قرار دیا ہے۔

۲۔ ابن تیمیہ کی ذات میں ان کے معاصرین کے لئے سب سے بڑا ابتلا اور امتحان یہ تھا کہ وہ اس زمانہ اور اس نسل کی عام ذہنی و علمی سطح سے بلند تھے، اپنے زمانہ کی سطح سے بلند ہونا ایک نعمتِ خداداد اور ایک قابلِ رشک کمال ہے، مگر اس کمال کی صاحبِ کمال کو بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، وہ صاحبِ کمال اپنے معاصرین کی طرف سے ایک مسلسل ابتلاء اور آزمائش میں رہتا ہے، اور وہ معاصرین اس صاحبِ کمال کی طرف سے زندگی بھر ایک مصیبت اور زحمت میں مبتلا رہتے ہیں، وہ اس کی تازگیٔ فکر، بلندیٔ نظر، قوتِ اجتہاد کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور اس کے آفاق علم و فکر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی، اور وہ ان کے معیّن و محدود اصطلاحات اور مدرسی حدود میں مقید نہیں رہ سکتا، وہ علم و نظر کی آزاد فضائل اور قرآن و حدیث کے بلند اور وسیع آفاق میں آزادانہ پرواز کرتا ہے، ان کا مبلغ علم متقدمین اور اہلِ درس کی کتابوں کا سمجھ لینا ہوتا ہے، وہ واضع علوم اور بہت سے فنون کا مجتہد و مجدّد ہوتا ہے، غرض مدارک اور استعدادوں کا یہ تفاوت اس کے اور اس کے مخلص معاصرین کے درمیان ایسی کشمکش پیدا کر دیتا ہے کہ یہ گتھی کبھی سلجھتی نہیں، اور وہ کبھی اپنے معاصرین کو مطمئن نہیں کر سکتا، ہر زمانہ کے صاحبِ کمال اور مجتہد الفن علماء نے اس کی شکایت کی ہے کہ ان کی تحقیقات اور علوم و مضامین ان کے زمانہ کی علمی و نصابی سطح سے بلند اور ان اہلِ علم کی دسترس سے باہر ہیں، جن کی پروازِ فکر متداول کتابوں سے آگے نہیں، اور یہی بہت سے اہلِ علم کی مخالفت کا

سبب اور محرک ہے۔[1]

۳۔ مخالفین کا ایک گروہ اس بنا پر مخالف تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت و علم، اپنی شخصیت کی دلآویزی اور بلندی کی وجہ سے عوام و خواص میں مقبول اور حکومت کے اشخاص پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں، اور ان کے علم و تقریر کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا، وہ جہاں رہتے ہیں، سب پر چھا جاتے ہیں، درس دیتے ہیں تو درس کی دوسری محفلیں بے رونق ہو جاتی ہیں، تقریر کرتے ہیں تو علم کا دریا امنڈتا نظر آتا ہے، ذہبی نے اس معنی خیز فقرہ میں دلوں کی اس چھپی ہوئی بات کو آشکارا کر دیا ہے۔

غیر انہٗ یغترف من بحر وغیرہ من	ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو سمندر سے پانی لیتے
الائمۃ یغترفون من السواقی۔[2]	ہیں، اور دوسرے اکابر علماء چھوٹی چھوٹی نہروں
	اور نالیوں سے پانی لیتے ہیں۔

ہر زمانہ کے علماء بہر حال بشر تھے، اور انسانوں ہی کا دل و دماغ اور انسانی احساسات رکھتے تھے، اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے لوگوں کے لئے ان کی مخالفت کا موجب یہی احساس کہتری اور انسانی طبیعت کی قدیم کمزوری تھی، جس سے بچنا بڑا مشکل کام ہے، امام ابو حنیفہؒ سے شدید اختلاف و عناد رکھنے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخین نے یہ شعر لکھا ہے جو ہر زمانہ پر صادق ہے۔

حسدوا الفتی اذ لم ینالوا سعیہ　　　فالناس اعداءٌ لہٗ وخصوم

---

[1] افضل المتاخرین حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تصنیفات میں جا بجا اس طرف اشارے کئے ہیں، ایک جگہ "ازالۃ الخفاء" میں فرماتے ہیں "چوں ایں مقدمہ بایں آب و تاب در کتب کلامیہ نخواندۂ محتمل کہ وحشتے بخاطر تو راہ یابد" دوسری جگہ فرماتے ہیں "لیکن فہم ایں معنی بغایت دقیق است جمعے کہ سرمایۂ علم ایشاں شرح وقایہ و ہدایہ باشد کجا ادراک ایں سر دقیق توانند کرد" ج ۲ ص ۸۴

[2] الکواکب الدریہ ص ۱۴۵

۴۔ بہت سے معاصرین کی مخالفت کا ایک قدرتی سبب شیخ الاسلام کی ایک مزاجی خصوصیت بھی تھی، جو بہت سے اِن اہلِ کمال میں ہوتی ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین، وسیع النظر اور کثیر المعلومات ہوتے ہیں، یعنی طبیعت کی تیزی اور ذکاوتِ حس، جو بعض اوقات ان کو اپنے بعض حریفوں کی سخت تنقید اور ان کے جہل اور غباوت اور قلّتِ علم کے اظہار پر آمادہ کر دیتی ہے، اور شدتِ تأثر میں ان کی زبان سے بعض ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں، جس سے ان کے اہلِ علم معاصرین اور ان کے معتقدین و تلامذہ کی دل شکنی اور تحقیر ہوتی ہے، اور ان کے دل میں مستقل نفرت و عناد کے بیج پڑ جاتے ہیں، جو علمی و فقہی اصطلاحات، کفر و ضلال کے فتوے اور مسلسل مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، شیخ الاسلام کے معاصرین اور سوانح نگاروں نے ان کے فضائل و مناقب اور حالات بیان کرنے میں اس "مزاجی کیفیت" کو جو بہت حد تک ان کے حالاتِ زندگی اور کمالاتِ علمی و ذہنی کا نتیجہ تھی، نظر انداز نہیں کیا، علامہ ذہبی جو ان کے علمی و دینی کمالات سے بیحد متأثر ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

تعتریہ حدّۃ فی البحث، وغضب	بحث کے اثناء میں کبھی کبھی ان کی طبیعت میں تیزی
وصدمۃ للخصوم، تزرع لہ عداوۃ	اور غصّہ پیدا ہو جاتا ہے، اور اپنے مقابل و مناظر پر ایسا
فی النفوس، ولولا ذلک لکان کلمۃ	وار کرتے ہیں جس سے طبیعتوں میں عداوت کا بیج پڑ جاتا
اجماع فانّ کبارھم خاضعون	ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے فضل و کمال پر سب کا اتفاق
لعلومہ معترفون بانّہ بحر لاساحل	اور اجماع ہوتا اس لئے کہ ان کے نامور معاصرین اور
لہ وکنز لیس لہ نظیر۔	اکابر علماء ان کی علمیت و قابلیت کے سامنے سرافگندہ
	ہیں اور صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایک دریائے
	ناپیدا کنار اور مخزنِ علوم ہیں، جس کی کوئی نظیر نہیں۔

ان کی زندگی میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں کہ کسی علمی و دینی مسئلہ میں اپنے معاصر کی کم فہمی یا اس کے

مطالعہ اور نظر کی کوتاہی ان سے برداشت نہ ہوسکی، اور انھوں نے برملا اس کا اظہار کر دیا اور اس اظہار کی وجہ سے ان کا وہ صاحبِ علم معاصران کا مستقل حریف اور معاند بن گیا چنانچہ مسئلۂ زیارت میں جب تقی ابن الاخنائی مالکی نے ان کا رد کیا، اور انھوں نے ان کا تردیدی رسالہ پڑھا تو انھوں نے اس کا جواب لکھا جس میں ظاہر کیا کہ موصوف نہایت کم علم اور قلیل المعلومات شخص ہیں، اور وہ اس مسئلہ میں خامہ فرسائی کی لیاقت نہیں رکھتے، ان کا یہ تبصرہ ان کے لئے آزمائش کا باعث اور مزید تکلیفوں کا سبب بن گیا، ان کے بعض سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ ان کی آخری نظر بندی اور اسارت کی طوالت اور سامان تحریر کی ضبطی کا سبب ان کا یہی تبصرہ اور اظہار خیال تھا[1]۔

اسی طرح ابوحیان مفسّر جو اپنے زمانہ کا امامِ نحو سمجھا جاتا تھا، ابنِ تیمیہ کی خدمت میں متعقدانہ و نیاز مندانہ حاضر ہوا اور ان کی منقبت میں ایک زوردار قصیدہ لکھ کر لایا جس کا مطلع تھا۔

لما اتانا تقی الدین لاح لنا　　　داع الی اللہ فرد ما لہ وَزَر

(جب ہمارے پاس تقی الدین (ابن تیمیہ) آئے تو ہم کو ایک ایسا داعی الی اللہ نظر آیا جو اپنی خصوصیات میں یکتا ہے، اور جس کا کوئی ہمسر نہیں)۔

اور جس کا ایک شعر ہے:-

یا من یحدّث عن علم الکتاب أصخ　　　ھذا الامام الذی قد کان ینتظر

(اے وہ شخص جو علم کتاب کی باتیں کرتا تھا غور سے سن، یہی وہ امام ہے جس کا مدت سے انتظار تھا)

اثنائے گفتگو میں نحو کے کسی مسئلہ پر بات چیت شروع ہوگئی، ابوحیان نے اپنے قول کی تائید میں سیبویہ کا حوالہ دیا، اس کی توقع تھی کہ ابن تیمیہ سیبویہ کا نام سن کر خاموش ہو جائیں گے، اور سر تسلیم خم کر دیں گے لیکن اس کی توقع کے بالکل خلاف اس کو جواب ملا کہ سیبویہ کوئی نحو کا نبی معصوم تو نہیں تھا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱۴ ص ۱۳۴

اس نے "الکتاب" میں ۸۰ جگہ غلطی کی ہے جن کو تم سمجھ بھی نہیں سکتے، یہ سن کر ابو حیّان کی طبیعت ایسی منغّص ہوئی کہ اس نے اس قصیدہ کو اپنے دیوان سے خارج کر دیا، اور ابن تیمیہ کا نہ صرف غیر معتقد بلکہ ہمیشہ کے لئے مخالف اور ناقد بن گیا۔

۵۔ مخالفت کا ایک سبب ان کی بعض وہ تحقیقات اور ترجیحات ہیں، جن میں وہ منفرد اور مذاہب مشہورہ اور ائمۂ اربعہ سے بھی بعض اوقات الگ نظر آتے ہیں، جن لوگوں کی فقہ و خلاف کی تاریخ اور ائمہ و مجتہدین کے اقوال و مسائل پر وسیع نظر ہے ان کے لئے تو یہ "تفرّدات" کوئی وحشت کی چیز اور ابن تیمیہ کے فضل و کمال کے انکار کا موجب نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ائمۂ مشہورین اور اولیائے مقبولین کے تفردات اور مسائل غریبہ جمع کر دیئے جائیں تو یہ تفردات بہت ہلکے اور معمولی نظر آنے لگیں، اور ان لوگوں کا حسن اعتقاد جو "تفرد" کو مقبولیت اور حقانیت کے منافی سمجھتے ہیں اور ان کے لئے عظمت و ولایت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی قول اور کوئی تحقیق مشہور تحقیقات کے خلاف نہ ہو، تزلزل میں پڑ جائے گا، خود شیخ محی الدین ابن عربی جن کی عظمت و ولایت کا ایک عالم قائل ہے ایسے بہت سے فقہی اور کلامی مسائل میں منفرد ہیں، جن میں وہ بالکل تنہا نظر آتے ہیں، اور ان سے پہلے کسی نے ان آراء اور تحقیقات کا اظہار نہیں کیا، ان کے یہ "تفردات" ان کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کے علمائے سنت کے لئے موضوع بحث بنے ہوئے ہیں[1]۔

لیکن جن لوگوں کی نظر "خلافیات" پر اتنی وسیع نہیں، یا جو "متقدمین" کے لئے تو تفرد اور "شذوذ" کی اجازت دے سکتے ہیں، لیکن کسی صاحب کمال اور صاحب نظر معاصر کے لئے ان کے نزدیک اس کی گنجائش نہیں، ان کے لئے یہ تفرد بھی موجب مخالفت اور فساد عقیدہ اور ضلالت اور خرق اجماع کی دلیل بن گیا، اس سلسلہ میں امیر المومنین فی الحدیث حافظ ابن حجر عسقلانی کا یہ مقولہ

---

[1] علامہ نعمان آلوسی نے "جلاء العینین" میں ان تفردات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، ملاحظہ ہو جلاء العینین ص ۴۳

(جو اوپر نقل ہو چکا ہے) بڑا معتدل و متوازن اور افراط و تفریط سے پاک ہے، وہ فرماتے ہیں :۔

فالذی اصاب فیہ وھو الاکثر یستفاد منہ ویترحّم علیہ بسببہ، والّذی اخطأ فیہ لایقلّد فیہ بل ھو معذور۔

جن مسائل میں وہ اپنے اجتہاد سے صحیح نقطہ پر پہونچ گئے ہیں (اور تعداد میں وہی مسائل زیادہ ہیں) ان میں تو ان سے استفادہ کیا جائے، اور ان کی وجہ سے ان کے حق میں دعائے خیر کی جائے اور جن میں ان سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے ان میں ان کی تقلید نہ کی جائے بلکہ ان کو معذور سمجھا جائے۔

۶۔ ان کی مخالفت کا ایک قوی سبب یہ ہے کہ انھوں نے اس طرزِ کلام اور صفات و متشابہات کی تاویل کے اس طریقہ کی مخالفت کی، جو "عقیدۂ اشعریہ" بلکہ عقیدۂ اہلِ سنت کے نام سے موسوم تھا، اور اس سے عدول یا تو جہالت پر محمول کیا جاتا تھا، یا مخالفت اہلِ سنت پر، اوپر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ نے اس سے پوری جرأت و قوت کے ساتھ اختلاف کیا، اور صفات کے بارے میں صحابہؓ، تابعین، ائمۂ مجتہدین، متکلمین، متقدمین امام ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر الباقلانی اور امام الحرمین تک کا مسلک ان کے اقوال اور ان کی تصانیف سے بیان کیا، اور ان کی کتابوں کے اقتباسات سے ثابت کیا کہ سب حضرات ان صفات پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں، ان کی وہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق "لیس کمثلہ شئ" کے لائق اور تشبیہ و تجسیم نیز نفی و تعطیل سے منزّہ اور پاک ہے، وہ دعوے سے کہتے ہیں کہ اس کے خلاف نصًّا و ظاہرًا ایک لفظ بھی صحابہؓ و تابعین و سلف سے ثابت نہیں۔

اس وقت تمام عالمِ اسلام پر اشعری العقیدہ علماء و متکلمین کا اثر تھا، امام ابن تیمیہؒ کا یہ اختلاف جو خالص علمی بنیادوں پر تھا، ایک بدعت اور "یتبع غیر سبیل المؤمنین" کا مرادف

سمجھا گیا، اور ان پر تجسیم کا الزام لگا یا گیا، اس وقت چونکہ تاویل ہی پر زور دیا جا رہا تھا، اس لئے ان کا سارا زورِ قلم اسی کے مقابلہ میں صرف ہوا "تاویل" کی تردید میں ان کی اس بلند آہنگی سے لوگوں کو ان پر تجسیم کا شبہہ ہوا، اس سلسلہ میں یہاں تک غلو کیا گیا کہ ان کی طرف وہ روایات منسوب کی گئیں جن سے ان کا صاف صاف فرقۂ مجسّمہ میں ہونا ثابت ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ وہ جامع اموی دمشق میں خطبہ دے رہے تھے، انھوں نے منبر کے ایک زینہ سے دوسرے زینہ پر قدم رکھا، اور کہا کہ جس طرح میں نے نزول کیا ہے بالکل اسی طرح اللہ تعالےٰ نزول فرماتا ہے[1]، امام ابن تیمیہؒ نے اور ان کے تلامذہ نے اس الزام کی پر زور تردید کی ہے، اور بار بار کہا ہے کہ جس طرح وہ تعطیل کے منکر ہیں اسی طرح وہ تجسیم کے دشمن ہیں، پھر بھی تاویل کے خلاف انھوں نے ضرورۃً جس شد و مد سے لکھا اور کہا ہے اس کو مخالفین نے تجسیم کے ثبوت میں پیش کیا ہے، بہت سے علماء اور ان کے متبعین کی مخالفت کے اسباب میں سے ایک قوی سبب یہ بھی تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ تاویل و تجسیم کے درمیان کا یہ راستہ اتنا ہی نازک ہے کہ ہر شخص کی گرفت میں آنا مشکل ہے، پھر جبکہ حنابلہ اور منکرین تاویل میں سے متعدد اشخاص "تجسیم" کی سرحد میں داخل ہو گئے، امام ابن تیمیہؒ پر "تجسیم" کا الزام لگنا خلاف قیاس اور مستبعد نہیں، اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس الزام سے بالکل بری ہیں۔

۷۔ مخالفت کا ایک سبب شیخ اکبر شیخ محی الدین بن عربی کی مخالفت ہے، بہت سے

---

[1] یہ روایت ابن بطوطہ نے ایک چشم دید واقعہ کے طور پر اپنے سفرنامہ میں لکھی ہے، راقم سطور نے علامۂ شام شیخ بہجۃ البیطار سے اس کا ذکر کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ تاریخی حیثیت سے یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے، خود ابن بطوطہ ذکر کرتا ہے کہ وہ دمشق رمضان ۷۲۶ھ میں آیا ہے، اور یہ بات مسلّم ہے کہ شیخ الاسلام شعبان ۷۲۶ھ میں محبوس ہو چکے تھے، پھر ابن تیمیہ کبھی بھی جامع اموی کے خطیب نہیں رہے، اس زمانہ میں جامع اموی کے خطیب شیخ جلال الدین قزوینی تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو ابن بطوطہ کو اشتباہ ہوا یا غلط بیانی سے کام لیا۔

لوگوں کے نزدیک خصوصاً جو تصوّف کا مذاق رکھتے ہیں، ابن تیمیہ کا یہ جرم ناقابلِ معافی ہے، اور ان کے تمام محاسن وکمالات پر پانی پھیر دیتا ہے کہ انھوں نے شیخ اکبر کے مشہور آراء وتحقیقات اور ان کے مسلک وحدۃ الوجود کی پرزور تردید کی ہے، اور وہ ان کے مخالفین میں سے ہیں۔

اس سلسلہ میں اگرچہ ہمارا مسلک اور ذوق بعینہٖ وہ ہے جو امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ سرہندیؒ نے مکتوبات میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

عجائب کار وبار است، شیخ محی الدین از مقبولان نظر می آید، واکثر علوم او کہ مخالف آرائے اہلِ حق اند، خطا وناصواب ظاہر می شود۔[1]	عجیب معاملہ ہے شیخ محی الدین مقبولین میں نظر آتے ہیں، لیکن ان کے اکثر علوم جو اہلِ حق کے مسلک کے مخالف ہیں، خطا اور نادرست معلوم ہوتے ہیں۔

اسی مکتوب میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:۔

اکثر معارف کشفیہ او از علوم اہلسنت جدا افتادہ است از صواب دُور است بس متابعت نہ کند آن را، مگر کسے کہ دلش مریض است یا مقلد صرف۔[2]	ان کے اکثر کشفی علوم جو اہلِ سنت کے علوم سے اختلاف رکھتے ہیں، صحت سے دور ہیں، ان کی پیروی یا تو وہ کرے گا جس کا دل بیمار ہے، یا مقلد محض۔

لیکن جہاں تک شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تردید واختلاف کا تعلق ہے، وہ اس میں منفرد نہیں، صاحب "جلاء العینین" نے ان لوگوں کی فہرست دی ہے، جو اس مسئلہ میں ابن تیمیہ کے ہمنوا ہیں، ان میں سے متعدد نے اس موضوع پر مستقل رسائل بھی تصنیف کئے ہیں، اس فہرست میں ہم کو علامۂ سخاوی، علامۂ سعد الدین تفتازانی، ملا علی قاری، حافظ ابن حجر عسقلانی، ابو حیان مفسر، شیخ الاسلام عزّ الدین بن عبد السلام حافظ ابو زرعہ، شیخ الاسلام سراج الدین البلقینی جیسے نامور علماء وائمۂ فن نظر آتے ہیں۔[3]

---

[1] مکتوبات مکتوب ج ۱ نمبر ۲۶۶ [2] ایضاً [3] جلاء العینین ص ۴۳، ۴۴

پھر شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ کی مخالفت، شیخ اکبر سے ذاتی اور جذباتی نہیں، وہ دینی حمیّت اور شرعی غیرت کی بنا پر ہے اور سلف اور خلف میں اس کی بیشمار نظیریں ملتی ہیں کہ اہلِ حمیّت اور محافظینِ شریعت نے جب کسی شخص کا کوئی ایسا قول دیکھا جو اس کو سنت و شریعت کے نصوص اور اس کے متواتر قطعی عقائد کے خلاف نظر آیا[۱]، تو انھوں نے اس قول کی تردید کی، اور صاحبِ قول کی عظمت و شہرت اور اس کی ولایت و مقبولیت کے آثار بھی اس کو اس تردید سے باز نہ رکھ سکے، اس لئے کہ ان کے نزدیک شریعت کی حرمت اور مقامِ نبوت کی عظمت ہر حرمت سے مقدم اور ہر عظمت سے بالاتر تھی، خود حضرت مجدّد الف ثانیؒ ایسے مواقع پر اپنے فاروقی جوش اور حمیتِ دینی کے خروش کو روک نہیں سکے، اور بڑی قوت سے ایسے اقوال کی تردید کرتے ہیں، ان کو کسی نے لکھا کہ شیخ عبدالکبیر یمنی اس کے قائل ہیں کہ اللہ عالم الغیب نہیں ہے اس پر تحریر فرماتے ہیں :۔

مخدوما! فقیر را تاب استماع امثال ایں سخناں ہرگز	مخدومی! فقیر کو ہرگز اس طرح کی باتیں سننے کی
نیست بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید	تاب نہیں، بے اختیار میری رگِ فاروقی حرکت
و فرصت تاویل و توجیہ آں نمی دہد قائل ایں سخنان	میں آجاتی ہے، اور ایسے اقوال کی تاویل و توجیہ
شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی کلام محمد عربی	کی فرصت نہیں دیتی، اس طرح کا مقولہ شیخ کبیر
علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام درکار است	یمنی کا ہو یا شیخ اکبر شامی کا ہمیں محمد عربی صلے اللہ
نہ کلام محی الدین عربی و صدرالدین قونوی	علیہ وسلم کا کلام درکار ہے نہ کہ محی الدین (ابن) عربی
و عبدالرزاق کاشی مارا بنص کار است	و صدرالدین قونوی، اور عبدالرزاق کاشی کا ہم کو
نہ بفص، فتوحات مدینہ از فتوحاتِ مکیہ	نص[۲] سے کام ہے نہ کہ فص[۳] سے فتوحاتِ مدینہ[۴]

---

[۱] خواہ وہ حقیقت میں نہ ہو، لیکن انسان اپنی نظر اور بصیرت و فہم ہی کا مکلّف ہے، عالم السرائر اور عالم الغیب صرف اللہ تعالےٰ ہے۔

[۲] نصوص کتاب و سنت مراد ہیں [۳] شیخ اکبر کی مشہور کتاب "فصوص الحکم" کی طرف اشارہ ہے [۴] تعلیمات کتاب و سنت۔

مستغنی ساختہ است۔[1] | نے ہم کو فتوحاتِ مکیہ[2] سے مستغنی کر دیا ہے۔

یہ حمیّت و جوش اور یہ اختلاف و انکار جس کا باعث و محرک دینی حمیّت اور کتاب و سنت کی حمایت و نصرت کے سوا کچھ نہ ہو، اور یہ اللہ اور اس کے رسول کو ماسوا پر ترجیح دینا اور جس سے محبت کرنا انہی کے لئے محبت کرنا کسی شخص کے معائب میں شمار ہونے کے لائق نہیں، اس کے اعلیٰ فضائل و مناقب میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، اس لئے کہ وہ اس حدیث کا صحیح مصداق ہے۔

ثلٰث من کنّ فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مِمّا سواھُما، ومن احب عبدًا لایحبہ الا لِلہ، ومن یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ منہ کما یکرہ اَنْ یُلقی فی النار۔

تین باتیں جس میں ہوں گی، اس کو ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت محسوس ہوگی، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ آدمی کسی شخص سے محض اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرے، تیسرے یہ کہ اس کو کفر کی طرف واپس جانے سے اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے نجات دے دی ہو ایسی ہی نفرت معلوم ہوتی ہو جیسے آگ میں ڈالے جانے سے ہوتی ہے۔[3]

۸۔ ایک گروہ کو ان کی طرف سے شدید غلط فہمیاں اور مغالطے تھے، بعض غیر محتاط و متعصب مصنفین نے ان کی طرف ایسے اقوال کی نسبت کی تھی، جو عام عقیدۂ اہلِ سنّت اور جمہور کے مسلک کے مطابق موجبِ کفر ہیں، اور بعض ایسے اقوال ان کی طرف منسوب کئے گئے جن سے مقامِ رسالت میں سوءِ ادب اور تنقیص کا پہلو نکلتا ہے (اعاذنا اللہ وجمیع المسلمین منہ) یہ معاملہ تنہا امام ابن تیمیہ کے ساتھ نہیں کیا گیا، دوسرے اکابرِ امت بھی معاندین کی اس سازش کا شکار ہوئے ہیں، ان کی طرف نہ صرف ان

---

[1] مکتوباتِ امام ربانی، مکتوب ۱۰۰ جلد اول۔ [2] شیخ اکبر کی مشہور کتاب۔ [3] بخاری و مسلم۔

اقوال وعقائد کی نسبت کی گئی جن سے وہ بالکل بری تھے، بلکہ ان کی کتابوں میں ایسے مضامین شامل کئے گئے جو موجبِ کفر وضلال تھے، ایک قدم اس سے بڑھ کر مستقل کتابیں (جو کفریہ اقوال پر مشتمل تھیں) تصنیف کر کے ان کی طرف منسوب کر دی گئیں، اور ان کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کی گئی، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے ساتھ یہی سلوک ہوا، ایک بڑے گروہ علماء کا خیال ہے کہ "المضنون بہ علی غیر اھلہ، المضنون بہ علی اھلہ" "معارج القدس" "مشکوٰۃ الانوار" بے اصل اور منحول کتابیں ہیں جو امام غزالی کے دشمنوں اور بدخواہوں نے تصنیف کر کے ان کی طرف منسوب کر دی ہیں، شیخ محی الدین ابن عربی کی کتابوں میں بھی امام شعرانی وغیرہ کا خیال ہے کہ یہ عمل ہوا ہے، اور مضامین ومواد کی آمیزش کی گئی ہے، امام شعرانی خود اپنی کتابوں کے متعلق ایک دلچسپ اور عبرت انگیز تجربہ لکھتے ہیں، "الاجوبۃ المرضیۃ" میں فرماتے ہیں کہ:۔

"میری کتاب "البحر المورود فی المواثیق والعھود" میں بعض حاسدوں نے ایسے مضامین شامل کر دیئے جو مخالف شریعت تھے، اور جامع ازہر وغیرہ میں ان کو خوب گشت کرایا، اس سے ایک فتنہ کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ میں نے اپنا صحیح اور محفوظ نسخہ علماء کے پاس بھیجا، جس پر بڑے بڑے علماء ومشائخ اسلام نے تقریظ و توثیق لکھی تھی، اس وقت ان کو ان الحاقی مضامین کی حقیقت معلوم ہوئی، اور فتنہ فرو ہوا"

ابن تیمیہ کے ساتھ شروع سے ان کے معاصرین اور بعض متعصبین کا جو معاملہ رہا ہے، اس کی بنا پر یہ بات قطعاً محلِ تعجب نہیں کہ ان کی طرف بھی اقوالِ کفریہ اور اہانت آمیز مضامین کا ایک طومار منسوب کر دیا گیا ہو، اور بہت سے مخلصین اور اہلِ حمیت علماء اس سے متأثر ہو کر ان کی مخالفت بلکہ تضلیل و تکفیر پر آمادہ ہو گئے ہوں، خود آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کی ابتداء میں متعصبین ومخالفین کا ایک گروہ اس بارے میں اتنا غلو اختیار کر چکا تھا کہ وہ اس کا فتویٰ دیتا تھا کہ "جو ابن تیمیہ کو شیخ الاسلام کہے وہ کافر ہے" اس کی تردید اور ان کی صداقت وعظمت اور امامت کے ثبوت میں حافظ شامی شمس الدین الشافعی (م ۸۴۲ھ) نے اپنی مشہور کتاب "الرد الوافر علی من زعم ان من سمی ابن تیمیہ شیخ الاسلام

کافر" لکھی[۱]، جس میں ستاسی اکابر و مشاہیر علماء و ائمۂ فن کی رائے اور تأثرات و اعترافات اور ان کی عظمت و امامت کے متعلق ان کی شہادتیں نقل کیں، اس کتاب پر جس میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی نے تقریظیں لکھیں، اور ان کی تائید اور شیخ الاسلام کی دل کھول کر تعریف و تحسین کی اور ظاہر کیا کہ وہ بلا شبہہ صحیح العقیدہ، سنّی المسلک اور مسلّم شیخ الاسلام تھے، علامہ عینی نے یہاں تک لکھا کہ "من سبه الی الزندقة فهو زندیق وقد سارت تصانیفه الی الآفاق ولیس فیها شیئ مما یدل علی الزیغ والشقاق" (جو ان پر زندقہ کا الزام لگائے وہ خود ملحد و زندقہ ہے، ان کی تصنیفات دنیا میں پھیل گئی ہیں، ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو ضلالت اور مخالفت اہلِ سنت پر دلالت کرے۔)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہا، اور ان بے اصل اقوال و نقول کی نقل در نقل ہوتی رہی اور لوگ اس سے متاثر ہو کر ان کے خلاف قلم اٹھاتے رہے، اس سلسلہ میں سب سے پیش پیش دسویں صدی ہجری کے مشہور عالم اور مصنف علامہ ابن حجر مکی ہیں[۲]، جنھوں نے ابن تیمیہؒ کے خلاف بہت سخت فتویٰ لکھا، اور ان کے متعلق ان کے قلم سے "عبدٌ خذله الله تعالیٰ واضله واعماه

---

[۱] یہ کتاب ایک مجموعہ ہیں جس کی جمع و ترتیب فرج اللہ زکی کردی نے کی ہے، شیخ عبدالقادر تلمسانی کے اہتمام سے مطبعہ کردستان مصر میں ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئی، یہ شیخ کے حالات کا ایک بہت بڑا قیمتی ذخیرہ ہے۔

[۲] ولادت ۹۰۹ھ (مصر) وفات ۹۷۳ھ (مکۂ معظمہ) تصنیفات میں "تحفة المحتاج" (۱-۲-۳-۴) "الزواجر عن اقتراف الکبائر" "الصواعق المحرقة" اور "الفتاویٰ الفقهیة والحدیثیة" خاص طور پر مشہور ہیں یہ ابن حجر مکی، علامہ ابن حجر عسقلانی صاحب "فتح الباری" کے علاوہ اور ان سے متأخر ہیں، ابنِ حجر عسقلانی حدیث کے مشہور امام اور نہایت محقق اور وسیع النظر عالم ہیں، متأخرین میں ان کی مثال ملنی مشکل ہے، ابن حجر مکّی علم، وسعتِ نظر وسعتِ قلب اور تحقیق میں اپنے نامور ہم نام کو نہیں پہونچتے۔

واصمہ واذلہ" جیسے الفاظ نکلے۔

لیکن اسی فتوے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود علامہ ابن حجر نے ابن تیمیہ کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں، اوران کے معلومات ذاتی اور براہِ راست نہ تھے، ان کا سارا اعتماد اور فتوی کی بنیاد ان منقولات ومشہورات پر ہے، جو اس زمانہ میں ان کے مخالفین اپنی کتابوں میں نقل کرتے اوراپنی مجلسوں میں ذکر کرتے تھے، وہ اسی فتوی میں شیخ الاسلام کے کلامی وفقہی تفرّدات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں" وقال بعضھم ومن نظر الی کتبہ لم ینسب الیہ اکثر ھٰذہ المسائل" (بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جس شخص نے ان کی کتابوں کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے، وہ مذکورہ بالا مسائل میں اکثر کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں مانتا) فتوے کے آخر میں اپنا تردّد ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں" فان صحّ عنہ مکفر او مبتدع یعاملہ اللہ تعالیٰ بعدلہ والا یغفراللہ لنا ولہ" (اگر ان سے کوئی ایسا عقیدہ ثابت ہوگیا، جو موجب کفر یا بدعت ہے تو اللہ اپنے عدل کے ساتھ ان سے معاملہ کرے، ورنہ ہماری اوران کی بخشش فرمائے۔)

اس فتوی کا جواب اور ابنِ تیمیہ اور ابنِ حجر کا فاضلانہ محاکمہ بغداد کے مشہور علمی خاندان کے رکن، فخرِ عراق علاّمہ محمود آلوسی صاحبِ "روح المعانی" کے نامور فرزند علامہ خیرالدین نعمان آلوسی زادہ نے اپنی ضخیم تصنیف "جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین" میں کیا ہے، اور علامۂ موصوف کے ایک ایک لفظ کا مفصّل جواب دیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ان منقولات کا ایک حصہ تو بالکل بے اصل اور بے بنیاد اور افتراءِ محض ہے، اور شیخ الاسلام کی کتابوں میں بالکل اس کے خلاف اور برعکس تصریحات اور بیانات ملتے ہیں، ایک حصّہ (جو بہت ہلکا) ہے، وہ تفصیل کا محتاج ہے، اس کی یا تو وہ حقیقت نہیں جو بیان کی گئی ہے، یا وہ اس میں منفرد نہیں، اس کے علاوہ انھوں نے اس کتاب میں شیخ الاسلام کی سیرت اور حالات کا بھی ایک گراں قدر اور قیمتی ذخیرہ جمع

کر دیا ہے۔[1]

ابن حجر مکی کے بعد سے اس وقت تک علمائے محققین اور وسیع النظر اور منصف مصنفین علامۂ ابن حجر سے اس بارے میں اپنا اختلاف ظاہر کرتے رہے ہے، اور اپنی تصنیفات و رسائل میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی برأت اور ان کی عظمت اور علو مرتبت کا اظہار کرتے رہے ہے، خود علامہ ابن حجر مکی کے شاگرد رشید ملا علی قاری[2] کو شیخ الاسلام کے بارے میں اپنے استاد کی رائے سے اختلاف ہے، وہ اپنی تصنیفات میں بڑے بلند تعریفی کلمات میں ان کا ذکر خیر کرتے ہیں، شرح شمائل ترمذی" اور "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

ومن طالع شرح منازل السائرین تبین	جو شخص "منازل السائرین" کی شرح (مدارج السالکین)
لہٗ انھما کانا من اکابر اھل السنۃ	کا مطالعہ کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ ابن تیمیہ
والجماعۃ ومن اولیاء ھذہ الامۃ۔	اور ابن قیم اہل سنت والجماعت کے اکابر اور
	اس امت محمدیؐ کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔

آخر میں امام المتأخرین شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف سے پرزور دفاع کیا ہے، اور صاف لکھا ہے کہ وہ نہ صرف سنی العقیدہ اور سلفی المسلک عالم تھے، بلکہ شریعت کے بہت بڑے ترجمان اور وکیل اور کتاب و سنت کے مخلص خادم اور امتِ محمدیہ کے ایک جلیل القدر عالم تھے، ان کا وجود نوادر روزگار میں سے تھا، جو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے،

---

[1] یہ کتاب جو باریک مصری ٹائپ کے ۳۶۲ صفحات میں ہے، ۱۲۹۸ھ میں مطبع بولاق مصر میں طبع ہوئی ہے۔

[2] ہرات (افغانستان) کے رہنے والے تھے، اپنے زمانہ کے اکابر علماء میں شمار تھا، مکۂ معظمہ کا سفر کیا، اور وہیں سکونت اختیار کر لی، مناسک حج اور فقہ و حدیث کے ممتاز ترین علماء میں تھے، تصنیفات میں مرقاۃ، شرح فقہ اکبر، شرح شفاء، شرح شمائل ترمذی، شرح نخبہ، شرح شاطبیہ، شرح جزریہ، خلاصۂ قاموس، وغیرہ مشہور ہیں، تصوف و معرفت کے بھی لذت آشنا تھے ۱۰۱۴ھ کو وفات ہوئی، جامع ازہر مصر میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی۔

جن لوگوں نے ان کی مخالفت اور ان کا تعقّب کیا ہے، ان کو علم و نظر میں ان سے کوئی نسبت نہیں ہے شاہ صاحب حاملین کتاب و سنت اور علمائے اسلام کی تعدیل فرماتے ہوئے اور حدیث مشہور "یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ" (اس علم کتاب و سنت کے حامل ہر نسل میں سے عادل لوگ ہوں گے) سے استدلال کرتے ہوئے شیخ الاسلام کے متعلق فرماتے ہیں:۔

وعلی ھذا الاصل اعتقدنا فی شیخ	اسی بنیاد پر ہم شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے بارے میں
الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ	عقیدہ رکھتے ہیں، ہم پر ان کے حالات سے ثابت
فانا قد تحققنا من حالہ انہ عالم بکتاب	ہوچکا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے عالم اس کے لغوی
اللہ ومعانیہ اللغویۃ والشرعیّۃ	اور شرعی معانی سے بخوبی واقف، نحو و لغت
وحافظ لسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ	میں ماہر مذہب حنابلہ کے فروع و اصول
وسلم وآثار السلف عارف لمعانیھما	کی تنقیح و تدوین کرنے والے، ذکاوت میں
اللغویۃ والشرعیۃ، استاذٌ فی النحو	یگانہ، بڑے زبان آور اور عقیدہ اہل سنت
واللغۃ محرّرٌ لمذھب الحنابلۃ فروعہ	کی حمایت و مدافعت میں بڑے فصیح و بلیغ
واصولہ فائق فی الذکاء ذو لسان	تھے،................
وبلاغۃ فی الذّبّ عن عقیدۃ	ان سے کوئی فسق یا بدعت کی بات ثابت نہیں
اھل السنۃ لم یؤثر عنہ فسق	بس یہی چند مسائل ہیں جن کے بارے میں
ولا بدعۃ اللّٰھمّ الا ھذہ الامور	ان کے ساتھ سختی کی گئی، ان میں بھی کوئی
التی ضُیّق علیہ لاجلھا ولیس شئ	ایسا مسئلہ نہیں جس کے بارے میں ان کے
منھا الا ومعہ دلیلہ من الکتاب	پاس کتاب و سنت و آثار سلف میں سے
والسنۃ وآثار السلف فمثل	کوئی دلیل نہ ہو، ایسے فاضل کی نظیر علم میں

هذا الشيخ عزيز الوجود في العلم،	ملنی مشکل ہے اور کس کی مجال ہے کہ تحریر و
ومن يطيق ان يلحق شاؤه في	تقریر میں ان کے پایہ کو پہونچے، اور جن لوگوں
تحريره وتقريره، والذين ضيقوا	نے ان پر تشدد کیا، ان کو ان سے ان کے
عليه ما بلغوا معشار ما اتاه الله تعالیٰ	کمالات و خصوصیات میں کوئی نسبت نہیں
وان كان تضييقه ذلك ناشيئًا	تھی، اگرچہ یہ تشدد ایک اجتہادی امر تھا
من اجتهاد ومشاجرة العلماء	علماء کا اختلاف اس بارے میں مشاجراتِ
في مثل ذلك ما هي الا كمشاجرة	صحابہ ہی کی طرح ہے، اس میں مناسب
الصحابة رضي الله تعالیٰ عنهم	یہی ہے کہ زبان کو روکا جائے اور خیر کے
فيما بينهم والواجب في ذلك كشف	سوا کچھ منہ سے نہ نکالا جائے۔
اللسان الا بخير۔[1]	

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اس تزکیہ وشہادت اور ان بلند توصیفی کلمات کے بعد کسی ایسے عالم یا مصنّف کی جرح جس کی ابن تیمیہ کے آفاق علم وفکر تک رسائی نہ ہو کوئی

---

[1] یہ اس عربی مکتوب کا ایک حصہ ہے، جو حضرت شاہ صاحب نے اپنے ایک فاضل معاصر مخدوم معین الدین ٹھٹھوی (ٹھٹھہ صوبہ سندھ) کے جواب میں لکھا تھا، فاضل موصوف نے شاہ صاحب سے امام ابن تیمیہ کے بعض تفردات اور ان کے مخالفین کے اختلافات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے بارے میں آپ کی رائے پوچھی تھی، یہ مجموعۂ مکاتیب شاہ صاحب کے مشہور تلمیذ و مسترشد خواجہ محمد امین کشمیری کا مرتب کیا ہوا ہے، یہ مجموعۂ مکتوبات معہ مناقب ابی عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری و فضیلت ابنِ تیمیہ کے نام سے مطبع احمدی میں چھپا ہے "جلاء العینین" میں بھی یہ عبارت بجنسہٖ منقول ہے۔ (ص ۴۵-۴۶)

علمی وزن نہیں رکھتی، حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جو تبحّر علمی، تنوّعِ کمالات، مجتہدانہ فکر و نظر، اختلافات میں مسلکِ اعتدال اور علمائے اسلام کی مرتبہ شناسی کا ملکہ عطا فرمایا تھا، اس کے بعد ان کا قول اس بارے میں قولِ فیصل ہے۔ ؎

داستانِ فصلِ گل خوش می سراید عندلیب

شیخ الاسلام ایک عارف باللہ اور محقق

عموماً لوگ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو ایک متکلّم و مناظر و محدث اور فقیہ (جدلی) کی حیثیت سے جانتے ہیں، ان کے علمی کمالات اور ان کی مناظرانہ تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے اپنے ذہن میں ان کا جو تصور قائم کرتے ہیں، وہ ایک نہایت ذہین و ذکی، وسیع العلم، قوی الحجّت اور ایک عالمِ ظاہر سے کچھ اور زیادہ نہیں ہوتا، ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ کو مستثنیٰ کرکے (جنھوں نے شیخ الاسلام ہروی کی کتاب "منازل السائرین" کی شرح "مدارج السالکین" میں اپنی اور اپنے محبوب استاد کی زندگی کا باطنی پہلو محفوظ کردیا ہے، اور یہ ثابت کردیا ہے کہ دونوں اعلیٰ درجہ کے عارف باللہ اور صاحبِ ذوق و معرفت بزرگ تھے) جن لوگوں نے عام سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کی مدد سے شیخ الاسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، یا ان کے متأخر متبعین و منتسبین کو دیکھ کر ان کے متعلق قیاس کیا ہے، وہ ان کو ایک محدّثِ خشک اور ایک عالمِ ظاہر بیں سے زیادہ مقام نہیں دے سکے لیکن "مدارج السالکین" میں ابن قیمؒ نے جستہ جستہ شیخ الاسلام کے جو اقوال و احوال پیش کئے ہیں، اور علامۂ ذہبی وغیرہ نے ان کے تذکرہ میں بر سبیل تذکرہ ان کے اخلاق و اذواق، عادات و شمائل اور اشغال و اعمال کا تذکرہ کیا ہے، اس کو سامنے رکھنے سے ایک منصف شخص اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ شیخ الاسلام کا شمار اس امت کے عارفین اور اہل اللہ میں کیا جانا

چاہیئے، اور اس کو اس بات کا وجدان حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ان منازل پر فائز اور ان مقاصد سے بہرہ مند تھے، جن کے حصول کے لئے سالہا سال ریاضت، مجاہدہ، ائمۂ فن سلوک کی صحبت اور دوام ذکر و مراقبہ کا راستہ بالعموم اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کو متأخرین صوفیہ "نسبت مع اللہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ "وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ"

اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ذوق و معرفت، ایمان حقیقی اور یقین، اخلاص و استقامت تزکیۂ باطن اور تہذیب اخلاق، کامل اتباع سنت اور فنا فی الشریعت وہ حقیقی مقاصد ہیں، جن کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے ہیں، محققین ان مقاصد کے حصول کو کسی ایک وسیلہ میں منحصر نہیں مانتے، بلکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہدیا ہے (اور کچھ غلط نہیں کہا) کہ "طرق الوصول الی اللہ بعدد أنفاس الخلائق" ابتداء میں ان مقاصد کے حصول کے لئے سب سے مؤثر اور طاقتور ذریعہ صحبت نبوی تھی، جس کی کیمیا اثری عالم آشکارا ہے، اس نعمت سے محرومی کے بعد اطباّئے امت اور خلفائے نبوت نے اپنے اپنے زمانہ میں مختلف بدل تجویز کئے، آخر میں مختلف اسباب کی بنا پر صحبت اور کثرتِ ذکر پر زور دیا گیا، جس کا ایک منقّح اور مدوّن طریقہ وہ نظام ہے جو تصوّف و سلوک کے نام سے مشہور ہو گیا ہے، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ ان مقاصد کا حصول ان وسائل پر منحصر نہیں، اجتباء و موہبت کے علاوہ ایمان و احتساب، محاسبۂ نفس، سنتوں کا تتبع، کتب حدیث و شمائل سے محبت و عظمت کے ساتھ اشتغال، کثرتِ نوافل و دعا، کثرت درود، نیت و احتساب کے ساتھ خدمتِ خلق، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، دعوت و تبلیغ، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی استحضار و اہتمام کے ساتھ تقرب کا ذریعہ اور حصول نسبت کا سبب بن سکتی ہے[1]، وسائل مختلف

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "صراط مستقیم" ملفوظات حضرت سید احمد شہید جمع کردہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ و مولانا عبدالحیؒ، بالخصوص حصہ سلوک راہ نبوت۔

ہوسکتے ہیں، لیکن مقصود ایک ہے، شیخ الاسلام کے حالات کے مجموعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ مقصود حاصل تھا، اور اسی کا اظہار یہاں مقصود ہے۔

کسی شخص کے متعلق اس کے بے تکلف حالات واذواق، اخلاق وعادات اور کیفیات دیکھ کر اس بات کی شہادت دی جاسکتی ہے کہ وہ عارفین ومحققین اور مقبولین وکاملین میں سے تھا، اس کا کوئی ظاہری مقیاس اور پیمانہ اور کوئی منطقی دلیل نہیں ہوتی، اہل اللہ اور عارفین کے حالات بکثرت پڑھنے اور ان کی صحبت میں رہنے سے ایک سلیم الفطرت اور صحیح الذوق انسان کو ایک ملکہ اور وجدان حاصل ہوجاتا ہے جس سے وہ اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے لیکن پھر بھی کچھ حالات وعلامات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنی دینی سطح میں عوام سے بلند اور دین کی صحیح کیفیات واذواق اور اہل اللہ کے اخلاق سے بہرہ مند ہے مثلاً ذوقِ عبودیت وانابت (توجہ الی اللہ) کی ایک خاص کیفیت، عبادت کا ذوق وانہماک، ذوق دعا وابتہال، زہد وتجرید وتحقیر دنیا، سخاوت وایثار، فروتنی اور بے نفسی، سکینت وسرور، کمال اتباع سنت، صالحین میں مقبولیت اور علمائے وقت کی شہادت، متبعین ومحبین کی دینداری اور حسن سیرت وغیرہ وغیرہ، ہم اس موقع پر انہی عنوانات کے ذیل میں شیخ الاسلام کے معاصرین اور مورخین کی شہادت اور ان کے تأثرات نقل کرتے ہیں۔

ذوقِ عبودیت وانابت

ذوقِ عبودیت وانابت الی اللہ کی حقیقی کیفیت اس بات کی بیّن شہادت ہے کہ اس شخص کا باطن یقین سے معمور، اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی سے بھرپور، اپنی بے بسی، بیچارگی اور مالک الملک کی قدرت وجلال کے مشاہدے سے پرنور ہے، یہ یقین ومشاہدہ جب باطن میں پیدا ہوجاتا ہے، تب الفاظ اور اعمال سے ظاہر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حقیقت وتکلّف میں زمین وآسمان کا فرق ہے،

یہ فرق صاحبِ نظر اور صاحبِ وجدان سے چھپ نہیں سکتا۔

لیس التکحّل فی العینین کالکحل

ابن تیمیہ کے واقعات بتلاتے ہیں کہ ان کو یقین و مشاہدہ حاصل تھا، اور اس نے ان کے اندر ایک افتقار و اضطرار اور ایک انابت و عبودیت کی کیفیت پیدا کر دی تھی، گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ جب ان کو کسی مسئلہ میں اشکال یا کسی آیت کے سمجھنے میں دقّت ہوتی تھی، تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے تھے، اور پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک یہ کہتے رہتے کہ "یامعلّم ابراهیم فهّمنی"[1] (اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے مجھے اس کی سمجھ عطا فرما) ذہبی کہتے ہیں:۔

لم أر مثله فی ابتهاله واستغاثته وکثرة توجهه۔	میں نے گریہ وزاری اللہ تعالیٰ سے استمداد و فریاد اور توجہ الی اللہ میں ان کی نظیر نہیں دیکھی۔

وہ فرماتے ہیں:۔

انه لیقف خاطری فی المسئلة او الشیٔ او الحالة التی تشکل علیّ فاستغفر الله تعالیٰ الف مرة او اکثر او اقل حتّیٰ ینشرح الصدر وینجلی اشکال ما اشکل۔	کسی وقت کسی مسئلہ میں میری طبیعت بند ہو جاتی ہے، یا کسی معاملہ میں مجھے اشکال پیش آجاتا ہے تو میں ایک ہزار بار استغفار کرتا ہوں، یا اس سے کم یا زیادہ یہاں تک کہ طبیعت کھل جاتی ہے، اور بدلی چھٹ جاتی ہے اور اشکال رفع ہو جاتا ہے۔

اس کیفیت میں جلوت، مجمع، بازار، شور و شغب کوئی چیز مانع نہ ہوتی، فرماتے ہیں:۔

واکون اذ ذلك فی السوق او المسجد او الدرب او المدرسة لا یمنعنی ذلك	ایسی حالت میں کبھی بازار میں کبھی مسجد میں یا گلی یا مدرسہ میں ہوتا ہوں لیکن ذکر و استغفار میں کوئی رکاوٹ نہیں

---

[1] العقود الدریہ ص۶

من الذکر والاستغفار الی ان أنال مطلوبی۔[1]

پیش آتی، اور برابر مشغول رہتا ہوں یہاں تک کہ مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ یقین اور ذوقِ عبودیت جب پیدا ہو جاتا ہے اور باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو انسان میں اپنی بے بسی و بیچارگی، اپنی تہی دستی و بے بضاعتی کا ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آستانۂ شاہی پر کشکولِ گدائی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور خدائی کا صدقہ اور رحمت کی بھیک مانگتا ہے، اس وقت اس کے روئیں روئیں سے یہ صدا آتی ہے کہ ؎

مفلسانیم آمدہ در کوے تو　　　شیأ للہ از جمالِ روے تو

دست بکشا جانبِ زنبیلِ ما　　　آفریں بر دست و بر بازوے تو

ابن تیمیہ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولتِ فقر اور یہ عزتِ تذلّل حاصل تھی، ابن قیّم بیان کرتے ہیں کہ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا اس بارہ میں ایسا حال دیکھا ہے جو کسی کے یہاں نظر نہیں آیا، وہ فرماتے تھے، نہ میرے پاس کچھ ہے نہ میرے اندر کچھ ہے، وہ اکثر یہ شعر پڑھتے۔

انا المکدّی انا المکدّی　　　وھکذا کان ابی وجدّی

(ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہوں! ہاں میں تیرے در کا بھکاری ہوں! اور کوئی نیا بھکاری نہیں، خاندانی بھکاری ہوں، اور پشتینی سائل، میرا باپ بھی تیرے در کا بھکاری تھا، اور میرا دادا بھی)

ذوقِ عبادت وانہماک

عبادت کا ذوق اور اس میں انہماک اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان کو اس کی لذّت اور اس کا حقیقی ذائقہ نہ نصیب ہو اور وہ اس کے درد کی دوا، قلب کی غذا اور روح کی قوت نہ بن جائے

---

[1] الکواکب الدریہ صہ ۱۴۵

اور اس کو مقام "جعلت قرة عینی فی الصلاۃ" اور "ارحنا یا بلال" سے مناسبت نہ بخشی جائے ابن تیمیہ کے معاصرین اور واقفینِ حال اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کو اس دولت بیدار سے حصہ ملا تھا، اور ان کو خلوت و مناجات اور نوافل و عبادات کا خاص ذوق تھا، اور ان کا انہماک اس سلسلہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، "الکواکب الدریہ" میں ہے:۔

وکان فی لیلہ منفرداً عن الناس	رات کو وہ تمام لوگوں سے علیحدہ رہتے تھے، اس
کلھم، خالیاً بربہ عزوجل ضارعاً	وقت خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا، وہ تھے اور
الیہ مواظباً علیٰ تلاوۃ القرآن العظیم	گریہ وزاری، برابر قرآن مجید پڑھتے رہتے، رات
مکرراً لانواع التعبدات اللیلیۃ والنھاریۃ	اور دن مختلف قسم کے نوافل و عبادات میں مشغول
وکان اذا دخل فی الصلاۃ ترتعد فرائصہ	رہتے، جب نماز شروع کرتے تو ان کے شانے اور
واعضاؤہ حتیٰ یمیل یمنۃ ویسرۃ۔[1]	اعضاء کانپنے لگتے یہاں تک کہ ان کو دائیں بائیں لرزش ہوتی

ایسے اہلِ قلوب اور اہلِ ذوق کی طاقت اور نشاط، ذکر و عبادت سے قائم ہوتا ہے اگر اس میں فرق واقع ہو، تو ان کی قوت جواب دے جاتی ہے، اور ان کو محسوس ہوتا ہے کہ فاقہ ہوا، ابن قیم لکھتے ہیں:۔

وکان اذا صلی الفجر یجلس فی مکانہ حتیٰ	نماز فجر کے بعد اپنی جگہ بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ دن
یتعالی النھار جداً یقول ھٰذہ غدوتی	اچھی طرح سے چڑھ آتا، کوئی پوچھتا تو فرماتے کہ یہ میرا
لو لم اتغد ھٰذہ الغدوۃ سقطت	ناشتہ ہے، اگر میں یہ ناشتہ نہ کروں تو میری قوت میں
قوای۔[2]	سقوط ہو جائے اور میرے قویٰ کام نہ کریں۔

اس ذوق و اہتمام کے بعد اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرما دیتا ہے، اور ذکر و عبادت و معمولات طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں، ذہبی لکھتے ہیں:۔

---

[1] الکواکب ص ۱۵۶ [2] الرد الوافر ص ۳۶

لہ اوراد و اذکار یدیمہا بکیفیۃ وجمعیۃ۔[1] — وہ اپنے اوراد واذکار کی پوری پابندی کرتے تھے اور ہر حالت میں جمعیتِ خاطر کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

زہد و تجرید و تحقیرِ دنیا

زہد اور دنیا کی تحقیر کی سچّی کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا کی حقیقت پوری طرح منکشف اور "اِنَّ الدَّارَ الآخِرَۃَ لَھِیَ الحَیَوَانُ" اور "مَا عِندَ اللّٰہِ خَیرٌ وَّ اَبقیٰ" کا حال پوری طرح طاری نہ ہو جائے اور یہ یقین اور معرفتِ صحیحہ اور تعلق باللہ کے بغیر ممکن نہیں، ان کے معاصرین نے ان کے زہد و تجرید اور فقر اختیاری کا جا بجا تذکرہ کیا ہے، ان کے رفیقِ درس اور ہم عصر شیخ علم الدین البرزالی (م ۷۳۸ھ) فرماتے ہیں :-

وجری علی طریقۃ واحدۃ من اختیار الفقر والتقلل من الدنیا ورد ما یفتح بہ علیہ۔[2] — شروع سے آخر تک ان کی حالت یکساں رہی کہ انھوں نے ہمیشہ فقر کو ترجیح دی، دنیا سے بقدرِ ضرورت اور برائے نام تعلق رکھا اور جو ملا اس کو واپس کر دیا۔

جب یہ کسی کا حال بن جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو غنائے قلب کی دولتِ سرمدی سے نوازتا ہے تو اس کو کسریٰ و قیصر کی سلطنت ہیچ معلوم ہونے لگتی ہے، اور وہ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری سمجھتا ہے، اس وقت وہ بیخودی کے عالم میں کہتا ہے ؎

من دلقِ خود بافسرِ شاہان نمی دہم — من فقرِ خود بملکِ سلیمان نمی دہم
از رنجِ فقر در دلِ گنجے کہ یافتم — این رنج را براحتِ شاہاں نمی دہم

اس کے مقام سے بے خبر کبھی اس کے متعلق بدگمانی کرتے ہیں کہ وہ سلطنت پر طمع کی

لہ الرد الوافر ص ۱۸ — ۲ہ ایضاً ص ۶۵

نگاہ ڈالتا ہے اور وہ ان کی بے خبری اور بد ذوقی پر ماتم کرتا ہے کہ اس دولت جاوید کے بعد بھی اس ملک فانی پر نگاہ کی جاسکتی ہے؟ ابن تیمیہ کا یہی حال تھا، الملک الناصر نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے مطیع ہو گئے ہیں، اور آپ کے دل میں سلطنت پر قبضہ کرنے کا خیال ہے؟ شیخ نے بڑے اطمینان کے ساتھ بلند آواز سے جس کو تمام حاضرین نے سنا جواب دیا:۔

انا افعل ذلك؟ واللّٰه ان ملكك و	میں ایسا کروں گا؟ خدا کی قسم تمہاری اور تاتاریوں کی
ملك المغل لايساوى عندى فلسًا۔[1]	سلطنت مل کر بھی میری نگاہ میں ایک پیسہ کے برابر نہیں۔

سخاوت و ایثار

اہل اللہ اور اخلاق نبوی کی میراث میں حصّہ پانے والوں کی خاص صفت سخاوت و ایثار ہے، ابن قیم نے "زاد المعاد" میں "الم نشرح" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ شرح صدر کی دولت اور ایمان و یقین کا نتیجہ سخاوت و ایثار ہے، اس لئے جس کو اس دولت سے حصہ ملے گا، سخاوت و ایثار اس کا شعار ہوگا، شیخ الاسلام کے معاصرین و احباب ان کی سخاوت کے بے حد معترف اور ثنا خواں ہیں "الکواکب الدریہ" میں ہے "وهو احد الاجواد الاسخياء الذين يضرب بهم المثل"[2] (وہ ان معدودے چند اہل سخاوت میں سے ہیں جن کی سخاوت ضرب المثل ہے) الحافظ ابن فضل اللہ العمری جو ان کے معاصر ہیں، اس سخاوت کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

كانت تاتيه القناطير المقنطرة من	ان کے پاس ڈھیروں سونا چاندی، اعلیٰ اصیل
الذهب والفضة والخيل المسوّمة	گھوڑے، جانور املاک و اموال آتے، وہ سب کا
والانعام والحرث فيهب ذلك باجمعه	سب اٹھا کر دوسروں کو دے دیتے، یا اہل ضرورت

---

[1] الکواکب الدریہ ص ۱۶۶ [2] ایضاً ص ۱۴۶

ویضعہ عند اھل الحاجۃ فی موضع لا — کے پاس رکھوادیتے اور صرف دوسروں کو دینے کے لئے

یاخذ منہ شیئاً الا لیھبہ ولا یحفظ الا لینذ ھبہ[1] — لیتے اور صرف عطا کرنے کے لئے اٹھا رکھتے۔

ان کی سخاوت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ اگر دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو کپڑا اتار کر دے دیتے :۔

کان یتصدق حتیٰ اذا لم یجد شیئاً — وہ صدقہ کرتے تھے جب کچھ پاس نہ ہوتا تو اپنا کوئی کپڑا

نزع بعض ثیابہ فیصل بہ الفقراء[2] — ہی اتار کر دے دیتے اور اہلِ حاجت کی کاربرآری کرتے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں :۔

وکان یتفضل من قوتہ الرغیف — کھانے سے ایک روٹی، دو روٹیاں بچا لیتے اور

والرغیفین فیوثر بذلک علی نفسہ[3] — اپنے اوپر ایثار کرکے دوسروں کو دے دیتے۔

ایثار کا ایک نازک مقام یہ ہے کہ آدمی اپنے دشمنوں اور حریفوں کے ساتھ فراخ دلی بلکہ عفو واحسان اور اس سے آگے بڑھ کر دعا وخیر خواہی کے ساتھ پیش آئے، یہ مقام ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو انانیت اور حظوظ نفس سے بہت آگے بڑھ چکے ہوں اور ان پر نعمائے الٰہی کی ایسی بارش ہو اور سکینت وسرور اس درجہ کا حاصل ہو کہ وہ ان سب مخالفتوں کو ان کے مقابلہ میں ہیچ اور پرکاہ سمجھتے ہوں اور جن کے اندر اپنے دشمنوں اور مخالفین کے لئے بھی خیر طلبی ورحم کا جوش پیدا ہوتا ہو، اوپر گذر چکا ہے کہ ۷۰۹ھ میں جب وہ دوسری بار رہا ہوئے تو سلطان نے تنہائی میں ان سے ان قضاۃ کے قتل کے بارے میں فتوے لینا چاہا جنھوں نے جاشنگیر کی حمایت کی تھی، اور سلطان کی معزولی کا فتویٰ دیا تھا، اور یہ بھی کہا کہ انھوں نے آپ کے خلاف شورش برپا کی، اور آپ کو تکلیف پہنچائی، اس کے جواب میں ابن تیمیہؒ نے ان لوگوں کی بڑی مدح وتوصیف کی، اور پرزور الفاظ میں سلطان سے ان کی سفارش کی، اور اس کو ان کے قتل کے ارادہ سے باز رکھا، ان کے سب سے بڑے

---

[1] الکواکب ص۱۵۸ [2] ایضاً ص۱۵۷ [3] ایضاً

حریف ومدّمقابل قاضی ابن مخلوف مالکی کا یہ مقولہ بھی گذر چکا ہے کہ "ہم نے ابن تیمیہ جیسا عالی ظرف وفراخ حوصلہ نہیں دیکھا کہ ہم نے تو ان کے خلاف سلطنت کو آمادہ کیا، لیکن ان کو جب قدرت حاصل ہوئی تو ہم کو صاف معاف کردیا، اور الٹے ہماری طرف سے وکالت ومدافعت کی۔"

ان کے تلمیذ رشید اور ہر وقت کے ساتھی حافظ ابن قیّم کہتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے دعائے خیر کرتے تھے، میں نے نہیں دیکھا کہ وہ ان میں سے کسی کے لئے بددعا کرتے ہوں، میں ایک روز ان کے سب سے بڑے حریف اور ایک ایسے صاحب کی خبر وفات لے کر آیا جو عداوت اور ان کو ایذا پہنچانے میں سب سے آگے تھے، انھوں نے مجھے جھڑک دیا اور منہ پھیر لیا، انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھی، پھر فوراً ان کے مکان پر گئے، ان کی تعزیت کی، اور فرمایا کہ مجھے ان کی جگہ پر سمجھنا، جس چیز کی تم کو ضرورت پڑے گی میں تمہاری اس میں مدد کروں گا، اسی طرح ان سے ایسی ملاطفت ودلجوئی کی باتیں کیں، جن سے وہ نہایت مسرور ہوئے، اور ان کو بڑی دعائیں دیں اور ان کو اس پر سخت استعجاب ہوا۔

عفو واحسان، اعداء ومخالفین کے ساتھ شفقت ومرحمت کا یہ مقام مالی ایثار سے بہت بلند اور آگے کا مقام ہے، یہ وہ مقام ہے جو صدّیقین وخواص اولیاء کو ملتا ہے، ابن تیمیہ اس مقام پر فائز تھے، اور گویا زبانِ حال سے وہ کہتے تھے، جو اسی مقام کے کسی صاحبِ حال شاعر نے فارسی میں کہا ہے ؎

ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد	ہر کہ مارا رنج دادہ راحتش بسیار باد
ہر کہ اندر راہ ما خارے نہد از دشمنی	ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

فروتنی وبے نفسی

فروتنی وبے نفسی اہل اللہ کی خاص صفت اور وہ مرتبۂ کمال ہے جو ہزار کرامتوں سے بلند اور

ہزار فضیلتوں سے بالاتر ہے، یہ مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب خودی مٹ جاتی ہے اور نفس کا کامل تزکیہ ہوجاتا ہے، شیخ الاسلام کو اپنے کمالات علمی اور عروج دینی و دنیاوی کے ساتھ یہ کمال بھی حاصل تھا، ان کے اقوال پتہ دیتے ہیں کہ وہ بے نفسی و للّٰہیت اور ہضم نفس اور انکارِ ذات کے درجۂ علیا پر پہونچے ہوئے تھے ابن قیم فرماتے ہیں کہ وہ اکثر کہتے تھے کہ "مالی شئ، ولا منی شئ، ولا فیّ شئ" اگر کوئی ان کے منھ پر ان کی تعریف کرتا تو فرماتے:۔

واللہ انی الی الآن اجدّد اسلامی کلّ	خدا کی قسم میں ابھی تک برابر اپنے اسلام کی تجدید کرتا رہتا
وقت وما اسلمت بعدُ اسلاماً جیداً۔[1]	ہوں اور ابھی تک نہیں کہہ سکتا کہ کامل طور پر مسلمان ہوں

کبھی کوئی تعریف کرتا تو یوں بھی فرماتے کہ "انا رجل ملۃ لا رجل دولۃ"[2] (میں امت کا ایک عام آدمی ہوں، سلطنت و حکومت کا آدمی نہیں۔)

بے نفسی اور عبودیت کے اس درجہ پر پہونچ کر آدمی کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ وہ اپنا نہ کسی پر کوئی حق سمجھتا ہے، نہ اس کا کوئی مطالبہ کرتا ہے، نہ اس کو کسی سے شکایت ہوتی ہے، نہ اپنے نفس کا انتقام لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا، ابن قیم فرماتے ہیں:۔

سمعت شیخ الاسلام ابن تیمیۃ قدس	میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ سے سنا
اللہ روحہ، یقول العارف لا یری لہ	ہے کہ فرماتے تھے کہ عارف اپنا کسی پر کوئی حق نہیں
علی احد حقاً ولا یشھد لہ علی غیرہ فضلاً	سمجھتا، اور نہ یہ جانتا ہے کہ اس کو کسی پر کوئی فضیلت
ولذلک لا یعاتب ولا یطالب ولا	حاصل ہے اسی لئے نہ وہ کسی کی شکایت کرتا ہے،
یضارب۔[3]	نہ مطالبہ کرتا ہے نہ مار پیٹ کرتا ہے۔

ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ "حدیثِ دیگراں" میں وہ اپنا ہی حال

---

[1] مدارج السالکین جلد ۱ ص ۶۹۶ [2] الکواکب الدریہ ص ۱۶۴ [3] مدارج السالکین جلد ۱ ص ۴۹۶

بیان کر رہے ہیں۔

سکینت و سرور

اس ایمان و یقین اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ اس صحیح تعلق اور مخلوق سے آزادی اور قلب کی وارستگی اور بے تعلقی کے بعد انسان کو وہ سکینت و سرور حاصل ہوتا ہے کہ اس زندگی ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے، شیخ الاسلام نے (جیسا کہ ابن قیم نے نقل کیا ہے) خود ایک بار فرمایا کہ:۔

ان فی الدنیا جنۃ من لم یدخلھا لم	دنیا میں (مومن کے لئے) ایک ایسی جنت ہے کہ جو اس میں
یدخل جنۃ الآخرۃ۔[1]	یہاں داخل نہیں ہوا آخرت کی جنت سے بھی محروم رہے گا۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کبھی اپنے مخلص بندوں کو اس زندگی میں بھی "لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ" کی دولت عطا فرماتا ہے، اور وہ اس کا نمونہ (بقدر وسعت دنیا) یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں، شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل تھی، خود بھی ایک بار جوش میں آکر فرمایا:۔

ما یصنع اعدائی بی، ان جنّتی وبستانی	میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں، میری جنت اور
فی صدری ان رحت فھی معی	میرا باغ میرے سینے میں ہے جہاں جاؤں گا وہ
لا تفارقنی۔[2]	میرے ساتھ ہے۔

یہ نسبت سکینت و رضا زندگی میں اور بعد وفات ان کے ساتھ رہی، ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ان کو خواب میں دیکھا، میں نے ان سے بعض اعمالِ قلبیہ کا ذکر کیا، اس پر شیخ نے فرمایا:۔

امّا أنا فطریقی الفرح والسرور بہٖ۔[3]	بھائی میری نسبت تو فرحت و سرور کی ہے۔

---

[1] الرد الوافر ص ۳۶ [2] الوابل الصیب ص ۶۶ [3] اغاثۃ اللھفان۔

ابن قیم لکھتے ہیں :-

وھٰکذا کانت حالہ فی الحیاۃ یبدو ذلک علیٰ ظاھرہ وینادی بہ علیہ حالہ[1]۔

یہی حالت ان کی زندگی میں تھی کہ ان کے چہرہ پر فرحت و سرور کے آثار نظر آتے تھے اور ان کی کیفیت اس کا اعلان کرتی تھی۔

کمال اتباع سنت

اس مقام (قبولیت و صدیقیت) کی ابتداء اتّباع سنت سے ہے اور اس کی انتہا بھی کمالِ اتّباعِ سنت پر ہے، حدیث و سنت کے ساتھ ابن تیمیہ کا شغف و انہماک ان کے مخالفین کو بھی تسلیم ہے، لیکن یہ شغف و انہماک محض علمی و نظری نہ تھا، علمی اور ظاہری بھی تھا، ان کے معاصرین شہادت دیتے ہیں کہ مقامِ رسالت کا جیسا ادب و احترام، اور اتّباع سنت کا جیسا اہتمام ابن تیمیہ کے یہاں دیکھا کسی اور کے یہاں نظر نہیں آیا، حافظ سراج الدین البزّار قسم کھا کر کہتے ہیں :-

لا واللہ ما رأیت احداً اشد تعظیماً لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا احرص علیٰ اتّباعہ ونصر ما جاء بہ منہ[2]۔

خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اتنا ادب و احترام کرنے والا اور آپ کے اتّباع اور آپ کے دین کی نصرت کی حرص رکھنے والا ابن تیمیہ سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔

یہ چیز ان پر اتنی غالب اور ان کی زندگی میں نمایاں تھی کہ دیکھنے والوں کا قلب شہادت دیتا تھا کہ اتّباع کامل اور سنت کا عشق اس کا نام ہے، علامہ عماد الدین الواسطی فرماتے ہیں:-

ما رأینا فی عصرنا ھٰذا من تستجلی النبوۃ

ہم نے اپنے زمانہ میں ابن تیمیہ ہی کو ایسا پایا کہ نبوت محمدیہ

---

[1] مدارج السالکین [2] الکواکب الدریۃ صد ۱۴۹

المحمدیۃ وسننہا من اقوالہ وافعالہ	کا نور ان کی زندگی میں اور سنتوں کا اتباع ان کے
الّا ھذا الرّجل یشہد القلب الصحیح انّ	اقوال و افعال میں عیاں تھا قلبِ سلیم اس کی شہادت
ھذا ھو الاتباع حقیقۃ۔[1]	دیتا تھا کہ حقیقی اتباع اور کامل پیروی اس کا نام ہے۔

صالحین میں مقبولیت اور علمائے وقت کی شہادت

کسی انبوہ اور عوام کی بھیڑ کا کسی شخص کی تعریف کرنا مقبولیت عند اللہ واستقامت اور علوم نبوت کی دلیل نہیں، دلیل اس کے زمانہ کے اہلِ صلاح واستقامت اور اہلِ علم اور اہلِ بصیرت کی شہادت اور توصیف ہے نیز یہ کہ اس کے پیرؤں، اس سے محبت و تعلق رکھنے والوں اور اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں میں صلاح وسداد، حسن اعتقاد، تقوی واحتیاط اور آخرت کی فکر و اہتمام پایا جائے، اور وہ اپنے ابنائے زمانہ سے اپنی دینداری اور سلامت روی میں ممتاز ہوں، ابن تیمیہ کا معاملہ یہی تھا کہ اس زمانہ کے ممتاز ترین اہلِ صلاح ورشد، اور اصحاب علم و نظر ان کی عظمت و فضیلت، صحت اعتقاد اور سلامت عقیدہ کے قائل و معترف اور ان کے مداح تھے، اور ان کے مخالفین میں بڑی تعداد حکومت کے متوسّلین اور ابنائے دنیا کی تھی، جو جاہ طلبی کے مریض اور دولت و عزّت کے خواہاں تھے[2]، "صاحبِ کواکب" لکھتے ہیں:

قالوا ومن امعن النظر ببصیرتہ لم یر	لوگ بیان کرتے ہیں کہ جو ذرا غور سے کام لے گا وہ
عالمًا من اھل ای بلدٍ شاء موافقًا لہ	دیکھے گا کہ ان کا جو موافق جس شہر میں بھی ہے وہ اس
الا وراٰہ من اتبع علماء بلدہٖ للکتاب و	شہر کے علماء میں سب سے زیادہ کتاب و سنت کا متبع
السنۃ واشغلہم بطلب الآخرۃ والرغبۃ	اور طلبِ آخرت میں مشغول اور سب سے زیادہ اس کا

---

[1] جلاء العینین ص۸ [2] اس کلیہ سے وہ حضرات مستثنیٰ ہیں جن کو کوئی غلط فہمی تھی، یا ان کا اختلاف خالص علمی و اصولی تھا" ومامن عام الا وقد خُصّ منہ البعض"

فیھا وابلغھم فی الاعراض عن الدنیا	حریص اور دنیا سے بے پرواہ، اور اس کی طرف
والاھمال لھا ولا یری عالماً مخالفاً منحرفاً	غیر متوجہ نظر آئے گا، اس کے برخلاف ان کا جو مخالف
عنہ الا وھو من اکبرھم نھمۃ فی جمع الدنیا	نظر آئے گا وہ دنیا کا حریص، بوالہوس، ریاکار اور
واکثرھم ریاءً او سمعۃ واللہ اعلم۔[۱]	شہرت کا طالب دکھائی دے گا۔ واللہ اعلم۔

علامہ ذہبی کے یہ الفاظ بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں :۔

واخیف فی نصر السنۃ المحفوظۃ حتّٰی	سنت کی نصرت کے جرم میں ان کو بہت ڈرایا
اعلی اللہ تعالٰی منارہ وجمع قلوب	دھمکایا گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سرخرو
اھل التقوی علی محبتہ والدعاء لہ۔[۲]	اور معزز کیا، اور اہل تقویٰ کے قلوب کو ان کی
	محبت اور دعا کے لئے مجتمع کر دیا۔

فراست وکرامت

ہر چند کہ کشف وکرامت نہ بزرگی ومقبولیت کا جزء ہے، نہ اس کی دلیل، محققین نے صاف لکھ دیا ہے کہ "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" اور یہ مسئلہ اب کسی بحث کا محتاج نہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے مقبول بندوں کو بطریق انعام یہ دولت بھی عطا فرماتا ہے، اور ان کے ہاتھوں یا زبان سے ایسے واقعات کا ظہور ہوتا ہے، جو ان کی مقبولیت ووجاہت کے مؤیّدات وآثار میں سے ہوتے ہیں، اہلِ سنت کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ "کرامات الاولیاء حق" اور قرآن وحدیث میں اس کے متعدد شواہد وواقعات ہیں، اور خود شیخ الاسلام کی کتابوں میں اس مسئلہ کی تقریر اور اس حقیقت کا اثبات ہے۔

---

[۱] الکواکب الدریہ ص۱۶۱ [۲] جلاء العینین ص۶

ان واقعات کی شہادت جو بطریق کرامت وخرق عادت پیش آئے ان کے تلامذہ واحباب ومعاصرین نے دی ہے، اور متأخرین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اس قدر مشہور اور بکثرت منقول ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں، علامہ عینی صاحب "عمدۃ القاری" شرح البخاری، تقریظ "الرد الوافر" میں لکھتے ہیں :۔

وھذا الامام مع جلالۃ قدرہ فی العلوم	اپنی علمی عظمت وکمال کے ساتھ ان سے ایسی کرامات
نقلت عنہ علی لسان جم غفیر من الناس	کا بھی صدور ہوا ہے جس کو ایک جم غفیر نے نقل کیا
کرامات ظھرت منہ بلا التباس[1]	ہے اور ان میں شبہہ کی گنجائش نہیں۔

انہی کرامات کا ایک شعبہ "فراستِ صادقہ" ہے جو اکابر مومنین و اولیائے متقین کو حاصل ہوتی ہے، اس فراست کے عجیب و غریب واقعات نقل کئے جاتے ہیں، حافظ ابن قیم نے "مدارج السالکین" اور دوسری کتابوں میں اس "فراست" کے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں، "مدارج السالکین" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

ولقد شاھدت من فراسۃ شیخ الاسلام	میں نے شیخ الاسلام کی فراست کے عجیب و غریب
اموراً عجیبۃ، وما لم نشاھدہ منھا اعظم	واقعات کا مشاہدہ کیا ہے اور جو واقعات میرے
واعظم، ووقائع فراستہ تستدعی	مشاہدہ میں نہیں آئے (بلکہ میں نے معتبر لوگوں کی
سفراً ضخماً۔[2]	زبانی سنے ہیں) وہ اور بڑھ چڑھ کر ہیں، ان کی فراست
	کے واقعات کے نقل کرنے کے لئے ضخیم کتاب چاہیے۔

مسئلۂ وحدۃ الوجود، فنا، بقا، معرفت، اعمالِ قلبیہ وغیرہ پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عملی طور پر بھی ان منازل سے گذرے ہوئے تھے، اور اس سلسلہ میں ان کو "اذواقِ عالیہ" اور "احوالِ صحیحہ" حاصل تھے، اور جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ محض عام ذہانت، قوتِ علم یا

---

[1] الرد الوافر ص ۸۹ [2] مدارج السالکین جلد ۲ ص ۲۵۰

زورِ قلم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کے تجربات و مشاہدات ہیں، ان مسائل و مباحث میں بعض مرتبہ ان کا کلام اور تحقیقات محققینِ صوفیہ اور مجتہدینِ فنِ سلوک (مثلاً مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ) کے کلام و تحقیقات سے مل جاتی ہیں، "رسالۃ العبودیۃ" میں فنا کے اقسام اور اس کے مراتب و مقامات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فنا کی تین قسمیں ہیں، ایک فنا کا مقام وہ ہے جو انبیاء و اولیاء کاملین کو حاصل ہوتا ہے ایک وہ مقام ہے جو ان اولیاء و صالحین کو حاصل ہوتا ہے، جو کمال و ترقی کے اس درجہ پر نہیں ہوتے ایک مقام منافقین و ملحدین اہل تشبیہ کا ہے، پہلا مقام یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے ایسی فنائیت حاصل ہو جائے کہ صرف اللہ ہی کے لئے محبت اور اللہ ہی کی عبادت، اللہ ہی پر توکل، اور اللہ ہی کی طلب رہ جائے ماسوا کا کوئی گذر نہ رہ جائے، شیخ بایزید بسطامی کا یہ فقرہ جو منقول ہے کہ "لا ارید الا ما یُرِید" (میں نہیں چاہتا مگر وہی جو وہ چاہتا ہے) کا یہی مطلب لینا چاہئے، یعنی میری مراد وہی ہے جو خدا کا منشا و مرضی ہے، اور اس سے مراد دینی ارادہ ہے، عبد کا کمال یہی ہے کہ اس کے اندر اسی کا ارادہ، اسی کی محبت اور اسی سے رضامندی رہ جائے جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ فرمائے اور جس سے وہ راضی ہو، اور جس کو وہ پسند فرمائے، اور اس سے مراد وہ اوامر الٰہی ہیں جن میں امرِ وجوب یا استحباب ہو، یہ ملائکہ، انبیاء و صالحین کا مقام ہے، جس کو یہ مقام حاصل ہو، اس کو قلبِ سلیم کی دولت حاصل ہے "اِلَّا مَنۡ اَتَى اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ" علماء نے اس کی یہی تفسیر کی ہے کہ وہ غیر اللہ کی عبادت یا غیر اللہ کے ارادے یا غیر اللہ کی محبت سے پاک ہو، اس کا نام فنا رکھا جائے یا نہ رکھا جائے یہی اسلام کی ابتداء و انتہا اور یہی دین کا باطن و ظاہر ہے۔

فنا کی دوسری قسم یہ ہے کہ ماسوا کے مشاہدے سے بالکل استغناء و غیبت کلّی ہو جائے، یہ ایک مقام ہے جو بہت سے سالکین کو پیش آتا ہے، ان کے قلوب کا ذکر و عبادت اور محبت الٰہی

کی طرف ایسا انجذاب اور ایسی زور کی کشش ہوتی ہے کہ ان کے قلوب ماسوا کے مشاہدے کی تاب نہیں لاسکتے، اور اپنے مقصود کے سوا کچھ دیکھ نہیں سکتے، غیر اللہ کا ان کے دل میں گذر بھی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا احساس تک باقی نہیں رہتا، اس مقام میں جس طرح اس کشش اور انجذاب کو دخل ہے، اسی طرح کسی درجہ میں ان کے قلوب کے ضعف کو بھی دخل ہے قرآن مجید میں ہے "وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِىْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا" مفسرین نے لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا دل سوائے حضرت موسیٰؑ کے خیال ویاد کے ہر چیز سے خالی ہوگیا، یہ بات اکثر ان لوگوں کو پیش آتی ہے، جن پر اچانک کسی محبت یا خوف یا امید کا حملہ اور غلبہ ہوتا ہے، اس وقت ان کا دل سوائے اس محبوب یا دشمن یا مطلوب کے ہر چیز سے سادہ اور خالی ہوجاتا ہے، اور بعض اوقات اس محبت یا خوف یا طلب میں ایسا استغراق ہوجاتا ہے کہ اس کے سوا کسی چیز کا احساس باقی نہیں رہتا جب کسی ایسے شخص پر جو فنا کے اس مقام پر ہے، اس حال کا پورا پورا غلبہ ہوجاتا ہے تو وہ اس موجود کے استغراق سے خود اپنے وجود سے بے خبر ہوجاتا ہے، اس ایک شہود کے شہود کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنا شہود نہیں رہتا، اس ایک مذکور کے ذکر کا ایسا تسلّط ہوجاتا ہے کہ اپنا ذکر وفکر بالکل جاتا رہتا ہے، ایک کی معرفت ایسی طاری ہوجاتی ہے کہ اپنی معرفت باقی نہیں رہتی، اس وقت اس ایک وجود کے سوا تمام موجودات اس کی نظر میں معدوم اور فانی ہوجاتے ہیں، جس شخص کو اللہ تعالےٰ کی محبت یا معرفت میں یہ مقام حاصل ہوجائے اس کو تمام مخلوقات معدوم اور فانی نظر آنے لگتی ہیں، اور صرف اللہ تعالےٰ کا وجود باقی رہ جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہوتی ہے کہ مخلوقات حقیقتاً معدوم اور فنا نہیں ہوتیں، بلکہ اس شخص کے شہود اور ذکر میں فنا اور گم ہوجاتی ہیں، اور وہ ان کے ادراک یا شہود سے فانی ہوجاتا ہے جب اس چیز کا غلبہ ہوجاتا ہے،

اور محب میں ایسا ضعف پیدا ہوجاتا ہے کہ اس کی قوتِ تمیز جواب دینے لگتی ہے تو بعض اوقات وہ اپنے کو عین محبوب سمجھنے لگتا ہے، واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص دریا میں کود پڑا، اس کا عاشق کھڑا دیکھ رہا تھا، وہ بھی اس کے پیچھے دریا میں کود پڑا، محبوب نے کہا کہ میں تو دریا میں کود ا تھا، تم میرے پیچھے کیوں کود پڑے، اس نے کہا کہ تمہاری محبت میں مجھے اپنا ہوش نہ رہا، یہاں تک کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ تم اور میں، ایک ہی ہوں۔

اس مقام میں پہونچکر بہت سے لوگوں کے قدم کو لغزش ہوئی ہے، انھوں نے خیال کیا کہ یہ اتحاد ہے، اور محب محبوب سے مل کر ایک ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے اصل وجود میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، یہ بالکل غلط ہے، خالق کے ساتھ کوئی چیز بھی مل کر ایک نہیں ہوسکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی چیز بھی کسی چیز سے ملکر ایک نہیں ہوسکتی، دو چیزوں میں اتحادِ کلّی اسی وقت ہوسکتا ہے، جب وہ دونوں چیزیں بدل جائیں، یا بگڑ جائیں یا ان کے اتحاد سے ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، جو نہ وہ ہوتی ہے، نہ یہ ہوتی ہے، جیسے پانی اور دودھ، پانی اور شراب مل کر ایک تیسری چیز بن جاتی ہے، البتہ ارادہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں اتحاد ہوسکتا ہے، دو ہستیاں ارادے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں متحد ہوسکتی ہیں، ایک جس سے محبت کرے، دوسرا بھی اس سے محبت کرے، ایک جس سے بغض رکھے، دوسرا بھی اس سے بغض رکھے، ایک جس چیز کو پسند کرے، دوسرا بھی اس کو پسند کرے، اسی طرح ایک جس سے دشمنی کرے، دوسرا بھی اس سے دشمنی کرے، لیکن وہ فنائے کلّی جس میں دوسری موجودات بالکل معدوم ہونے لگیں، اور ان کا شہود و احساس بھی باقی نہ رہے، یہ ایک ناقص مقام ہے، ابوبکر و عمر جیسے اکابر اولیاء اور مہاجرین و انصار میں سے جن کو سبقت اور اولیت حاصل تھی، وہ اس فنا میں مبتلا نہیں ہوئے، جب وہ اس سے بالاتر تھے تو انبیاء کرام کا کیا ذکر، اس طرح کے اذواق و حالات صحابۂ کرام کے بعد کے لوگوں کو پیش آئے ہیں، ان کے

قلب پر بعض مرتبہ ایسی ایمانی کیفیات وارد ہوئیں کہ ان کو عقل و ہوش اور تمیز باقی نہیں رہی صحابہ رضی اللہ تعالٰی عنہم بڑے کامل الاحوال، بڑے قوی القلب تھے، ایمانی کیفیات کے وقت نہ توان کی عقلیں معطل ہوتی تھیں، نہ ان میں حجاب، ضعف، سکر و بےخودی، فنا، یا مستی، دیوانگی کی کیفیات پیدا ہوتی تھیں، اس سلسلہ کی ابتداء دورِ تابعین میں ہوئی، اور بصرہ کے مرتاض اور کثیر العبادت لوگوں کو یہ حالات پیش آئے، ان میں سے بعض بعض لوگ قرآن مجید سن کر بےہوش ہو جاتے، بعض کو موت بھی واقع ہوئی، جیسے ابوجہیر نابینا، زرارہ بن ابی اوفیٰ قاضی بصرہ، اسی طرح مشائخ صوفیہ کو بھی فنا اور سکر کی ایسی کیفیتیں حاصل ہوئیں کہ ایسی حالت میں ان میں تعقّل و تمیز باقی نہیں رہی، اکثر ایسی حالت میں ان کی زبان سے ایسے کلمے بھی نکل جاتے جو ہوش میں آنے کے بعد ان کو صریحًا غلط معلوم ہوتے، شیخ بایزید بسطامی، شیخ ابوالحسن نوری اور شیخ ابوبکر شبلی کو یہ چیزیں پیش آئیں، اور ان سے ایسے واقعات نقل کئے جاتے ہیں، لیکن ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، فضیل بن عیاض، بلکہ جنید بغدادی وغیرہ سے اس طرح کی باتیں منقول نہیں، ایسے احوال میں بھی ان کی عقل اور قوتِ تمیز ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی، اور وہ اس طرح کے فنا و سکر میں مبتلا نہیں ہوتے تھے، ان کاملین کے ذہن میں سوا اللہ کی محبت اور اس کے ارادے کے کچھ نہیں ہوتا، ان کا علم اتنا وسیع اور وہ ایسے صاحبِ تمیز ہوتے ہیں کہ ان کو اشیاء اور امور اپنی اصل حالت اور صورت میں نظر آتے ہیں، بجائے اس کہ مخلوقات ان کے لئے معدوم یا غیر مشہود ہو جائیں، وہ اللہ کے حکم و ارادے کے ساتھ قائم، اس کی مشیئت کے تابع اور مسخر نظر آتی ہیں، بلکہ تسبیح و اطاعت میں مشغول، اس طرح یہ مشاہدہ ان کی بصیرت اور تذکر کو بڑھاتا ہے، اور ان کی معرفت، اخلاص، توحید و عبادت میں اضافہ کرتا ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے دعوت دی، اور یہی مومنین محققین اور عارفین و کاملین کا مقام ہے، اور ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ان سب کے امام و سرگروہ ہیں، اور

ان میں سب سے اکمل و اعلیٰ ہیں، اس لئے جب آپ کو معراج ہوئی، اور آپ نے وہاں آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا اور آپ سے ہم کلامی اور سرگوشیاں ہوئیں، پھر جب آپ اس عالم میں تشریف لائے تو آپ کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، اور نہ کسی نے اس کا اثر محسوس کیا حالانکہ حضرت موسیٰؑ پر ایسے مواقع میں ایک بے خودی اور بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔

ایک اور حالت ہے جس کو بھی کبھی فنا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ آدمی اس بات کی شہادت دے کہ خدا کے سوا کوئی چیز بھی موجود نہیں، اور یہ کہ خالق کا وجود ہی مخلوقات کا وجود ہے، اس لئے رب و عبد کے درمیان کوئی فرق نہیں، یہ ان اہل ضلال و الحاد کا فنا ہے، جو حلول و اتحاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں، صاحبِ استقامت مشائخ میں اگر کوئی کہتا ہے کہ مجھے اللہ کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا، یا میں غیر اللہ کی طرف نہیں دیکھتا، یا اسی طرح کے کلمے، تو اس سے مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ مجھے اس کے سوا کوئی رب نظر نہیں آتا، یا مجھکو اس کے سوا کوئی خالق یا اس کے سوا کوئی مدبّر یا اس کے سوا کوئی معبود نہیں نظر آتا، یا میں محبت سے یا خوف کے ساتھ یا امید و رجاء کے ساتھ اس کے سوا کسی پر نظر نہیں ڈالتا، اس لئے کہ قاعدہ یہی ہے کہ آنکھ ہمیشہ اس کو دیکھتی ہے جس سے قلب متعلق ہوتا ہے، جس شخص کو کسی چیز سے محبت ہو، یا امید ہو، یا اس کا خوف ہو، وہ اسی طرف متوجہ رہے گا، اگر اس کے دل میں اس کی محبت یا امید یا خوف یا بغض یا قلب کے تعلق کی کوئی ایسی بات نہیں ہے تو قلب میں اس کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ ہی پیدا نہ ہوگا، اور نہ وہ اس کی طرف نگاہ اٹھائے گا، اور نہ وہ اس کو دیکھے گا، اور اگر کبھی اس پر نظر پڑے گی تو محض اتفاقاً اور محض نگاہ، جیسے کوئی شخص کسی دیوار کو یا کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہے، جس سے اس کا قلب متعلق نہیں، مشائخ صالحین کبھی خالص توحید اور اخلاص کامل کے متعلق کلمات ارشاد فرماتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ غیر اللہ کی طرف ملتفت ہی نہ ہو اور نہ

ماسوا پر محبت یا خوف یا امید کے ساتھ نظر ڈالے بلکہ قلب تمام مخلوقات سے بالکل خالی اور فارغ ہو،ان کی طرف وہ اللہ کے نور کے ساتھ نظر کرے حق ہی کے ذریعہ وہ سنے، حق ہی کے ذریعہ وہ دیکھے حق ہی کے ساتھ وہ ہاتھ اٹھائے اور حق ہی کی قوت سے وہ چلے جس سے اللہ کو محبت ہے اس سے وہ محبت رکھے جس سے اللہ کو بغض ہے، اس سے وہ بھی بغض رکھے جس کو اللہ دوست بنائے اس کو وہ بھی دوست بنائے جس سے اللہ دشمنی کرے اس سے وہ بھی دشمنی کرے ان کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے، اور اللہ کے معاملہ میں ان سے نہ ڈرے، یہی وہ قلب سلیم، حنیفی موحد، مسلم، مومن ہے جس میں انبیاء مرسلین والی معرفت تحقیق وتوحید پائی جاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جس پر انبیاء کے پیرو فائز ہوتے ہیں، اور یہی فنائے محمود ہے اسی مقام کے فائزین کی اللہ تعالیٰ نے مدح و توصیف کی ہے اور ان کو اولیاء متقین، حزب مفلحین اور جند غالبین میں شمار کیا ہے۔

باقی فنا فی الوجود والی قسم (توحید وجودی یا وحدۃ الوجود) تو وہ قرامطہ جیسے آلِ فرعون کی تحقیق وتوحید کی معرفت ہے، مشائخ و صالحین میں سے کسی کی بھی یہ مراد نہیں تھی، مخلوقات میں سے میں جس چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہوں، وہی "رب الارض والسمٰوٰت" ہے، یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے، جو پرلے درجہ کا گمراہ ہو، اور فساد عقل یا فساد اعتقاد میں مبتلا ہو یا جنون اور الحاد میں سے کسی کا شکار ہو، تمام مشائخ جو دین میں مقتدا کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ سب اسی مسلک پر متفق ہیں جو اس امت کے سلف اور پیشواؤں کا مسلک تھا کہ خالق سبحانہ و تعالیٰ مخلوقات سے بالکل الگ ایک وجود رکھتا ہے، نہ تو اس کی مخلوقات میں اس کی ذات کا کوئی جزء ہے، اور نہ اس کی ذات میں اس کی مخلوقات کا کوئی جزء، وہ سب اس پر متفق ہیں کہ قدیم کو حادث سے الگ اور خالق کو مخلوق سے ممتاز سمجھنا چاہئے، اس بارہ میں ان کے جو اقوال وارشادات منقول ہیں، اس مختصر سے مضمون میں ان کی گنجائش نہیں، انھوں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ قلوب کو کبھی کبھی ایسے امراض

وشبہات پیش آتے ہیں، اور بعض لوگوں پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ ان کو مخلوقات کے وجود کا مشاہدہ ہوتا ہے، اور وہ قوتِ تمیز کی کمزوری یا فقدان کی وجہ سے ان کو خالق الارض والسمٰوٰت سمجھنے لگتے ہیں، جیسے ایک شخص آفتاب کی ایک شعاع دیکھتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہی وہ آفتاب ہے جو آسمان میں ہے۔

یہاں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ خالق ومخلوق میں تفریق کے دو مقام ہیں، ایک مقام وہ ہے کہ بندہ تفرقہ کا مشاہدہ کرے، اور کثرت اس کو پریشان کرے، اس کا قلب اس کثرت وتفرقہ کی وجہ سے انتشار میں رہے، وہ قلب ونظر کے انتشار میں گرفتار رہے، کبھی محبت کبھی خوف اور کبھی رجاء کی وجہ سے جو ان مخلوقات کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے، اس کو یکسوئی اور توحید حقیقی حاصل نہ ہو، جب انسان اس تفریق سے جمع کی طرف اور کثرت سے وحدت کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اس قلب کو جمعیت اور اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کی توحید وعبادت کی لذت حاصل ہوتی ہے، اور اس کا قلب مخلوقات کی طرف متوجہ رہنے کے بعد اللہ تعالےٰ کی طرف کلّیۃً ملتفت ہو جاتا ہے، اس کی محبت، اس کا خوف، اس کی امید، اس کی استعانت سب اللہ تعالےٰ کے ساتھ متعلق ہو جاتی ہے، اس حالت میں بعض اوقات اس کے قلب میں مخلوقات کی طرف نظر کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، جس کے ذریعہ وہ خالق ومخلوق کے درمیان امتیاز کرے، اس کو حق تعالےٰ کی طرف التفات کلّی اور خلق کی طرف سے اعراضِ کلّی حاصل ہوتا ہے، ہم نے فنا کی جس دوسری قسم کا اوپر ذکر کیا ہے، یہ حالت بھی اس سے ملتی جلتی ہے لیکن اس کے بعد تفریق کا ایک دوسرا مقام ہے، جو اس سے بلند وبرتر ہے، وہ یہ کہ بندہ مشاہدہ کرے کہ مخلوقات اللہ تعالےٰ کے ساتھ قائم اس کے امر کے تابع، اور اس کے ارادہ سے مسخّر ہیں، اللہ تعالےٰ کی وحدانیت کے سامنے وہ ان کی کثرت کو معدوم دیکھے، وہ یہ مشاہدہ کرے کہ اللہ تعالےٰ مصنوعات کا رب، الٰہ، خالق اور مالک ہے، ایسی حالت میں کہ اس کا دل اللہ تعالےٰ

کی طرف یکسو ہوتا ہے، اور اس کو اخلاص و محبت، خوف و رجا، استعانت و توکل علی اللہ، حبّ فی اللہ و بغض فی اللہ کی جیسی کیفیات حاصل ہوتی ہیں، وہ خالق و مخلوق کے درمیان فرق کو بھی صاف صاف دیکھ رہا ہوتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان صاف صاف تمیز کرتا ہوتا ہے، وہ مخلوقات کے تفرّق و کثرت کو بھی دیکھتا ہوتا ہے اور اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا رب، اس کا مالک اور خالق ہے (ان اللہ رب کل شیئٍ و ملیکہ و خالقہ وانّہ ھو اللہ لا الٰہ الا ھو) یہی صحیح اور مستقیم شہود ہے، اور یہی "لا الٰہ الا اللہ" کی تحقیقی شہادت ہے۔[1]

ان کی تصنیفات میں اس طرح کی تحقیقات اور علوم صحیحہ بہت ہیں، حافظ ابن قیم نے "مدارج السالکین" میں ان کی تحقیقات و کیفیات کا بہت سا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، ان کے انہی معارف و احوال کو دیکھ کر ملّا علی قاری نے استاد و شاگرد کے متعلق لکھا ہے :-

ومن طالع شرح منازل السائرین	جو شخص "منازل السائرین" کی شرح (مدارج السالکین)
تبیّن لہ انھما کانا من اکابر اھل	کا مطالعہ کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ ابن تیمیہ و
السّنۃ والجماعۃ ومن اولیاء ھٰذہٖ	ابن قیّم اہلِ سنت والجماعت کے اکابر اور امتِ
الامۃ۔[2]	محمدی کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔
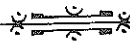
[1] رسالۃ العبودیۃ فی تفسیر قولہ تعالیٰ "یاایّھا النّاس اعبدوا ربّکم" ص۳۵-۳۸ شائع "مجموعۂ رسائل" مطبعہ حسینیہ مصریہ۔

[2] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ج ۴ ص ۴۲۷

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اسلام کی تاریخ دعوت وعزیمت میں جو اہم کارنامہ انجام دیا، وہ اگرچہ بہت سے علمی و عملی شعبوں اور پہلوؤں پر حاوی ہے لیکن اس کو ان چار۴ حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، جو ان کی تاریخ اصلاح و تجدید میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں، یہ چار اہم شعبے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔عقیدۂ توحید کی تجدید اور مشرکانہ عقائد و رسوم کا ابطال۔

۲۔فلسفہ و منطق اور علم کلام کی تنقید اور کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی ترجیح۔

۳۔غیر اسلامی ملل و فرق کی تردید اور ان کے عقائد، رسوم و اثرات کا مقابلہ۔

۴۔علوم شریعت کی تجدید اور فکر اسلامی کا احیا۔

عقیدۂ توحید کی تجدید اور مشرکانہ عقائد و رسوم کا ابطال

امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں مشرکانہ عقائد و رسوم

غیر مسلم اور عجمی اقوام کے اختلاط، اسمٰعیلی و باطنی حکومت کے نفوذ و اثر، نیز جاہل اور گمراہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو چلا تھا، بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارے میں اسی طرح کے

غالیانہ اور مشرکانہ خیالات اور عقیدہ رکھنے لگے تھے، جو یہود و نصاریٰ حضرت عزیرؑ و مسیحؑ اور اپنے احبار اور رہبان کے متعلق رکھتے تھے، بزرگانِ دین کے مزارات پر جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ ان سب اعمال و رسوم کی ایک کامیاب نقل تھی، جو غیر مسلموں کی عبادتگاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتے تھے، اہل قبور سے صاف صاف استعانت و استغاثہ کا معاملہ ہونے لگا تھا، ان سے فریاد اور ان کی دہائی دینے، سوال و دعا کرنے کا رواج ہو گیا تھا، ان کی قبور پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے، ان پر سال بسال میلہ لگانے اور دور دور سے سفر کر کے وہاں آنے کا عام دستور تھا، ساتویں صدی کے آخر میں یہ غلو اور عقیدہ اور عمل کا فساد جس حد تک پہنچ گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ ان اقتباسات سے ہو سکتا ہے، جو خود شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیفات اور تحریروں سے ماخوذ ہیں، ان اقتباسات میں انھوں نے کسی جواب کے سلسلہ یا کسی بحث کے ضمن میں اپنے زمانہ کی بعض گمراہیوں کا ذکر کیا ہے، اور اس سے ان کے زمانہ کے دینی انحطاط اور قلب اسلام پر جاہلیت کے حملہ کی شدت کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے:-

"بہت سے لوگوں نے مُردے کو بالکل خدا کا درجہ اور اس زندہ پیر کو جو اس کی قبر کا مجاور یا اس کا جانشین ہے، پیغمبر کا مرتبہ دے رکھا ہے، وہ مُردے سے اپنی کار برآری اور مشکل کشائی کا مطالبہ کرتے ہیں، انھوں نے اپنے اس زندہ پیر یا بزرگ کو یہ مرتبہ دے رکھا ہے کہ جس چیز کو وہ حلال کر دیں، وہی حلال، اور جس چیز کو وہ حرام کہہ دیں وہی حرام ہے، انھوں نے درحقیقت اپنے حساب سے اللہ تعالیٰ کو خدائی کے منصب اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے مرتبہ سے سبکدوش کر دیا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نومسلم یا ان کا پیرو عقیدت مندی کی بنا پر آتا ہے اور صاحبِ مزار سے کسی بادشاہ کے ظلم کو دفع کرنے یا کسی اور مطلب کی کار برآری کے لئے دعا کرتا ہے تو یہ مجاور اندر جاتا ہے، اور کہتا ہے کہ میں نے حضرت صاحب سے عرض کر دیا، حضرت صاحب نے پیغمبر صاحب سے

فرمادیا، پیغمبر صاحب نے اللہ تعالیٰ تک پہونچایا، اللہ تعالیٰ نے فلاں بادشاہ کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ (خبردار فلاں آدمی پر زیادتی نہ ہونے پائے) کیا یہ کھلا ہوا مشرکین و نصاریٰ کا دین نہیں ہے؟ اس میں تو اتنی غلط بیانی اور ایسا جہل صریح ہے، جس کو ہر مشرک اور ہر نصرانی بھی گوارا نہیں کرسکتا، اور وہ بھی اس فریب میں نہیں آسکتے، یہ مجاور لوگ جس طرح بے تکلف نذر و نیاز اور ان قبروں کے چڑھاوے کھاتے ہیں، وہ قرآن مجید کی اس آیت کی پوری تفسیر و تصویر ہے "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ"[1] (اے ایمان والو۔ یہود و نصاریٰ کے۔ بہت سے علماء و مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں، اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں")

کھلی قبر پرستی

"ان جہلا میں سے بہت سے لوگ صاف صاف قبر کی طرف منھ کر کے نماز پڑھتے ہیں بعض بعض لوگوں کو اس طرح دعا کرتے سنا گیا ہے کہ "حضرت میری مغفرت فرما دیجئے، مجھ پر رحم کھائیے" بعضے آدمی قبر کو سامنے رکھ کر اور کعبہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قبر تو خواص کا قبلہ ہے اور کعبہ عوام کا، یہ بھی ان لوگوں کا مقولہ ہے، جو عبادت و زہد میں ممتاز ہیں، اور جن کے سیکڑوں ہزاروں مرید و معتقد ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے شیخ کے پیروؤں میں سب سے بہتر ہوں، اس شخص کا اپنے شیخ کے بارے میں قول ہے، بعض ایسے شیوخ اور مقتدا بھی ہیں، جو بڑی ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں، جب مرید اُن کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے ان کو یہ ہدایت کرتے ہیں، کہ وہ شیخ کی قبر پر جا کر چلّہ کھینچے جیسے کہ بت پرست اپنے اپنے بتوں پر آسن جمائے بیٹھے ہوتے تھے، ان قبر پرستوں میں بہت سے لوگوں کو ان قبروں کی پرستش میں وہ رقت و خشوع، دعا کی کیفیت اور حضور قلب حاصل ہوتا ہے، جو ان کو مساجد میں حاصل

---

[1] الرد علی البکری ص ۲۹۸

نہیں ہوتا جن کے متعلق اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے "فِی بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ"
(ترجمہ۔ ان گھروں (مساجد) میں جن کے لئے اللہ کا حکم ہے کہ بلند کئے جائیں اور ان میں اس کا نام لیا جائے[1]")

خدا سے بے خوفی اور صاحبِ مزار سے خوف و خشیت

"ان لوگوں کا اعتقاد اور قبور سے تعلق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ بے تکلف کبائر اور منہیات کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں لیکن جب وہ مزار کا گنبد یا کلس دیکھ لیتے ہیں تو رُک جاتے ہیں، ایک دوسرے سے کہتا ہے، خبردار یہ گنبد کا کلس نظر آرہا ہے، ان کو اس کلس کے نیچے دفن ہونے والے انسان کا تو خیال وخطرہ ہوتا ہے، اور اس خدا کا ذرا بھی لحاظ نہیں ہوتا جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، اور جس کے حکم سے چاند گھٹتا اور بڑھتا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی بحث کرے تو اپنے حریف کو ان بزرگوں کے جلال اور قدرت سے ڈراتے ہیں، بالکل جس طرح مشرکین نے ابراہیم علیہ السلام کو ڈرایا تھا، قرآن شریف میں ہے:۔

وَحَاجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَاجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ	اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا، اس نے کہا
ھَدٰىنِ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِکُوْنَ بِہٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ	کیا تم مجھ سے اللہ کے ایک ہونے میں جھگڑتے ہو اور اس نے
رَبِّیْ شَیْئًا وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا اَفَلَا	میری رہنمائی کی ہے اور جنہیں تم شریک کرتے ہو میں ان سے
تَتَذَکَّرُوْنَ ○ وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ	نہیں ڈرتا، مگر یہ کہ میرا رب مجھے کوئی تکلیف پہنچانا
وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ	چاہے میرے رب نے علم کے لحاظ سے سب چیزوں پہ
یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ	احاطہ کر رکھا ہے کیا تم سوچتے نہیں ہو اور میں تمہارے
اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ	شریکوں سے کیوں ڈروں حالانکہ تم اس بات سے

---

[1] الرد علی البکری صفحہ ۲۹۵

اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝[۲]

نہیں ڈرتے کہ تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو، اس چیز کو جس کی اللہ نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری اگر تم کو کچھ سمجھ ہے تو بتاؤ دونوں جماعتوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون ہے، جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان میں شرک نہیں ملایا، امن ان ہی کے لئے ہے، اور وہی راہِ راست پر ہیں۔[۱]

اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء و استخفاف

"یہ قبر پرست توحید اور خدائے واحد کی عبادت کا مذاق اڑاتے ہیں، اور جن کو خدا کو چھوڑ کر اپنا شفیع اور کارساز بنا رکھا ہے، ان کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ حج بیت اللہ اور حجاج کی تحقیر کرتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے ائمہ اور شیوخ کی زیارت حج بیت اللہ سے افضل ہے، یہ عقیدہ اہلِ تشیّع اور بہت سے سنّی کہلانے والوں میں بھی پایا جاتا ہے، کچھ لوگ مساجد، اور نماز پنجگانہ کی تحقیر کرتے ہیں، اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے شیخ کی دعا اس سے افضل و اعلیٰ ہے، یہ عقیدہ ان شیعوں میں ابھی تک موجود ہے، جو یونس قیسی کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، ان کی اس گیت سے اندازہ ہوگا۔

تعالوا نخرب الجامع   ونجعل فيه خمارة

ونكسر المنبر   ونجعل منه طنبارة

ونخرق المصحف   ونجعل منه زمارة

---

[۱] الرّد علی البکری ص۲۹۵   [۲] سورۂ انعام ۔ ۸۱۔۸۲۔۸۳

ونتتف لحیۃ القاضی ونجعل منہ اوتارہ[1]

مشرکین کی بیباکی وشوخ چشمی

"ان کی بیباکی کا حال یہ ہے کہ بے تکلف جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں، لیکن اپنے شیخ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتے، ان میں بعض بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو رزق میرے پیر کی طرف سے نہ ملے وہ مجھے قبول نہیں، ان میں سے بعض بکری ذبح کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ" میرے آقا کے نام سے" بعض صاف صاف کہتے ہیں کہ ان کے شیخ انبیاء ومرسلین سے افضل تھے، ان میں سے بعض ان کے متعلق الوہیت کا اعتقاد رکھتے ہیں، جیسے کہ نصاریٰ حضرت مسیحؑ کے متعلق رکھتے تھے، جب وہ اپنے شیخ کا ذکر کرتے ہیں تو بڑی تعظیم وتکریم سے کرتے ہیں، اور ان کی الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں، انھوں نے اپنے اپنے بزرگوں کی طرف سے بڑے بڑے شعر بنا رکھے ہیں، جن میں صاف صاف خدائی کا دعویٰ ہے، اور بڑی بڑی لن ترانیاں ہیں، کوئی کہتا ہے کہ موسیٰؑ طور پر مجھی سے ہمکلام ہوئے تھے، اور میری ہی تجلّی دیکھ کر بیہوش ہو گئے تھے، کوئی کہتا ہے کہ عرش پر میں نے ہی چیخ ماری تھی، جو عالم میں شور مچ گیا، اور سات سمندر میری ہی ہیبت سے تلاطم میں ہیں"[2]

بزرگوں کی الوہیت کا اعتقاد

"بہت سے جہلاء ومشرکین پیغمبروں اور بزرگانِ دین کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی دنیا کا

---

[1] آؤ ہم لوگ مسجد کو: ویران کردیں ، اور اس میں شراب کی دوکان قائم کردیں
اور منبر کو توڑ کر............ اس سے ساز ومزامیر بنائیں
اور قرآن کو پھاڑ کر........ اس سے بانسری بنائیں
اور قاضی کی داڑھی اکھاڑ کر اس سے اس کے تانت بنائیں

[2] الرّد علی البکری صا۳۵۱

انتظام کرتے ہیں، پیدائش اور رزق کی ضرورتوں کا پورا کرنا، مصیبتوں کا دور کرنا ان ہی کا کام ہے، یہ قطعاً مسلمانوں کا عقیدہ نہیں ہوسکتا، نصاریٰ بھی صرف حضرت مسیحؑ کے متعلق ایسا اعتقاد رکھتے ہیں، اس لئے کہ وہ اتحاد و حلول کے قائل ہیں، اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کے متعلق بھی ان کا اعتقاد نہیں باوجودیکہ وہ پرلے درجہ کے جاہل ہیں[1]۔

بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جس شہر یا بستی میں کسی بزرگ کا مزار ہوتا ہے، اسی کی برکت سے ان کو رزق ملتا ہے، ان کی مدد ہوتی ہے، اور دشمنوں سے حفاظت ہوتی ہے، اور ملک محفوظ رہتا ہے، جس شخص سے ان کو اعتقاد ہوتا ہے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ فلاں شہر کا پاسبان ہے، مثلاً سیّدہ نفیسہ مصر و قاہرہ کی پاسبان ہیں، فلاں و فلاں بزرگ دمشق وغیرہ کے محافظ ہیں، فلاں و فلاں بغداد وغیرہ کے پہریدار ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ ان ہی صالحین و انبیاء کی قبروں کی برکت سے ان شہروں اور بستیوں سے بلا دفع ہوتی ہے[2]۔

ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب دشمن نے دمشق کا رخ کیا، تو یہ (قبر پرست) بزرگوں سے فریاد کرنے کے لئے مقابر و مزارات کی طرف روانہ ہوئے جن سے ان کو اس خطرہ کے دفع کرنے کی امید تھی، اور بعض شعراء نے کہا:۔

یا خائفین من التتر	لوذوا بقبر ابی عمر
اے تاتاریوں سے ڈرنے والو	ابو عمرؒ کی قبر کی پناہ میں آجاؤ

دوسرے نے کہا:۔

عوذوا بقبر ابی عمر	ینجیکم من الضرر
ابو عمر کی قبر سے پناہ حاصل کرو	تم کو وہ تکلیف سے نجات دیں گے"[3]

---

[1] الرد علی البکری ص ۳۲۸ [2] الرّد علی الاخنائی ص ۸۲ [3] الرّد علی البکری ص ۳۷۷-۳۷۸

مشاہد کا فتنہ

اس اولیا پرستی اور قبر پرستی کا قدرتی و لازمی نتیجہ یہی ہے کہ مساجد کے مقابلہ میں "مشاہد" کی اہمیت بڑھ جائے، اور وہ "زیارت گاہ خلائق" اور عوام وجہّال کا قبلۂ حاجات بن جائیں، چنانچہ عالمِ اسلام کے چپّہ چپّہ پر ان مشاہد و مزارات کا جال بچھ گیا، ہزاروں، لاکھوں صحیح اور جعلی قبریں بن گئیں، امراء و سلاطین نے بڑی فراخدلی اور حوصلہ مندی سے ان کے لئے املاک و زمین وقف کی، ان مزاروں اور بزرگوں کی جگہوں پر سر بفلک عمارتیں اور طلائی گنبد تعمیر ہوئے، مجاورین، جاروب کشوں، اور خادموں کی ایک مستقل قوم اور امت وجود میں آئی، دھوم دھام اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ان کی طرف سفر کا رواج ہوا، اور بڑے بڑے قافلے دور دراز مقامات سے اس طرح سفر کر کے جانے لگے کہ حجاج کے قافلوں کے ہمسر یا ان سے کچھ بڑھے ہوئے نظر آنے لگے، مساجد سے عام مسلمانوں کی توجہ ہٹ کر مشاہد کی طرف ہو گئی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں "مشاہد و مزارات" نے دینی زندگی میں پوری مرکزیت اور مرجعیت اختیار کر لی تھی، اور وہ بیت اللہ کے حریف و رقیب بن گئے تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیفات و تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ "مشاہد" کا فتنہ کتنا جڑ پکڑ چکا تھا، اور جاہل و اہل غرض مسلمانوں کو اس سے کتنا تعلق ہو گیا تھا، اس فتنہ کے طاقت پکڑنے اور وسیع ہونے میں اس بات کو بھی بڑا دخل تھا کہ باطنی[۱] سلطنت نے صدیوں بڑے کرّوفر سے مغرب اقصیٰ سے مصر و شام تک حکومت کی تھی، اہل رفض و تشیع کو شروع سے مساجد سے زیادہ مشاہد سے اور حرمین سے زیادہ نجف و کربلا و مشہد سے تعلق رہا ہے، امام ابن تیمیہ کی ولادت سے پیشتر اگرچہ مصر کی "فاطمی" سلطنت ختم ہو چکی تھی، لیکن اس کے ذہنی و تہذیبی

---

[۱] یہ عام طور پر "فاطمی سلطنت" کے نام سے معروف ہے، یہ درحقیقت عبیدیوں کی سلطنت ہے، ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول" ص ۳۴۹ دوسرا ایڈیشن۔

اثرات ابھی باقی تھے، خاص طور پر شام میں بڑی تعداد میں شیعہ و اسمٰعیلی موجود تھے، جن کی صحبت کا اثر عام اور جاہل مسلمانوں پر پڑ رہا تھا، پھر غلط قسم کے تصوف نے جس میں بزرگوں کے مزارات و مشاہد خاص اہمیت اور تقدس رکھتے تھے اور ان پر سالانہ اجتماعات (عرس) وغیرہ کا رواج ہو چلا تھا، ان مشاہد و مزارات کو اور زیادہ چمکا دیا تھا، اور اب وہ شرک و بدعات کا ایک بڑا ذریعہ بن گئے تھے، امام ابن تیمیہ ان مشاہد و مزارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

مشاہد و مزارات کا حج

"کچھ لوگ ہیں جو قبروں کا حج کرتے ہیں، کچھ لوگوں نے اس سفر کے آداب و احکام پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا نام انھوں نے "مناسک حج المشاہد" رکھا ہے، چنانچہ ایک شیعہ عالم ابوعبداللہ محمد بن نعمان الملقّب بالمفید کی اسی نام کی مستقل تصنیف ہے جس میں ایسی بہت سی بے سروپا روایات اہلِ بیت کی طرف منسوب کی ہیں، جن کا بے اصل ہونا اہل نظر سے مخفی نہیں، کچھ لوگ بڑی دھوم دھام کے ساتھ مشائخ کے قبور کی زیارت کے لئے سفر کر کے جاتے ہیں اگرچہ وہ اس کو مناسک یا حج تو نہیں کہتے لیکن دونوں میں کوئی فرق نہیں، ان میں سے بعض بعض لوگ جب قسم کھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "وحق النبی الذی تحج الیہ المطایا" وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف حج کا ذکر کرتے ہیں، بیت اللہ کی طرف حج کا ذکر نہیں کرتے، بعض حجّاج کا حج سے بڑا مقصد قبر مبارک کی زیارت ہوتی ہے نہ کہ حج بیت اللہ"[1]

حج بیت اللہ پر ترجیح

"بعض بعض لوگ مقابر کے حج کو حج بیت اللہ پر ترجیح دیتے ہیں، بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر

---

[1] الرّدّ علی البکری ص ۲۹۵

فلاں بزرگ کی قبر کی زیارت دو مرتبہ یا تین مرتبہ کر لی جائے تو ایک حج بن جائے گا، بعض کسی بزرگ کے مزار کو میدان عرفات قرار دیتے ہیں، اور حج کے زمانہ میں سفر کر کے وہاں جاتے ہیں، اور اسی طرح وقوف کرتے ہیں، جیسے مسلمان میدانِ عرفات میں کرتے ہیں، اور مغرب و مشرق میں ایسا ہوتا رہتا ہے، بعض لوگوں کے اعتقاد میں اس مقدس مقام یا اپنے بزرگ کی قبر کا سفر حج سے بھی افضل ہے، ایک مرید نے جس نے سات حج کئے تھے، دوسرے مرید سے کہا کہ شیخ کی قبر کی زیارت ان سات حج کے بدلے میں فروخت کرتے ہو؟ اس نے اپنے پیر سے مشورہ کیا، اس نے اس سے کہا کہ اگر تم نے یہ سودا کر لیا تو تم بڑے گھاٹے میں رہو گے، ان میں بعض کو کہتے سنا گیا ہے کہ جو شیخ کی قبر کے سات پھیرے کرے، اس کو ایک حج کا ثواب ملے گا۔"[1]

مساجد کی ویرانی و کس مپرسی اور مشاہد کی رونق و اہتمام

"ان میں سے بہت سے لوگ مساجد کو ویران رکھتے ہیں اور مشاہد کو بڑا آباد و پر رونق، ان کی مسجد جو جو نمازِ پنجگانہ کے لئے بنائی گئی ہے، بالکل ویران اور بے چراغ نظر آتی ہے، غریب اہلِ محلّہ اگر دری فرش کا انتظام کر دیں تو کر دیں ورنہ یہ بھی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی سرائے ہے، جس کا کوئی پرسان حال نہیں، اس کے مقابلہ میں مزار و مقبرہ کا حال یہ نظر آتا ہے کہ پردے اس پر پڑے ہوئے ہیں، سونے چاندی سے اس کو مرصّع کیا گیا ہے، سنگ مرمر کا فرش ہے، صبح و شام نذر و نیاز آ رہی ہے، کیا یہ اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسولؐ کی کھلی ہوئی تحقیر اور شرک کی علانیہ تعظیم نہیں ہے؟ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ صاحبِ مزار کی دعا اور اس کی دُہائی اللہ کے گھر میں اللہ سے مانگنے اور اس کے نام کی دہائی دینے سے زیادہ مؤثر و مفید ہے، اس لئے قدرتی طور پر خدا کے گھر (مسجد) کے مقابلہ میں اس گھر کو ترجیح حاصل ہوئی، جو مخلوق سے دعا کے لئے بنایا گیا ہے، اگر مسجد کے لئے بھی کوئی وقف ہے، اور مزار کے لئے بھی

---

[1] الرد علی البکری صـ ۲۹۷

کوئی وقف ہے تو مزار کا وقف ان کے نزدیک زیادہ اہم اور مہتم بالشان ہوگا، اور مسجد سے بڑھا ہوگا، اس بارے میں وہ مشرکین عرب کے قدم بہ قدم ہیں، جن کا حال اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ	اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشیوں میں ایک حصہ
نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا	اس کے لئے مقرر کرتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق کہتے
لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى	ہیں کہ یہ اللہ کا حصہ ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے، سو جو
اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ	حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ اللہ کی طرف نہیں جا سکتا
سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۝[۲]	اور جو اللہ کا ہے، وہ ان کے شریکوں کی طرف جا سکتا
	ہے، کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔[۱]

مندرجۂ بالا اقتباسات سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ساتویں اور آٹھویں صدی میں باوجود اس کے کہ طاقتور اسلامی سلطنتیں قائم تھیں، اور بڑے بڑے ائمۂ فن اکابر محدثین وفقہاء موجود تھے، بڑے بڑے مدارس اور علمی مرکزوں کا وجود تھا، عوام وجہلا کن اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا تھے، اور کس درجہ کے مشرکانہ عقائد واعمال مسلم معاشرہ اور عام مسلمانوں کے مزاج میں درخور پا گئے تھے، عوام اور جہلاء سے قطعِ نظر بہت سے علماء اور فقہاء بھی ان عقائد واعمال کے بارے میں بہت سے شبہات میں گرفتار تھے، اور ان کی تحریروں اور فتاویٰ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شرک وتوحید کے بارے میں ان کا ذہن بھی اتنا صاف اور یکسو نہیں تھا، جتنا ایک ایسے شخص کا ہونا چاہئے جس نے عقیدۂ توحید کو براہِ راست قرآن وحدیث سے اخذ کیا ہے، اور جس کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سعادت اور صحابۂ کرام کے دورِ خیر وبرکت کے نمونے اور اقوال واعمال ہیں، اس طبقہ کے طرزِ فکر کا اندازہ جو اپنے زمانہ کے رسوم مروّجہ اور عاداتِ قدیمہ سے متأثر تھا، امام ابن تیمیہ کے معاصر شیخ علی بن یعقوب البکری اور الاخنائی کی ان تحریروں

---

[۱] الرد علی البکری ص۳۵۱ [۲] سورۂ انعام-۱۳۷

کوئی وقف ہے تو مزار کا وقف ان کے نزدیک زیادہ اہم اور مہتم بالشان ہوگا، اور مسجد سے بڑھا ہوگا، اس بارے میں وہ مشرکین عرب کے قدم بہ قدم ہیں جن کا حال اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ	اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشیوں میں ایک حصہ
نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا	اس کے لئے مقرر کرتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق کہتے
لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى	ہیں کہ یہ اللہ کا حصہ ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے، سو جو
اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ	حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ اللہ کی طرف نہیں جا سکتا
سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ[۲] ○	اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے شریکوں کی طرف جا سکتا
	ہے، کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں[۱]۔

مندرجۂ بالا اقتباسات سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ساتویں اور آٹھویں صدی میں باوجود اس کے کہ طاقتور اسلامی سلطنتیں قائم تھیں، اور بڑے بڑے ائمۂ فن اکابر محدثین و فقہاء موجود تھے، بڑے بڑے مدارس اور علمی مرکزوں کا وجود تھا، عوام و جہلا کن اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا تھے، اور کس درجہ کے مشرکانہ عقائد و اعمال مسلم معاشرہ اور عام مسلمانوں کے مزاج میں درخور پا گئے تھے، عوام اور جہلاء سے قطع نظر بہت سے علماء اور فقہاء بھی ان عقائد و اعمال کے بارے میں بہت سے شبہات میں گرفتار تھے، اور ان کی تحریروں اور فتاویٰ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شرک و توحید کے بارے میں ان کا ذہن بھی اتنا صاف اور یکسو نہیں تھا، جتنا ایک ایسے شخص کا ہونا چاہیئے جس نے عقیدۂ توحید کو براہِ راست قرآن و حدیث سے اخذ کیا ہے، اور جس کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سعادت اور صحابۂ کرام کے دورِ خیر و برکت کے نمونے اور اقوال و اعمال ہیں، اس طبقہ کے طرزِ فکر کا اندازہ جو اپنے زمانہ کے رسوم مروّجہ اور عاداتِ قدیمہ سے متأثر تھا، امام ابنِ تیمیہ کے معاصر شیخ علی بن یعقوب البکری اور الاخنائی کی ان تردی

---

[۱] الرد علی البکری ص۳۵۱ [۲] سورۂ انعام۔ ۱۳۷

سے ہوتا ہے، جس کی تردید میں امام ابن تیمیہ نے وہ دو مبسوط کتابیں لکھیں[1]، جن کے اقتباسات اوپر پیش کئے گئے۔

امام ابن تیمیہ کا اصلاحی کام اور مشرکانہ عقائد کی تردید و مخالفت

امام ابن تیمیہ نے ان مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف جہاد و تجدید کا علم بلند کیا، اور عوام کی رضامندی و ناراضگی نیز خواص کالعوام کے قہر و عتاب سے بالکل بے نیاز ہو کر مروّجہ اعمال و رسوم اور مشرکانہ عقائد و خیالات کی تردید کی، اور ان عقائد و تخیّلات پر تیشہ چلایا، جو اس مشرکانہ طرزِ عمل کی بنیاد تھے۔

ان مزارات پر عوام کے ہجوم اور مشرکانہ اعمال و رسوم کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عوام ان اصحابِ مزارات سے اپنے مقاصد و اغراض کے لئے دعا کرتے تھے، ان کے نام کی دہائی دیتے تھے، ان کی پناہ میں آتے تھے، امام ابن تیمیہ نے اپنی تحریروں میں صاف صاف لکھا کہ دعا غیر اللہ سے بالکل جائز نہیں، اور یہ شرک صریح ہے، جو مسلمانوں کی جہالت یا غیر مسلم اقوام کی مخالطت سے مسلمانوں میں داخل ہو گیا ہے۔ "الرّدّ علی البکری" میں لکھتے ہیں:۔

غیر اللہ سے دعا و استغاثہ کی ممانعت

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے اور اس کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یقینی اور بدیہی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی امت کو کسی مُردے پیغمبر یا صالح آدمی سے دعا کرنے کی اجازت نہیں دی، نہ استغاثہ کے طور پر، نہ استعاذہ کے طور پر، اسی طرح آپ کی امت کے لئے کسی مردہ یا زندہ کا سجدہ کرنا جائز نہیں، اور اسی طرح کے وہ اعمال جو عبادات میں شامل ہیں، ہم کو

---

[1] تلخیص کتاب الاستغاثہ المعروف بالرد علی البکری مطبعۂ سلفیہ مصر ۱۳۴۶ھ اور کتاب الرد علی الاخنائی و استحباب زیارۃ خیر البریۃ الزیارۃ الشرعیۃ ایضاً مطبعۂ سلفیہ ۱۳۴۶ھ آخر الذکر کتاب اول الذکر کے حاشیہ پر ہے۔

خوب معلوم ہے کہ آپ نے ان تمام امور سے منع فرمایا ہے، اور یہ سب اس شرک میں داخل ہے جس کو اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے، لیکن چونکہ پچھلے زمانہ میں جہالت بہت عام ہوگئی اور تعلیمات نبوت اور آثار رسالت سے واقفیت بہت کم تھی، اس لئے بہت سے علماء نے اس وقت تک ان جہلا کی تکفیر کرنے سے احتیاط کی ہے، جب تک کہ ان پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور دین کے احکام واضح نہ ہو جائیں[1]۔"

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"میت سے اپنی ضرورت کا سوال یا اس سے استغاثہ جیسا کہ بہت جگہ رواج ہے شریعت محمدیؐ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، یہ بھی درحقیقت بت پرستی کی ایک قسم ہے اسی لئے ان دعا کرنے والوں کے سامنے کبھی کبھی شیاطین صاحب مزار کی صورت میں یا کسی غائب کی شکل میں آتے ہیں، جیسا کہ بت پرستوں کو اکثر ایسا پیش آتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے، "بت پرستی کی ابتداء قبروں ہی سے ہوئی[2]۔"

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"کسی میت یا غائب سے سوال خواہ وہ پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر ان اعمال میں سے ہے، جن کی حرمت پر تمام ائمۂ مسلمین متفق ہیں، اللہ اور اس کے رسولؐ نے نہ تو اس کا حکم دیا، اور نہ صحابہ و تابعین میں سے کسی نے ایسا کیا، اور نہ ائمۂ مسلمین میں سے کسی نے اس کو پسند کیا، جو دین اس وقت ہمارے سامنے ہے اور محفوظ چلا آرہا ہے اس سے بداہتہً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرون خیر میں بالکل اس کا رواج نہیں تھا کہ اگر کوئی شخص کسی مشکل میں یا مصیبت میں گرفتار ہوتا یا اس کو کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ کسی گذشتہ بزرگ یا پیغمبر کا نام لے کر کہتا "یا سیدی فلاں انا فی حسبك (حضور والا

---

[1] الرد علی البکری ص ۳۷۷ [2] ایضاً ص ۵۶

ملائکہ سے دعا کرنے کی ممانعت فرمائی، اسی طرح انبیاء و صالحین اگرچہ اپنی قبور میں زندہ ہیں اور جیسا کہ بعض آثار میں آیا ہے، وہ زندوں کے لئے بھی دعا کرتے ہیں لیکن کسی کو خود ان سے دعا کرنا جائز نہیں اور نہ سلف سے ایسا منقول ہے اس لئے کہ یہ فعل ذریعہ بن جاتا ہے شرک اور ان کی مستقل پرستش کا بخلاف اس کے اگر زندگی میں ان سے کچھ مانگا جائے، یا سوال کیا جائے تو وہ شرک تک نہیں پہنچاتا دوسری بات یہ ہے کہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین انتقال کے بعد زندوں کے لئے جو کچھ دعا و استغفار کرتے ہیں، وہ ایک تکوینی امر ہے جس میں دوسروں کے سوال و دعا کا کوئی دخل نہیں، برخلاف زندگی کے کہ اس میں سائل کا سوال کرنا مشروع ہے انتقال کے بعد وہ ان چیزوں کے مکلّف نہیں رہتے۔"[1]

اہلِ قبور سے دعا کرنے والوں کی قسمیں اور صورتیں

ایک دوسری جگہ وہ قبر پر دعا و سوال کرنے والوں کی قسمیں اور حالات لکھ کر الگ الگ حکم بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"جو شخص کسی پیغمبر یا مرد صالح کی قبر کے پاس آتا ہے یا کسی ایسی قبر کے پاس جس کے متعلق اس کا خیال ہے کہ یہ کسی پیغمبر یا مرد صالح کی قبر ہے (حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے) وہاں سوال و سجدہ کرتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ اس سے اپنی ضرورت کا سوال کرتا ہے مثلاً اس سے اپنے یا اپنے جانوروں کے مرض کا ازالہ، یا اپنے قرض کی ادائیگی، یا اپنے دشمن سے انتقام یا اپنی یا اپنے گھر والوں اور جانوروں کی صحت کی درخواست کرتا ہے اور اسی طرح کے وہ امور جن پر خدا کے سوا اور کسی کو قدرت نہیں تو یہ کھلا ہوا شرک ہے ایسے شخص سے توبہ کرانی چاہیئے اگر وہ توبہ کرلے تو خیر ورنہ قتل

---

[1] ایضاً صـ ۱۳۲

کردیا جائے۔

اگر وہ کہتا ہے کہ میں ان صاحبِ مزار سے یا اس پیغمبر یا ولی سے اس لئے سوال کرتا ہوں کہ اس کو میرے مقابلہ میں خدا سے زیادہ تقرّب حاصل ہے، یہ ان امور میں میری سفارش کر دے، اس لئے میں اللہ کے لئے یہاں اس کو وسیلہ بناتا ہوں جیسے کہ سلطان کے یہاں اس کے خواص و عوام کو وسیلہ بنایا جاتا ہے تو یہ عمل مشرکین و نصاریٰ کا سا عمل ہے، اس لئے کہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنے احبار و رہبان کو صرف شفیع بناتے ہیں، اور ان سے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش چاہتے ہیں، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے متعلق اطلاع دی ہے کہ وہ کہتے ہیں "مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ" (ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب کر دیں۔ الزمر۔ ۳)

اور ارشاد ہوتا ہے:۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ۝ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ (سورہ زمر۔ ۴۳۔ ۴۴)

کیا انھوں نے اللہ کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں کہہ دو کیا اگرچہ وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں کہہ دو ہر طرح کی حمایت اللہ ہی کے اختیار میں ہے آسمانوں اور زمین میں اسی کی حکومت ہے، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اور ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۚ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝ (السجدہ۔ ۴)

تمہارے لئے نہ اس کے سوا کوئی کارساز ہے نہ سفارشی، پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ارشاد ہے:۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط — ایسا کون ہے جو اس کی اجازت کے سوا اس کے یہاں سفارش کر سکے۔ (البقرہ-۲۵۵)

دوسری صورت یہ ہے کہ اس بزرگ یا صاحبِ مزار سے فعل کو طلب نہ کیا جائے، نہ اس سے دعا کی جائے، اس سے صرف یہ درخواست کی جائے کہ وہ حصولِ مقصد کے لئے دعا کر دے، جیسے کسی زندہ انسان سے کہا جاتا ہے کہ میرے لئے دعا کر دیجئے اور جیسے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرتے تھے، تو معلوم ہونا چاہئے کہ زندہ انسان کے معاملہ میں تو یہ جائز اور مشروع ہے، باقی ایک فوت شدہ مردِ صالح یا پیغمبر کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اس سے دعا کی درخواست کرنا شریعت میں نہیں آیا، یہ کوئی مشروع فعل نہیں کہ ہم کسی بزرگ یا پیغمبر سے انتقال کے بعد یہ کہیں کہ ہمارے لئے دعا کر دیجئے یا اپنے رب سے ہمارے لئے یہ مانگ دیجئے، اور نہ کسی صحابی یا تابعی سے ایسا ثابت ہے، اور نہ کسی امام کا یہ مسئلہ ہے، نہ اس کے ثبوت میں کوئی حدیث ہے، اس کے برخلاف صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب قحط پڑا تو انھوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کرائی اور ان کو وسیلہ بنایا اور کہا اے اللہ! جب ہم پہلے قحط میں مبتلا ہوتے تھے تو تیرے نبیؐ کو وسیلہ بناتے تھے، اور تو بارش نازل فرماتا تھا، اب ہم اپنے پیغمبر کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں تو بارانِ رحمت بھیج، چنانچہ بارش ہوئی انھوں نے اس ضرورت اور مصیبت کے وقت یہ نہیں کیا کہ قبرِ انور کے پاس آئیں، اور عرض کریں کہ یا رسول اللہ! ہمارے لئے دعا کر دیجئے، اور بارش بھجوایئے، ہم آپ سے فریاد کرتے ہیں کبھی کسی صحابی نے اس طرح نہیں کیا، یہ ایک ایسی بدعت ہے جس کا قرآن وحدیث سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زائر یوں کہے کہ اے اللہ فلاں شخص کے طفیل جس کا تیرے یہاں

بڑا مرتبہ ہے یا فلاں کی برکت سے یا بحُرمتِ فلاں و فلاں مجھے فلاں چیز عطا فرما، میرے ساتھ ایسا معاملہ فرما، تو یہ بہت سے لوگوں کا معمول ہے، لیکن ایسا کرنا کسی صحابی یا تابعی یا سلف میں سے کسی سے منقول نہیں ہے کہ وہ اس طرح دعا کرتے ہوں، بعض علماء اور اکابر نے اس کی صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اجازت دی ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تھا، ہمیشہ کے لئے نہیں[1]"۔

زندہ ہستی سے بھی کسی ایسی چیز کا مطالبہ جو اسبابِ دنیاوی سے ماوراء ہو جائز نہیں

امام ابن تیمیہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ کسی فوت شدہ بزرگ یا پیغمبر اور صاحبِ مزار سے سوال و طلب اور دعا کرنا جائز نہیں بلکہ کسی زندہ انسان سے بھی کسی ایسی چیز کا مطالبہ جو اسبابِ دنیاوی سے ماوراء اور قدرت "کُنْ فَیَکُوْنُ" سے متعلق ہو، یا ان امور سے تعلق رکھتی ہو، جو صرف خدا کی قدرت و ارادہ سے ہو سکتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص رکھا ہے، ان کے نزدیک ناجائز اور شرک ہے، اپنے رسالۂ "زیارۃ القبور" میں فرماتے ہیں:-

"بندہ کا مطلوب اگر ان امور اور معاملات سے تعلق رکھتا ہے، جن پر صرف خدا کو قدرت حاصل ہے اس کا غیر اللہ سے طلب کرنا خواہ وہ بادشاہ ہو، خواہ نبی، خواہ پیر یا بزرگ، خواہ زندہ ہو یا مردہ جائز نہیں، مثلاً اپنی یا جانوروں کی بیماری سے صحت طلب کرے، یا بغیر کسی معیّن جہت کے اپنے قرض کی ادائیگی چاہے، گھر والوں کی عافیت اور دنیا و آخرت کی بلاؤں کا دفع ہونا، یا دشمن پر

---

[1] رسالہ زیارۃ القبور مشمولہ مجموعہ رسائل ص۱۰۶-۱۱۲ باختصار۔

توسّل کے بارے میں امام ابن تیمیہ کا مسلک مشہور و معلوم ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ان کی مستقل تصنیف "قاعدہ جلیلہ فی التوسّل والوسیلہ" لیکن اکثر ائمہ و علماء اس بارے میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

فتح، قلب کی ہدایت، گناہوں کی مغفرت، جنت میں دخول، جہنم سے چھٹکارا، علم کا حاصل ہو جانا، قرآن کا پڑھ جانا، قلب کی درستی، اخلاق کی آراستگی، نفس کا تزکیہ وغیرہ وغیرہ، یہ سب امور ہیں، جو صرف خدا سے طلب کئے جا سکتے ہیں، یہ جائز نہیں کہ کوئی شخص کسی بادشاہ یا پیغمبر یا پیر سے یہ کہے (خواہ وہ مردہ ہو یا زندہ) کہ میرے گناہ بخش دیجئے، مجھے میرے دشمن پر فتح دیجئے، میرے مریض کو شفا دیجئے، مجھے عافیت عطا کیجئے، یا میرے گھر والوں اور میرے جانوروں کو سلامتی عطا ہو، اور اسی طرح کی دعائیں اور فرمائشیں، اگر کوئی شخص کسی مخلوق سے ان باتوں کا سوال کرے گا خواہ وہ کوئی ہو، تو وہ مشرک ہے، اور انہی مشرکین کی جنس میں سے ہے، جو ملائکہ اور انبیاء کی عبادت کرتے تھے، اور ان کے بتوں اور مورتیوں کی پرستش کرتے تھے، جو ان کی شکل پر انھوں نے بنا رکھی تھیں، اور جیسے نصاریٰ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ محترمہ حضرت مریمؑ سے دعا کرتے تھے۔"[1]

واسطہ کی حقیقت

اس سلسلہ میں ایک بحث واسطہ کی پیدا کی جاتی ہے، اور جو لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یا کسی ولی بزرگ اور مرد صالح سے دعا کرنے یا سفارش کرانے کے مخالف ہیں، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ واسطہ کے منکر ہیں، حالانکہ نبی خلق اور خالق کے درمیان واسطہ ہے، اور اس کے بغیر خدا تک پہنچنا امر محال ہے، امام ابنِ تیمیہ نے واضح طریقہ پر اس کا جواب دیا ہے اور بتلایا ہے کہ واسطہ کے دو مفہوم ہیں، ایک مفہوم برحق اور متفق علیہ ہے، اور اس پر سارے دین کی بنیاد ہے، ایک مفہوم باطل، بے بنیاد اور اختراعی ہے، انھوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ "الواسطہ بین الخلق والحق" کے نام سے لکھا ہے، اس میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

---

[1] زیارۃ القبور صفحہ ۱۰۴-۱۰۵

"رسول کے واسطہ ہونے کا اگر مفہوم یہ ہے کہ مخلوق کے لئے ایک ایسا واسطہ ضروری ہے جو اللہ کا حکم اور اس کا منشاء خلق خدا کو بتلاتا ہے تو یہ سراسر حق ہے، اس لئے کہ خلق خدا کے لئے اللہ تعالےٰ کی مرضیات، احکام منہیات کے معلوم کرنے کا، اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں اپنے دوستوں اور مقبول بندوں کے لئے اللہ تعالےٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، اور اپنے دشمنوں کے لئے جس عذاب کا وعدہ کیا ہے، وہ ان کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا، کون سے اسماء وصفات اللہ تعالےٰ کی ذات بے چوں و بے چگوں کے شایانِ شان اور مناسب ہیں، اور کون سے نامناسب، عقل تنہا اس کی معرفت سے عاجز و درماندہ ہے، یہ سب حقائق اور علوم صحیحہ محض انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں، جن کو اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت و تعلیم کے لئے بھیجا ہے، یہ ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس پر نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہلِ ملل یہود و نصاریٰ تک کا اتفاق ہے، وہ سب خلق و خالق کے درمیان اس طرح کے وسائط کے قائل ہیں، یہ وسائط خدا کے وہ پیغمبر ہیں جنھوں نے اللہ کی طرف سے احکام و اطلاعات پہنچائیں، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ،	فرشتوں اور آدمیوں میں سے اللہ ہی پیغام پہونچانے کے لئے چن لیتا ہے۔ (سورہ حج۔ ۷۵)

جو ان واسطوں کا منکر ہے، وہ باتفاق تمام اہلِ ملل و ادیان کافر ہے[1]:۔

"اور اگر واسطہ کا مفہوم یہ ہے کہ حصول منافع و دفع مضرات کے لئے ایک ایسے واسطہ کی ضرورت ہے مثلاً ایک ایسی شخصیت ضروری ہے جو رزق، نصرت اور بھولے بھٹکے کو راستہ بتلانے میں خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ ہو، لوگ اس سے ان سب چیزوں کا سوال کریں، اور وہ خدا سے لے کر کے دے، اور لوگ اسی سے امید باندھیں تو یہ پرلے درجہ کا شرک ہے جس کی بنا پر اللہ تعالےٰ نے مشرکین کی

---

[1] الواسطہ بین الخلق والحق ص ۴۵-۴۶

تکفیر فرمائی ہے، کیونکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے اولیاء وشفعاء کو اختیار کر رکھا تھا، جن کے ذریعہ سے وہ منافع حاصل کرتے تھے، اور مضرّات سے بچتے تھے۔[۱]

عوام وجہلاء اور بہت سے خواص کالعوام نے یہاں تک غلو کیا تھا کہ صرف حضرات انبیاء اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی نہیں، بلکہ عام اولیاء وصالحین کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ بنا رکھا تھا، اور دعا واستعانت، توکل ورجاء سب کا تعلق انہی سے قائم کر رکھا تھا، امام ابن تیمیہ ان کے بارے میں یہی تفریق کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

"انبیاء علیہم السلام کے علاوہ علم دین کے جو ائمہ اور پیشوا ہیں، ان کے بارے میں بھی یہی تفصیل ہے کہ جو شخص ان کو رسول اور امت کے درمیان واسطہ مانتا ہے، وہ رسول کے احکام ومسائل کے مبلّغ اور معلّم اور امت کے مربّی ومقتدیٰ ہیں، اور نمونۂ عمل، تو یہ بات بجا اور درست ہے، یہ ائمہ وعلماء اگر کسی مسئلہ پر اجماع کرلیں تو ان کا اجماع حجت قطعی ہے، اس لئے کہ یہ سب گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتے اور اگر کسی مسئلہ میں ان کا اختلاف ہو تو اس کو وہ اس میں اللہ ورسول کی طرف رجوع کریں گے، اس لئے کہ ان میں سے کوئی شخص انفرادی حیثیت سے علی الاطلاق معصوم نہیں ہے ان میں سے ہر ایک کے کلام میں تحقیق کا کچھ حصہ لیا جاسکتا ہے، اور کچھ ترک کیا جاسکتا ہے، صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے، جو بالکل معصوم ہے، اور جن کا کوئی حکم وارشاد قابلِ ترک نہیں۔

اور اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ یہ بزرگانِ دین اور ائمہ وعلماء اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان اسی طرح سے واسطہ ہیں، جیسے بادشاہ اور رعیت کے درمیان حاجب ودربان ہوتے ہیں کہ یہی خدا تک اس کی مخلوق کی ضرورتیں پہونچاتے ہیں، اور اللہ ان ہی کے توسط سے اپنے بندوں کو ہدایت اور رزق عطا فرماتا ہے، مخلوق ان سے سوال کرتی ہے، اور وہ خدا سے سوال کرتے ہیں جیسے

---

[۱] الواسطہ ص ۴۶

بادشاہوں کے حاجب و دربان رعیت کی ضرورتیں ان سے طلب کرتے ہیں، لوگ براہ راست بادشاہ سے سوال نہیں کرتے اس کو بے ادبی سمجھتے ہیں، وہ ان حاجبوں سے سوال کرتے ہیں اس لئے کہ ان سے طلب کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے، کیونکہ وہ بادشاہ سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، اور طالب اتنا قریب نہیں ہوتا، اور جو شخص اس نوعیت کے وسائط کا قائل ہے، اور اس معنی میں بزرگانِ دین اور علماء و صلحا کو واسطہ مانتا ہے، وہ کافر و مشرک ہے، اس سے توبہ کرانی واجب ہے، اگر توبہ کرلے تو خیر ورنہ قتل کردیا جائے، یہ درحقیقت تشبیہ میں گرفتار ہیں، کیونکہ انھوں نے مخلوق کو خالق کا مشابہ سمجھ رکھا ہے، اور اللہ کے ہمسر اور نظیر ٹھہرا رکھے ہیں[1]۔"

مشاہد بدعتِ قبیحہ ہیں

امام ابنِ تیمیہ ان مشاہد اور زیارت گاہوں کے سخت مخالف ہیں، جو پورے عالمِ اسلام میں شرک و بدعت، فسق و فجور اور انواع و اقسام کے منکرات کا مرکز بن گئی تھیں، اور جنھوں نے عالمِ اسلام میں ایک فتنۂ عظیم کی شکل اختیار کرلی تھی، اور کہتے ہیں کہ یہ شریعت کی صریح مخالفت، اور پچھلے زمانہ کی ایک مکروہ بدعت ہے "الرّد علی البکری" میں فرماتے ہیں:۔

"یہ مسجدیں جو قبروں پر بنائی گئی ہیں، جن کو مشاہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ ایک بدعت ہے، جو لوگوں نے اسلام میں پیدا کی ہے، ان کی طرف سفر کرکے جانا بھی ایک رواج ہے، جس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں، اسلام کی ابتدائی تین۳ صدیوں میں جن کی خیر و فضیلت کی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی ہے ان کا وجود نہ تھا، بلکہ صحیح احادیث میں آپ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے اس سے ڈرایا، اور منع فرمایا، بخاری کی حدیث ہے کہ "لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد" (اللہ

[1] الواسطہ ص ۴۸

یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبور کو مساجد بنالیا) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا تو قبر مبارک کو کھلے میدان میں کردیا جاتا لیکن آپ کو یہ ناپسند تھا کہ اس کو مسجد بنالیا جائے، اسی طرح سے یہ بھی صحیح حدیث ہے کہ آپ نے وفات سے پانچ روز پہلے فرمایا:۔

من کان من قبلکم کانوا یتخذون القبور	جو لوگ تم سے پیشتر تھے، وہ قبور کو مساجد بنالیا کرتے
مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد	تھے، دیکھو یاد رکھنا قبروں کو مسجد نہ بنانا، میں تم کو
فانی انھاکم من ذلک[1]۔	اس سے روکتا ہوں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"جب مسلمانوں نے "تستر" فتح کیا تو وہاں حضرت دانیال علیہ السّلام کی قبران کو ملی، اہلِ شہر وہاں بارش کی دعا کرتے تھے، اور پانی مانگتے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی، آپ نے لکھا کہ دن کو تیرہ قبریں کھودو، اور رات میں ان کو ان میں سے کسی ایک میں دفن کردو تاکہ لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہوں، اور ان سے بارش کا سوال نہ کریں حقیقۃً یہی صحابۂ کرام کا طریق تھا، اسی لئے صحابہ و تابعین کے زمانہ میں سرزمینِ اسلام میں ایک مسجد بھی ایسی نہیں پائی جاتی تھی، جو کسی قبر پر تعمیر کی گئی ہو، اور نہ کہیں کوئی مشہد تھا جس کی زیارت کی جائے، نہ حجاز میں، نہ یمن میں، نہ شام میں، نہ مصر، عراق، خراسان میں[2]"

ایک دوسری کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"قبور کی طرف حج کرکے جانے والوں اور ان کو عبادت گاہ اور مساجد اور میلہ کی جگہ بنانے والوں کا صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں سراغ نہیں لگتا، اسلام میں نہ کوئی ایسی قبر اور مشہد تھا جس کی طرف حج کرکے جایا جائے، یہ تین صدیوں کے بعد کی پیداوار ہے، بدعت کی

---

[1] الرد علی البکری ص ۲۳۴ [2] ایضاً ص ۱۸۱

خاصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہوتی ہے اسی قدر دیر میں اس کا ظہور ہوتا ہے، شروع میں وہ بدعات ظاہر ہوتی ہیں جن کی مخالفت اتنی واضح اور جلی نہیں ہوتی۔"[1]

مشاہد کے موجد باطنی و روافض ہیں

ان کی تحقیق ہے کہ ان مشاہد و مزارات کی بدعت اور دعوت روافض اور باطنیہ نے شروع کی اور ان کے بارے میں احادیث وضع کیں، اس لئے کہ ان کو حقیقی دلچسپی اپنے ائمہ کے مزارات و مشاہد سے ہے، فرماتے ہیں:۔

"سب سے پہلے جنھوں نے ان مشاہد کی زیارت کے لئے سفر کرنے کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں وہ روافض وغیرہ دوسرے اہلِ بدعت تھے جن کا دستور یہ ہے کہ مساجد کو ویران کرتے ہیں، اور مشاہد کو جن میں شرک، کذب اور ایک نئے دین کی اختراع ہوتی ہے، پر رونق اور آباد رکھتے ہیں، اور توقیر و تعظیم کرتے ہیں، کتاب و سنت میں مشاہد کے بجائے مساجد کا جا بجا تذکرہ ملتا ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۵ (سورۂ اعراف۔ ۲۹)	کہہ دو میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے، اور ہر نماز کے وقت اپنے منہ سیدھے کرو اور اس کے خالص فرمانبردار ہو کر اسے پکارو۔
وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۵ (سورۂ جن۔ ۱۸)۔	اور بیشک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔
اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت

---

[1] الرد علی الاخنائی صہ ۱۰۲

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (سورۂ توبہ۔ ۱۸)	کے دن پر ایمان لایا۔
وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ	اور ان سے مباشرت نہ کرو، جب کہ تم مسجدوں میں
(سورۂ بقرہ۔ ۱۸۷)	معتکف ہو۔
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ	اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس نے اللہ کی
فِيهَا اسْمُهُ (سورۂ بقرہ۔ ۱۱۴)	مسجدوں میں اس کا نام لینے کی ممانعت کردی۔

نیز صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ ارشاد فرماتے تھے "ان من کان قبلکم کانوا یتخذون القبور مساجد الا فلا تتخذوا القبور مساجد فانی انھاکم عن ذلک" (تم سے پہلے جو لوگ تھے۔ یہود ونصاریٰ۔ وہ قبروں کو مساجد بنالیا کرتے تھے، دیکھو یاد رکھنا قبروں کو مسجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں)[1]

اکثر مشاہد و مزارات جعلی ہیں

امام ابن تیمیہ کی تحقیق ہے کہ ان مشاہد اور مشہور زیارت گاہوں میں سے اکثر جعلی اور فرضی ہیں، وہ اس سلسلہ میں کیسی اچھی بات لکھتے ہیں کہ چونکہ مشاہد و مزارات کے جاننے اور پہچاننے پر شریعت کا کوئی دارومدار نہیں ہے اور یہ اس دین میں داخل نہیں ہے جس کی حفاظت کی اللہ تعالےٰ نے ضمانت کی ہے، اس لئے اس میں کثرت سے جعل اور فریب ہوا ہے اور بہت سے مزارات اور مشاہد محض بے حقیقت اور بے اصل ہیں، اور مخلوق ان کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

وکثیر من المشاھد کذب وکثیر منھا	مشاہد میں سے بہت سے محض جعلی ہیں، اور بہت سے
مشکوک فیہ وسبب ذلک ان معرفۃ	مشکوک ہیں، اس سلسلہ میں لوگ کیوں اس قدر غلط فہمیوں

---

[1] الرد علی الاخنائی ص ۲۹

المشاهد ليست من الدين الذي تكفّل الله بحفظه لعدم حاجتهم الى معرفة ذلك[1]۔

کا شکار ہوئے اس کا راز یہ ہے کہ مشاہد کی شناخت اور معرفت اس دین کا کوئی حصہ نہیں جس کے محفوظ رہنے کی اللہ تعالےٰ نے ذمہ داری لی ہے کیونکہ امّت کو ان معلومات اور تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے، اور اس پر دین کا کوئی کام موقوف نہیں ہے[2]۔

مشاہد و مزارات پر حصول مقصد کے افسانے

اس سلسلہ میں ایک بڑا فتنہ یہ پھیل رہا تھا کہ ان مشاہد اور زیارت گاہوں میں بڑے بڑے مریضوں کو شفا ہوتی ہے اور دعائیں قبول ہوتی ہیں، لوگ اس سلسلہ میں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے بیان کرتے تھے، امام ابن تیمیہ کو اللہ تعالےٰ نے رسوخ فی الدین اور ایمان و یقین کا جو مقام عطا فرمایا تھا، اس کی بنا پر وہ ان افواہوں اور دعووں سے متأثر ہونے والے نہیں تھے، اور قطعیاتِ دین اور منصوصات کتاب و سنت کو ان روایات و بیانات کی بنا پر نہیں چھوڑ سکتے تھے، انھوں نے اپنی خداداد فراست اور دینی فہم سے کام لیا اور ثابت کیا کہ یہ سب توہمات اور بے اصل باتیں ہیں، اس سلسلہ میں زیادہ تر جانوروں کے شفایاب ہونے کے واقعات بیان کیے جاتے تھے، امام ابن تیمیہ نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ بہت عجیب و غریب، اور بصیرت افروز ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

---

[1] الرّد علی البکری ص ۳۱۳ [2] مزارات و مشاہد کے بکثرت جعلی ہونے کے متعلق امام ابن تیمیہ نے جو کچھ لکھا ہے، تاریخ و تحقیق سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، مثال کے طور پر قاہرہ میں سیدنا حسین رضؓ کے سر مبارک کا مدفن، مدفن سیدہ زینب، مدفن سیدہ سکینہ، نجف میں حضرت علی رضؓ کا مدفن، دمشق میں ازواجِ مطہرات کے مدفن اور ہندوستان کے بعض بعض مشہور مزارات مثلاً لاہور میں حضرت سید علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش کا مزار تاریخی اعتبار سے مشکوک ہے۔

"قاہرہ میں ایک گروہ عبیدیین (مشہور بفاطمیین) کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ اولیائے صالحین میں سے تھے، میں نے جب ان سے کہا کہ وہ تو منافق و زندیق تھے، اور ان میں سب سے کم اور ہلکے درجے کے وہ تھے جو رافضی تھے، تو ان کو بڑا تعجب ہوا، اور وہ کہنے لگے کہ ہم تو ایسے گھوڑوں کو جن کے پیٹ میں درد ہوتا ہے، ان کے مشاہد و مزارات پر لے جاتے ہیں، اور وہ وہاں اچھے ہو جاتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ یہ تو ان کے کفر کی سب سے بڑی دلیل ہے، میں نے بعض سائیسوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم شام اور مصر میں جب گھوڑوں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے تو ان کو کہاں لے جاتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم شام میں ان قبروں کے پاس لے جاتے ہیں جو اسماعیلیوں کے علاقہ میں ہیں، جیسے "علیقہ اور منیقہ" وغیرہ اور مصر میں ہم عیسائیوں کی ایک خانقاہ میں لے جاتے ہیں، اور عبیدیوں کی قبر پر، میں نے کہا کیا تم ان کو صلحائے مسلمین کی قبروں کے پاس بھی لے جاتے ہو، مثلاً حضرت لیث بن سعد، امام شافعی، ابن القاسم وغیرہ؟ انھوں نے کہا نہیں! میں نے ان عقیدتمندوں سے کہا کہ لو سنو یہ ان گھوڑوں کو کفار و منافقین کی قبروں کے پاس لے جاتے ہیں، اور ان کو شفا ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے، اور جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ چوپائے اور بہائم مُردوں کی آوازیں سنتے ہیں، تو جب یہ گھوڑے اس قسم کی آوازیں سنتے ہیں گھبرا جاتے ہیں، اور اسی گھبراہٹ اور ہیبت سے ان کے پیٹ پانی ہو جاتے ہیں، اور وہ پاخانہ کر دیتے ہیں، اس لئے کہ ہیبت و دہشت سے اکثر اسہال ہو جاتا ہے، ان کو اس پر بڑا تعجب ہوا، میں اکثر لوگوں سے یہی سبب بیان کرتا تھا، اور مجھے علم نہیں تھا کہ کسی اور نے بھی یہ بات لکھی ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ بعض علماء نے یہی سبب بیان کیا ہے۔"[1]

مشرکین کے لئے شیاطین کا تمثّل

خود صالحین اور اولیاء کی قبروں پر حصول مقصود اور کامیابی کے جو واقعات بیان کئے جاتے

---

[1] الرد علی البکری ص۳۱۱

ہیں، نیز صاحبِ مزار کی زیارت، گفتگو وغیرہ کے واقعات نقل کئے جاتے ہیں، امام ابنِ تیمیہ اس کی دوسری وجہ بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں :۔

"بعض لوگوں نے اپنے شیخ کی دُہائی دی، اور ان کو ان کی صورت نظر آئی، اور بعض اوقات انھوں نے ان کا کوئی کام بھی کر دیا، اس سے ان کو یہ عقیدہ ہوا کہ شیخ خود آئے یا یہ کوئی فرشتہ تھا، جو ان کی صورت میں ظاہر ہوا، اور یہ ان کی کرامت ہے، اس سے اس کا مشرکانہ عقیدہ اور راسخ اور غلو اور ترقی کر جاتا ہے، اس کو معلوم نہیں کہ اس طرح کی باتیں اور معاملات شیاطین بُت پوجنے والوں کے ساتھ بھی کرتے رہتے ہیں، وہ ان بُت پرستوں کے سامنے اکثر ظاہر ہوتے ہیں، اور بعض غیبی باتیں ان کو بتلاتے ہیں، اور ان کے بعض مطلب بھی پورے کر دیتے ہیں، لیکن یہ سب امور دورِ اخیر کی پیداوار ہیں، جن کا خیر القرون میں کوئی وجود نہ تھا"

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"شیاطین اکثر اس شخص کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، جن کی دہائی دی جائے، مجھ سے بہت سے شیوخِ طریقت کے متعلقین نے یہ واقعات بیان کئے اور ایک جماعت کثیر نے مجھ سے نقل کیا کہ انھوں نے بعض زندہ انسانوں اور بعض مردوں سے فریاد کی تو انھوں نے اسی طرح کے واقعات دیکھے، یہ بات پورے طور پر عیاں ہوگئی کہ شیاطین انسانوں کو اپنے مقدور بھر گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر وہ شخص دینِ اسلام سے ناآشنا ہوتا ہے تو اس کو کھلے شرک اور خالص کفر میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اللہ کا ذکر نہ کرے، شیطان کا سجدہ کرے، اس کے لئے قربانی پیش کرے، اور اس کو مُردار کھانے اور خون پینے کا حکم دیتے ہیں اور کھلی بے حیائیوں کے ارتکاب پر آمادہ کرتے ہیں، یہ ان شہروں میں بکثرت ہوتا ہے، جہاں یا تو محض کفر پایا جاتا ہے، یا کمزور سا اسلام، نیز ان اسلامی شہروں میں جہاں کے لوگوں کا ایمان ضعیف ہوتا ہے، چنانچہ مصر و شام میں بھی ایسا ہوا،

اور تاتاریوں کے قبول اسلام سے پہلے تو ان میں بکثرت ایسے واقعات پیش آتے تھے، جس قدر اسلام کی ان میں اشاعت ہوتی گئی، اس کی حقیقت سے وہ آشنا ہوتے گئے اسی قدر شیاطین کے اثرات کمزور پڑتے گئے۔[1]"

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ صرف صالحین کے ساتھ ہی یہ معاملہ پیش نہیں آتا، بلکہ ستارہ پرستوں کو ایسی باتوں سے سابقہ پڑتا ہے، اور ان کو اس طرح کے احساسات اور فتوحات حاصل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"جو لوگ کواکب سے دعا کرتے ہیں، ان پر ایسی صورتیں نازل ہوتی ہیں، جن کو کواکب کی روحانیت کہتے ہیں، حالانکہ وہ شیطان ہوتا ہے، جو اس کے شرک کی بنا پر اس کو گمراہ کرنے کے لئے نازل ہوتا ہے جیسے کہ بعض اوقات شیاطین بتوں اور مورتیوں کے اندر گھس جاتے ہیں، اور بعض اوقات لوگوں سے باتیں کرتے ہیں، اور بعض اوقات مجاوروں اور پوجا پاٹ کرنے والوں کو دکھائی دیتے ہیں، اور دوسروں کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔[2]"

امام ابنِ تیمیہ کا اصلاحی کارنامہ اور اس کے اثرات

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری (جس کی مردم خیزی و مردم آفرینی کا تذکرہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے) اگرچہ اکابر علماء و شیوخ سے معمور تھی، اور تصنیف و تالیف وعظ و ارشاد اور دعوت و تبلیغ کا کام پوری قوت سے جاری تھا، اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں کہ علمائے راسخین اور کتاب و سنت کے حاملین نے اس شرک صریح اور "جاہلیت وثنیہ" کو کسی طرح گوارا نہیں کیا ہوگا، اور زبان و قلم سے ضرور اس کی مخالفت کی ہوگی، لیکن ایسے علمائے کبار جنھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور اپنے گرانقدر علمی مشاغل و مباحث کے باوجود اس فتنۂ کبریٰ کے مقابلہ کے لئے میدان میں آئے اور

---

[1] تفسیر سورۂ اخلاص ص ۱۱۸ [2] کتاب النبوّات ص ۲۷۴

عوام کو خطاب کیا اور اس شرک صریح کی تردید و مخالفت کو اپنا موضوع اور مقصد زندگی بنایا، یا تو نہیں تھے، یا تاریخ کے منظر عام پر نہیں ہیں، یا ان کی بہت ممتاز اور بلند شخصیت نہیں تھی، اور انھوں نے اس موضوع پر کوئی ایسا وقیع علمی ذخیرہ یادگار نہیں چھوڑا، جو ان کی شخصیت اور اصلاحی کارنامہ کی یاد تازہ کرتا رہے، درحقیقت اس فتنۂ عالم آشوب کے مقابلہ اور عقیدۂ توحید کی توضیح و تشریح اور احیاء و تجدید کے لئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جیسی طاقتور اور بلند شخصیت کی ہی ان مشرکانہ عقائد و رسوم کے تفصیلی جائزہ اور احتساب اور مدلّل و پرزور تردید کی ضرورت تھی، جو مسلم معاشرہ پر حاوی ہوتے جارہے تھے، توحید کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ تاویل اور عوام کی رعایت کے ساتھ نہیں چل سکتی، اس کے لئے تو انبیاء علیہم السلام کی واشگاف تقریر اور فیصلہ کن اور غیر مبہم طرزِ خطاب کی ضرورت ہے، جو بالکل "فُرقان" کی شان رکھتا ہو، امام ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ میں نیابتِ انبیاء کا فرض انجام دیا، اور "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" پر عمل کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان عقائد و رسوم میں جو جہالت غیر مسلموں کے اختلاط و صحبت اور فرقِ ضالّہ اور اہلِ غرض کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی، ایک عام تزلزل پیدا ہو گیا، اسلام کا عقیدۂ توحید جو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اور ان کی دعوت کا نقطۂ مرکزی ہے، ایک بار پھر نکھر کر اور منقّح ہو کر سامنے آگیا "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ" امام ابن تیمیہ کے اصلاحی کارناموں میں سے اگر صرف یہی ایک کارنامہ ہوتا تو ان کے مقامِ تجدید اور دعوت و عزیمت کے ثبوت کے لئے کافی تھا۔

ان کی کتابوں کے اثر سے ان کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ایسے اربابِ دعوت و عزیمت پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ کے مشرکانہ عقائد و رسوم اور "جاہلیت وثنیہ" کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا اور "اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ" کا آوازہ اس بلند آہنگی سے بلند کیا کہ عالمِ اسلام کے دشت و جبل اس سے گونج اٹھے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کا دوسرا علمی و اصلاحی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں فلسفہ و منطق و علم کلام کی مفصل تنقید کا فرض انجام دیا، اور ان کے مقابلہ میں مدلّل طریقہ پر کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی برتری ثابت کی، ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ فلسفہ و منطق کو اس وقت عالم اسلام میں کیا مقام اور ذہن و افکار پر کیسا تسلّط حاصل تھا، اور انھوں نے کس ماحول میں یہ کارنامہ انجام دیا۔

فلسفۂ یونان کا عالمِ اسلام پر اثر و اقتدار

یونانی فلسفہ و منطق کی کتابوں کے ترجمہ کا کام خلیفۂ منصور کے زمانہ (تقریباً ۱۳۶ھ) سے شروع ہو گیا تھا، معتزلہ نے ان کتابوں کا مطالعہ اور ان سے استفادہ کیا تھا، ان کی کتابوں میں فلسفۂ یونان کی اصطلاحات کا استعمال اسی زمانہ سے شروع ہو گیا تھا، لیکن علوم یونان کا اصل فروغ مامون کے زمانہ سے شروع ہوا، مامون نے ترجمہ کی تحریک کی شاہانہ سرپرستی کی، وہ بذات خود یونانی علوم کا بڑا قدردان

اور حریص تھا، صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے کہ "اس نے شاہانِ روم سے حکمائے یونان کی کتابوں کی فرمائش کی، انھوں نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس وغیرہ کی تصنیفات تحفۃً بھیجیں اور مامون نے بڑے اہتمام سے ان کا ترجمہ کرایا، اور لوگوں کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی، اس کے زمانہ میں ان کتابوں کا عام چلن ہوگیا، اور فلسفہ نے عروج حاصل کیا، اس کی قدر دانی کی وجہ سے ذہین و ذکی نوجوانوں اور اہلِ علم نے ان مضامین پر عبور پیدا کیا، اور اپنی اپنی جنسِ کمال مامون کے ہنر پرور دربار میں لے کر آئے اور انعام و اکرام و مراتب و مناصب سے سرفراز ہوئے، اس طرح سلطنتِ عبّاسیہ ان علوم میں رومۃ الکبریٰ کی ہمسر و ہم چشم نظر آنے لگی۔[1]"

ترجمہ کا یہ کام مامون کے بعد تک جاری رہا، اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک یونان کے علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ عربی میں منتقل ہو چکا تھا۔[2]

اس علمی ذخیرہ میں اگرچہ افلاطون اور دوسرے حکمائے یونان کی تصنیفات و تحقیقات بھی تھیں، لیکن شاید مترجمین (جو زیادہ تر نسطوری اور یعقوبی، عیسائی اور جندیسابور اور حرّان کے علمائے فلسفہ تھے) کے ذاتی رجحان کی وجہ سے یا اس بنا پر کہ ارسطو کا زمانہ قریب تر ہے، اور اس کی تصنیفات میں فلاسفۂ متقدمین کے مباحث زیادہ مدّون و مرتب ہیں، ارسطو کی کتابوں نے عالم اسلامی کے علمی و درسی حلقوں میں زیادہ قبولیت و رواج حاصل کیا، اور بالآخر وہی فلسفۂ یونان کا نمائندہ اور وکیل اور عالمِ اسلام میں فلسفہ کا رمز اور نشان بن کر رہ گیا، عالمِ اسلام کی بدقسمتی تھی کہ حکمائے یونان میں سے اس کے حصہ میں وہ فلسفی عالم آیا، جو بہت سے اسباب و وجوہ کی بنا پر (جن میں سے بعض کی تفصیل امام ابن تیمیہ کے بیانات و انتقادات میں آئے گی) ادیانِ سماوی کی روح اور دینی مفاہیم و تصوّرات و حقائق سے زیادہ بعید و ناآشنا اور مادّی فکر و نظر کا پرجوش حامی و داعی ہے۔

---

[1] طبقات الامم ص۴۷ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فہرست ابن ندیم، طبقات الاطباء (ابن ابی اصیبعہ) اخبار الحکماء قفطی وغیرہ

فلسفہ کا دورِ تقلید

ابتداء میں عالمِ اسلام کے علمائے فلسفہ نے ارسطو کے فلسفہ و منطق کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے سے انکار کیا، اور اس کو تنقید و تحقیق سے بالاتر اور مستغنی نہیں سمجھا، بہت سے علماء نے اس کی تردید میں کتابیں لکھیں، اور اس کے فلسفیانہ و منطقی مباحث پر آزادانہ و ناقدانہ نظر ڈالی، اور جو چیز ان کو مخدوش اور کمزور نظر آئی، برملا اس کا اظہار کیا، اس سلسلہ میں ابتداءً معتزلہ پیش پیش تھے، ان میں سے نظّام اور ابو علی جبّائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، تیسری صدی میں حسن بن موسیٰ نوبختی نے "کتاب الآراء والدّیانات" لکھی، اور اس میں ارسطو کی منطق کے بعض اہم مسائل کا رد کیا، چوتھی صدی میں امام ابوبکر باقلّانی نے "دقائق" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں فلسفہ کا رد لکھا، اور یونانیوں کی منطق پر اہلِ عرب کی منطق کی ترجیح ثابت کی، پانچویں صدی میں علامہ عبدالکریم شہرستانی (صاحبُ الملل والنحل) نے برقلس اور ارسطو کے رد میں ایک کتاب لکھی اور قواعدِ منطق کے موافق ان پر دلائل کا نقض کیا، اسی صدی کے آخر میں امام غزّالی فلسفہ کے مدّمقابل ہوئے، اور انھوں نے "تہافۃ الفلاسفہ" کے نام سے وہ کتاب لکھی جس سے سو برس تک فلسفہ کے ایوان میں تزلزل رہا[1]، چھٹی صدی میں ابوالبرکات بغدادی نے اس سلسلہ کو بڑی ترقی دی، اور "المعتبر" کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس میں اکثر مسائل میں ارسطو کے خیالات کو غلط ثابت کیا، اس صدی میں امام رازی نے متکلمین اسلام اور اشاعرہ کا وکیل بن کر فلسفہ کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنالیا۔

لیکن عالمِ اسلام کا وہ علمی حلقہ جو فلسفۂ یونان کا اصل علم بردار اور ترجمان سمجھا جاتا تھا، ارسطو کی شخصیت و عظمت سے مسحور تھا، اور ایک طرح اس کو تنقید و تحقیق سے بالاتر سمجھتا تھا، زمانہ کے ساتھ ساتھ علمائے فلسفہ کی ارسطو کی ذات کے ساتھ یہ گرویدگی اور شیفتگی بھی بڑھتی جا رہی تھی، اور فلسفہ کے حلقوں

---

[1] تفصیل تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول میں ملاحظہ ہو۔

میں ارسطو رفتہ رفتہ تقدس و عظمت کے مقام پر فائز ہوتا جا رہا تھا، ہر بعد کا فلسفی اپنے پیشرو سے اس عظمت و تقدیس میں فائق اور مقدم نظر آتا ہے، ابونصر فارابی (م ۳۳۹ھ ۹۵۰ء) افلاطون و ارسطو کی نسبت لکھتا ہے:۔

وکان ھٰذان الحکیمان ھما مبدعان	یہ دونوں حکیم فلسفہ کے موجد اور اس کے مبادی
للفلسفۃ ومنشأن لاوائلھا واصولھا	واصول کے بانی و مرتب ہیں، اور فلسفہ کے
ومتممان لأواخرھا وفروعھا، وعلیھما	مسائل و مباحث میں تمام تر انہی دونوں پر
المعوّل فی قلیلھا وکثیرھا۔[1]	بنیاد ہے۔

بوعلی سینا (م ۴۲۸ھ) فارابی سے بھی زیادہ ارسطو کی عظمت کا قائل اور کلمہ گو ہے، وہ "منطق الشفاء" میں لکھتا ہے کہ "ارسطو کو اتنا زمانہ ہوا لیکن آج تک اس کے ان مسائل و تحقیقات پر کچھ اضافہ نہ ہو سکا"۔[2]

بوعلی سینا کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن رُشد (م ۵۹۵ھ) سے بڑا عالم اور وکیل پیدا نہیں کیا، ارسطو کی عظمت و تقدیس میں اس کا قدم بوعلی سینا سے بھی آگے ہے، اور اگر اس موقع پر تصوف کی اصطلاح میں (دخل در معقولات نہ ہو تو) یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کو ارسطو کی ذات میں فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل ہے، اس کا ایک سوانح نگار اس کی اس خصوصیت کا ان الفاظ میں اظہار کرتا ہے:۔

امّا تمجید ابن رشد لارسطو	ارسطو کی عظمت و تقدیس کے سلسلہ میں ابن رُشد
فلاحدّ لہ فیکاد یؤلّھہ، وقد	اتنا آگے ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، یہاں تک کہ
وضع لہ اوصافاً تجعلہ فوق	وہ اس کو خدا بنانے کی حد تک پہونچ گیا اور عقل
درجات الکمال الانسانی عقلاً وفضلاً	وفضل کے اندر انسانی کمال کے درجات سے بھی
ولو کان ابن رشد یقول	بہت اونچے اس کے اوصاف بیان کئے اور اگر
بتعدّد الآلھۃ لجعل ارسطو	ابن رشد تعدّد آلہہ کا قائل ہوتا تو وہ ارسطو کو

---

[1] الجمع بین رأی الحکیمین [2] مضمون "فلسفۂ یونان اور اسلام" از مولانا شبلی نعمانیؒ الندوہ جلد ا، بحوالۂ منطق الشفاء۔

رب الارباب[1]۔ رب الارباب بنا دینا۔

ساتویں صدی میں فلسفہ کے حلقہ میں نصیر الدین طوسی (م ۶۷۲ھ) کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے، جن کو فلسفہ کے مدرسی حلقہ نے محقق طوسی کے لقب سے یاد کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاریوں کے حملے، بغداد کے سقوط نے عالم اسلام کو بے حواس بنا رکھا تھا، اور ایک عام علمی زوال پورے عالمِ اسلام پر سایہ فگن تھا، اس وقت نصیر الدین طوسی ہی (جو ہلاکو خاں کے مقرب و معتمد تھے) یونانی علم و فلسفہ کے علم بردار تھے، انہی کے شاگردوں نے (جن میں قطب الدین شیرازی اور ان کے ہم نام قطب الدین رازی خاص طور پر نامور ہیں) درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام سنبھالا اور انہی سے ایران کے اس طرزِ تعلیم کی بنیاد پڑی، جس میں فلسفہ و منطق کو مرکزی مقام حاصل تھا[2]، نصیر الدین طوسی اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے، جو ارسطو کو عقلِ کُل کا درجہ دیتا تھا، اور اس کی تحقیقات کو حرفِ آخر سمجھتا تھا، انھوں نے امام رازی کے مقابلہ میں ارسطو کے فلسفہ کی زور شور سے حمایت و مدافعت کی تھی، اور ارسطو کے فلسفہ میں نئی جان ڈال دی تھی۔

فلسفہ و منطق کا علمی محاسبہ اور ابن تیمیہ کا کارنامہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نصیر الدین طوسی کی وفات سے دس برس پہلے پیدا ہوئے، ان کی علمی زندگی کا آغاز ہوا تو نصیر الدین طوسی اور ان کے تلامذہ کے اثر سے یونانی فلسفہ و منطق یعنی ارسطو کے فلسفہ و منطق کا طوطی بول رہا تھا، اس کے مسائل و مباحث کے سمجھ لینے ہی کو منتہائے ذکاوت اور معیارِ فضیلت سمجھا جاتا تھا، کسی کو اس کے مقابلہ میں یا اس کی مخالفت میں لب کشائی کی جرأت نہ تھی، محدثین و فقہاء اس میدان کے حریف نہیں تھے، وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے کہ اس کی حرمت کا فتویٰ دے دیں، مگر اس سے

---

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب (لطفی جمعہ) ص ۱۵۵ [2] علامہ سید شریف جن سے زمانۂ مابعد میں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ پھیلا، قطب الدین رازی کے شاگرد تھے، انہی کا سلسلہ ہندوستان پہونچا جس کی ترقی یافتہ یا بگڑی ہوئی شکل یہاں کا درس نظامی ہے۔

یہ سیلاب رک نہیں سکتا تھا، عالمِ اسلام کے علم و فکر پر اس کا رعب چھایا ہوا تھا، اس مرعوبیت سے ایک حلقہ میں (جو فلسفہ سے قریبی، اور براہِ راست تعلق رکھتا تھا) تشکّک و ارتیابیت کا دور دورہ تھا، اور سوفسطائیت (حقائق اشیاء کا انکار) کا رجحان بھی پایا جاتا تھا، جو حلقہ اس سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتا تھا، احساس کہتری اور مرعوبیت کا شکار تھا، اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے فلسفہ و منطق کے بے لاگ علمی محاسبے اور جائزے، اور اس کی علمی کمزوریوں کا پردہ فاش کرنے کی ضرورت تھی، وقت کی یہ ضرورت شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے پوری کی، اور اس کو مستقل موضوع بنا کر یونانی فلسفہ و حکمت کی مفصّل و مدلّل تنقید اور اس کے علمی محاسبے کا کام انجام دیا، اور ایک ایسی شخصیت (ارسطو) سے حریفانہ گفتگو اور علمی مناظرہ کیا، جس کو علمائے فلسفہ مافوق البشر ہستی اور تنقید و تردید سے بالاتر سمجھنے لگے تھے۔

ان کے کام کی نوعیت اور ان کے تنقید و محاسبہ کی حیثیت، ان کا نقطۂ نظر اور بنائے اختلاف کیا تھی؟ بہتر یہ ہے کہ اس کے لئے ان ہی کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے، ذیل میں مختلف عنوانات کے تحت ان کی تحریروں کے بعض خلاصے اور ان کی کتابوں کے بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے ان کا نقطۂ نظر اور طریقِ فکر واضح ہو جائے گا۔

طبعیات و ریاضیات کا اعتراف

اس علمی ذخیرہ کے بارے میں جو فلاسفۂ یونان و ارسطو کی طرف منسوب تھا، ان کی رائے بہت معتدل اور متوازن ہے، وہ طبعیات، ریاضیات اور الٰہیات میں فرق کرتے ہیں، اور اپنے پیشرو امام غزّالی کی طرح طبعیات اور ریاضیات کے بہت سے مسائل کی صحت و معقولیت کا اقرار اور اس بارے میں علمائے یونان کی ذہانت کا اعتراف کرتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

نعم لھم فی الطبعیات کلام غالبہ جیّد — ان فلاسفہ کی طبعیات میں جو گفتگو اور بحث ہے، اس امر کا

وهو كلام كثير واسع، ولهم عقول عرفوا بها ذلك وهم قد يقصدون الحق لا يظهر عليهم العناد۔[1]

بڑا حصہ اچھا ہے اور ان کا یہ کلام خاصا وسیع اور مفصل ہے ان باتوں کو سمجھنے اور معلوم کرنے کے لئے وہ اچھا دماغ رکھتے تھے، بہت سے مباحث میں وہ حق کے جویا اور طالب نظر آتے ہیں اور ضد اور زبردستی سے کام نہیں لیتے۔

وہ ایک جگہ صاف اعتراف کرتے ہیں کہ طبعیات و ریاضیات وغیرہ فلاسفۂ یونان کا اصل موضوع اور ان کے غور و فکر کا میدان ہے، فرماتے ہیں:۔

لكن لهم معرفة جيدة بالامور الطبعية وهذا بحر علمهم وله تفرغوا وفيه ضيعوا زمانهم۔[2]

امور طبعیہ سے ان کی واقفیت اچھی خاصی ہے، درحقیقت یہی ان کا دائرہ فکر اور فنِ خاص ہے اور اسی میں انھوں نے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ صرف کیا۔

یونان کے علم ریاضی کے متعلق وہ "الرّد علی المنطقیین" میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں:۔

فهذه الامور وامثالها مما يتكلم فيه الحساب امر معقول مما يشترك فيه ذووا العقول وما من احد من الناس الا يعرف منه شيئاً فانه ضروري في العلم ضروري في العمل ولهذا يمثلون به في قولهم الواحد نصف الاثنين ولا ريب ان قضاياه كلية واجبة القبول لا تنتقض البتة۔[3]

ریاضی کے یہ مسائل جن سے اہلِ حساب بحث کرتے ہیں، ایسے معقول مسائل ہیں، جن پر تمام اہلِ عقول کا اتفاق ہے اور ہر شخص اس سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ علم اور عمل دونوں کے لئے ضروری ہے، اس سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے کہ الواحد نصف الاثنین، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے سب قضایا کلّی ہیں، واجب القبول ہیں، اور ان پر کوئی نقض وارد نہیں ہو سکتا۔

---

[1] الرد علی البکری ص۱۴۳ [2] تفسیر سورۃ الاخلاص ص۵۷ [3] الرد علی المنطقیین ص۱۳۴

اختلاف کا اصل میدان فلسفۂ الٰہیات

امام ابن تیمیہ کو فلسفۂ یونان کے جس دائرہ سے اصل اختلاف ہے، وہ الٰہیات کا دائرہ ہے، الٰہیات کے بارے میں وہ فلسفۂ یونان کی بے بضاعتی اور بے مایگی اور فلاسفۂ یونان کی ناکامی و بے حاصلی اور ان کے جہل مرکّب میں مبتلا ہونے پر بار بار زور دیتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ فلاسفۂ یونان کا فن اور ان کے غور و فکر اور بحث و نظر کا میدان نہ تھا، انھوں نے اس دائرہ میں قدم رکھ کر اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے اور اپنی تحقیر و تضحیک کا سامان بہم پہونچایا ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

للمتفلسفة فی الطبعیات خوض	فلسفہ سے اشتغال کرنے والے فنِ طبعیات میں غور و فکر
وتفصیل تمیز وا بہ بخلاف الالٰہیات	اور تفصیل سے کام لیتے ہیں اور ان کا امتیاز نظر آتا ہے
فانھم من اجھل الناس بھا وابعدھم	لیکن الٰہیات میں وہ جاہل محض اور حق سے بالکل
عن معرفة الحق فیھا، وکلام ارسطو	ناآشنا معلوم ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں ارسطو سے جو کچھ
معلمھم فیھا قلیل کثیر الخطاء۔[1]	منقول ہے، وہ ہے بہت تھوڑا اور غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔

ایک دوسری جگہ طبعیات میں ان کی واقفیت کا اعتراف کرتے ہوئے "الٰہیات" میں ان کی نامرادی و تہی دستی کا ذکر کرتے ہیں :۔

واما معرفة اللہ تعالیٰ فحظھم منھا	جہاں تک اللہ تعالیٰ کی معرفت کا تعلق ہے اس کے
مبخوس جدًا واما ملائکتہ وکتبہ	بارے میں فلاسفہ بڑے محروم اور نامراد نظر آتے ہیں،
ورسلہ فلا یعرفون ذلک البتة ولم	رہے ملائکہ، اللہ کی کتابیں اور اس کے رسول تو اس کا
یتکلموا فیہ لا بنفی ولا باثبات وانما	ان کو قطعاً علم نہیں ہے اور اس بارے میں ان سے

[1] معارج الوصول من مجموعة الرسائل الکبریٰ ص۱۸۶

تکلموا فی ذلک متأخروھم الداخلون فی الملل[1]

نفیاً اور اثباتاً کوئی چیز منقول نہیں ہے اس بارے میں درحقیقت متاخرین فلاسفہ نے گفتگو کی ہے، جن کا مذاہب و ادیان سے تعلق رہا ہے۔

امام ابن تیمیہ کا بیان ہے کہ فلسفۂ یونان کے اصل ارکان و اساطین کو خود بھی اس کا اعتراف ہے کہ ان کو اس علم کے حصول کے ذرائع اور مقدمات و مبادی حاصل نہیں اور اس بارے میں یقین تک پہونچنا ان کے لئے بہت مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

بل قد صرّح اساطین الفلسفة بأنّ العلوم الالٰهية لاسبيل فيها الى اليقين وانّما يتكلّم فيها بالاحرى والاخلق فليس لهم فيها الا الظن (وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئاً)[2]

ان لوگوں نے جو فلسفہ میں ستون کا درجہ رکھتے ہیں اس بات کو صاف طریقہ سے کہا ہے کہ علومِ الٰہیہ میں یقین تک پہونچنے کا کوئی راستہ نہیں، ان مسائل میں جو کچھ کہا جائے گا، اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ یہ ہوگی کہ یہی لگتی ہوئی بات ہے یا زیادہ مناسب بات ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فلاسفہ کے پاس الٰہیات میں ظن و تخمین کے سوا کچھ نہیں اور جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے "ظن و تخمین کبھی حق کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔"

یونانی الٰہیات اور پیغمبروں کے علوم و تعلیمات کا تقابل

ایک جگہ وہ فلاسفۂ یونان کے الٰہیات کے بارے میں اقوال و قیاسات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان لوگوں پر تعجب کرتے ہیں، جو ان کو انبیاء علیہم السلام کے علوم و حقائق کے سامنے لاتے ہیں، اور

---

[1] تفسیر سورۃ الاخلاص ص ۵۷ [2] نقض المنطق ص ۱۷۵

ان سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں، وہ بڑے جوش و اثر سے لکھتے ہیں:۔

"الٰہیات کے بارے میں جب معلّم اوّل ارسطو کے کلام پر نظر ڈالی جاتی ہے، اور ایک پڑھا لکھا آدمی اس کو غور سے دیکھتا ہے تو وہ اضطراراً اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ ان فلاسفۂ یونان سے بڑھ کر رب العالمین کی معرفت سے کوئی بے بہرہ اور ناآشنا نہیں تھا، وہ دریائے حیرت میں غرق ہوجاتا ہے، جب دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ یونان کی الٰہیات کا پیغمبروں کے علوم و تعلیمات سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں، اس کو یہ بات ایسی ہی نظر آتی ہے جیسے کوئی لوہاروں کا فرشتوں سے یا گاؤں کے زمینداروں کا شاہانِ عالم سے مقابلہ کرنے لگے، بلکہ اس میں بھی کسی قدر علم و عدل کا شائبہ ہے، لیکن جو فلاسفہ کا انبیاء سے مقابلہ کرتے ہیں، وہ تو سخت ظلم و جہل سے کام لیتے ہیں، اس لئے کہ گاؤں کا زمیندار بہرحال گاؤں کا منتظم ہے، اور اس میں اس کو بادشاہ کے ساتھ کسی نوع کی مشابہت اور کسی جزء کی شرکت ہے، لیکن فلاسفہ و انبیاء کا حال تو یہ ہے کہ انبیاء جو کچھ لے کر آتے ہیں فلاسفہ کو اس کی مطلق خبر نہیں بلکہ وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتے، واقعہ یہ ہے کہ کفار یہود و نصاریٰ بھی ان فلاسفہ کے مقابلہ میں امور الٰہیہ سے زیادہ باخبر ہیں، میری مراد اس سے وحی کا وہ علم خاص نہیں ہے، جو صرف انبیاء کی خصوصیت ہے اور دوسروں کو نصیب نہیں ہے، اس لئے کہ یہ علم تو خارج از بحث ہے، میری مراد ان علوم عقلیہ سے ہے، جن کا تعلق اللہ تعالےٰ کی معرفت، توحید، اس کے اسماء و صفات کی معرفت، نبوت و رسالت، معاد اور ان اعمال سے ہے، جو آخرت میں سعادت کا موجب ہیں، اور جن میں سے اکثر کو انبیاء علیہم السلام نے براہین عقلیہ سے بیان کیا ہے، یہ الٰہی و دینی و شرعی عقلیات بھی وہ ہیں، جن کی ان فلاسفہ کو ہوا بھی نہیں لگی، اور نہ ان کے علوم میں ان کا کوئی پتہ اور نشان ہے، باقی وہ علوم و معارف اور حقائق غیبیہ جو انبیاء کے خصائص میں سے ہیں، ان کے ذکر کا تو اس سلسلہ میں کوئی موقع ہی نہیں، اور فلسفہ اور علوم نبویہ کے مقابلہ میں وہ بحث ہی میں نہیں آتے"![1]

[1] الرد علی المنطقیین ص ۳۹۵

فلاسفۂ یونان کا جہل و انکار

علوم الٰہیہ میں فلاسفہ کی بے بضاعتی ان کے علم و بیان کی کوتاہی اور بہت سے غیبی حقائق و موجودات کے انکار کی وجہ امام ابن تیمیہ بیان کرتے ہیں :۔

"جس غیب کی انبیاء علیہم السلام خبر دیتے ہیں، اور وہ کلّیات عقلیہ جو تمام موجودات پر حاوی اور شامل ہوں اور جو موجودات کی صحیح تقسیم کرتی ہیں، ان سے فلاسفہ بالکل ناآشنا ہیں، اس لئے اس پر اسی کو قدرت ہو سکتی ہے، جو موجودات کی تمام انواع کا احاطہ کر سکے، اور ان فلاسفہ کا حال یہ ہے کہ یہ صرف حساب اور اس کے بعض لوازم سے واقف ہیں، اور یہ بہت تھوڑے موجودات کی واقفیت ہے اس لئے کہ جن موجودات کا انسانوں کو مشاہدہ نہیں ہے، وہ ان موجودات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کثیر اور وسیع ہیں، جن کا ان کو مشاہدہ ہوتا ہے، اسی بنا پر جن لوگوں کا علم فلاسفہ کی معلومات تک محدود ہے جب وہ انبیاء، ملائکہ، عرش، کرسی، جنت، جہنم وغیرہ کا ذکر سنتے ہیں، اور وہ اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ موجود وہی ہے، جو ان کو معلوم ہے، اور ان کی معلومات کے دائرہ سے باہر موجودات کا وجود نہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں، اور اپنی معلومات کے مطابق انبیاء علیہم السلام کے کلام کی تاویل کرنے لگتے ہیں، اگرچہ یہ سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے، اور ان کو ان موجودات کے نہ ہونے کا کوئی ثبت علم نہیں، اس لئے کہ کسی چیز کے وجود کا علم نہ ہونا الگ چیز ہے اور کسی چیز کے معدوم ہونے کا علم ہونا الگ چیز ہے، یہ ضروری نہیں کہ جو ہمیں معلوم نہیں وہ معدوم بھی ہو، وہ جب ان غیبی حقائق کا انکار کرنے لگتے ہیں تو ان کا انکار ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے کوئی طبیب جنّات کے وجود کی اس بنا پر نفی کرے کہ فنِ طب میں جنّات کا کوئی ثبوت .... نہیں ہے، حالانکہ فنِ طب میں جنّات کے وجود کا انکار بھی نہیں ہے اسی طرح سے تم دیکھو گے کہ جس شخص کو کوئی فن آتا ہے اور اس میں وہ عوام کے مقابلہ میں کچھ امتیاز رکھتا ہے

تو وہ اپنی ناواقفیت سے ان چیزوں کی نفی کرنے لگتا ہے جو اس کے فن سے خارج ہیں، واقعہ یہ ہے کہ لوگوں نے چیزوں کے ماننے اور اقرار کرنے میں اتنی ٹھوکر نہیں کھائی، جتنی نہ ماننے میں اور انکار کرنے میں جس چیز کی حقیقت سے انسان پورے طور پر واقف نہیں ہے اس کو جھٹلانے اور اس کے وجود کے انکار کرنے کا رجحان انسانوں میں بہت قدیم اور عام ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ۔ (سورۂ یونس۔۳۹)

ان کفار نے ان چیزوں کو جھٹلایا جن کا ان کو پورا علم حاصل نہیں تھا، حالانکہ ابھی تک ان پر ان کی پوری حقیقت منکشف نہیں ہوئی۔

بُت پرست و ستارہ پرست یونان

یونان قدیم کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو طبیعیات و ریاضیات اور علوم و آداب کا یہ وسیع اور عظیم سرمایہ عطا کرنے والا ملک جس نے ہزاروں برس تک دنیا کی عقلی و فکری قیادت کی ہے اپنی تاریخ کے بیشتر حصہ میں بُت پرست اور ستارہ پرست واقع ہوا تھا اور صدہا توہّمات و خرافات میں گرفتار تھا، جدید تاریخ نے یونان کے علم الاصنام اور اس کے قومی دیومالا کو بے نقاب کر دیا ہے اور اب اس میں کوئی شبہہ نہیں رہا کہ یونان قدیم میں دیوتاؤں، اور دیبیوں اور ستاروں کے معبدوں اور ہیاکل کا ایک جال بچھا ہوا تھا، یونان کا جو فلسفہ عالم اسلام میں ترجمہ ہو کر آیا اور پھر اس کے ذریعہ یورپ تک پہونچا وہ اسی صنم پرستی اور ستارہ پرستی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، یونانی فلاسفہ نے اپنے مذہبی اعتقادات اور مشرکانہ تصورات کو فلسفہ کی مہیب اصطلاحات میں منتقل کر دیا اور مسلمان علمائے فلسفہ نے جو یونان کی مذہبی تاریخ سے واقف نہیں تھے، ان کو علمی حقائق سمجھ کر اپنے غور و فکر کا موضوع بنا لیا، اور ان کو ثابت کرنے کے درپے ہوئے امام ابن تیمیہ کی یہ بڑی ژرف نگاہی اور ذہانت ہے کہ انھوں نے کئی صدی پہلے اس نکتہ کو

فاش کیا، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

اماّ قدماء الیونان فکانوا مشرکین من اعظم الناس شرکاً وسحراً، یعبدون الکواکب والاصنام ولھذا اعظمت عنایاتھم بعلم الھیئۃ والکواکب لاجل عبادتھا وکانوا یبنون لھا الھیاکل۔[1]

جہاں تک قدمائے یونان کا معاملہ ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ پکّے مشرک تھے، اور ان کو سحر سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ ستاروں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے، علم ہیئت اور کواکب کی طرف غیر معمولی توجہ کرنے کا یہی راز ہے، اس لئے کہ وہ ان کی پرستش کرنا چاہتے تھے اور ان کے لئے معبد اور ہیکل تعمیر کرتے تھے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

ولھذا کان رؤسھم المتقدمون والمتأخرون یامرون بالشرک فالاولون یسمون الکواکب الآلھۃ الصغریٰ ویعبدونھا باصناف العبادات کذالک کانوا فی ملّۃ الاسلام لاینھون عن الشرک ویوجبون التوحید بل یسوغون الشرک او یامرون بہ اولا یوجبون التوحید۔[2]

ان کے متقدمین ومتاخرین پیشوا شرک کا حکم دیتے ہیں متقدمین کواکب کو آلہہ صغری (چھوٹے خدا) کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور مختلف طریقوں پر ان کی عبادت کرتے ہیں، مسلمانوں میں جن لوگوں نے ان کی پیروی اختیار کی ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ شرک سے نہیں روکتے، اور توحید کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ شرک کو یا تو جائز قرار دیتے ہیں، یا کم سے کم توحید کو ضروری قرار نہیں دیتے۔

متقدمین ومتاخرین فلاسفۂ یونان کا فرق

امام ابن تیمیہ کی یہ بھی ایک بڑی باریک بینی اور حقیقت شناسی تھی کہ انھوں نے یونان کے

---

[1] تفسیر سورۃ الاخلاص ص۵۷ [2] نقض المنطق ص۱۷۷

فلاسفۂ متقدمین اور متاخرین میں فرق کیا، ان کے نزدیک فلاسفۂ متقدمین اور ارسطو کے پیشرو غیبی حقائق اور دینی مفاہیم و تصورات سے زیادہ آشنا اور قریب تھے، اور ان کے اندر غیب اور غیر مادی حقائق کے انکار کا وہ رجحان نہیں پایا جاتا، جو ارسطو میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہ فلاسفہ جو ارسطو کے پیرو ہیں، انھوں نے ان فلاسفۂ متقدمین کی پیروی نہیں کی جو فلسفہ کے ستون وارکان تھے، وہ فلاسفۂ متقدمین عالم کے حدوث کے قائل تھے اور اس کے بھی قائل تھے کہ اس عالم سے اوپر ایک دوسرا عالم ہے، اور اس عالم علوی کی بعض ایسی صفتیں بیان کرتے تھے، جو حدیث میں جنت کے متعلق آئی ہیں، اسی طرح وہ حشرِ اجساد کے قائل تھے، جیسا کہ سقراط و تالیس وغیرہ اساطین فلسفہ کے کلام میں نظر آتا ہے۔"[1]

ارسطو حقائقِ دینیہ سے بعید تر ہے

ان کے نزدیک اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قدماء فلاسفہ کو ان ملکوں میں آنے جانے کا اتفاق ہوا جہاں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے تھے، اور اس طرح وہ دینی حقائق سے واقف ہوئے، لیکن ارسطو کو اس کا اتفاق نہیں ہوا، وہ بعض مؤرخین کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں:۔

"جن لوگوں نے فلاسفہ کی تاریخ و تذکرہ مرتب کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ فلسفہ کے ابتدائی ارکان (فیثاغورث، سقراط، افلاطون) شام وغیرہ ارض انبیاء کی طرف آمد و رفت رکھتے تھے، اور لقمان حکیم وغیرہ سے اور حضرت داؤدؑ، سلیمانؑ کے اصحاب سے استفادہ کرتے تھے، لیکن ارسطو کو کبھی اس سرزمین کی طرف سفر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، جو انبیاء کی بعثت سے مشرف ہوئی، نہ اس کے پاس انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کوئی حصہ تھا، جیسا کہ اس کے پیشروؤں کے پاس تھا، اس کے پاس

---

[1] تفسیر سورۃ الاخلاص ص۶۷

ستارہ پرستی کے مذہب کا کچھ حصہ تھا، اس نے ان قیاسی تعلیمات کی بنیاد ڈالی، اور وہ ایک ایسا قانون بن گیا جس پر اس کے پیرو آنکھ بند کرکے چلتے رہے"۔[1]

بدقسمتی سے عالمِ اسلام میں جو فلسفہ رائج اور مقبول ہوا، وہ ارسطو ہی کا فلسفہ تھا، اور وہی آخری دور میں یونان کا فلسفہ سمجھا جانے لگا، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

ولکن هذه الفلسفة التی یسلکها الفارابی	یہ فلسفہ جس کی فارابی، ابن سینا، ابن رشد اور سہروردی
وابن سینا وابن رشد والسّهروردی	مقتول وغیرہ پیروی کرتے ہیں، یہ مشائین کا فلسفہ ہے،
المقتول ونحوه فلسفة المشّائین وهی المنقولة	اور یہ تمام تر ارسطو سے منقول ہے جس کو معلمِ اول
عن ارسطو الذی یسمونه المعلم الاول۔[2]	کے نام سے فلاسفہ یاد کرتے ہیں۔

یونانی فلسفہ میں خدا کی حیثیت

ارسطو کے اس فلسفہ میں خدا کی ہستی اور اس کا تصور محض وجود ذہنی بن کر رہ جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

فاذا تصور العاقل اقوالهم حق التصوّر	جب ایک صاحبِ عقل ان کے اقوال پر غور کرتا
تبین له ان هذا الواحد الذی اثبتوه	ہے، جو خدا کی ہستی کے متعلق ہیں تو اس پر یہ بات
لا یتصور وجوده الا فی الاذهان	واضح ہو جاتی ہے کہ جس واحد کو ان فلاسفہ نے ثابت
لا فی الاعیان۔[3]	کیا ہے اس کے وجود کا تصور صرف ذہن میں ہو سکتا
	ہے، خارج میں کہیں اس کا وجود نہیں۔

فلاسفہ نے خدا کے افعال و صفات کی نفی و انکار میں جس مبالغہ سے کام لیا ہے، اور اس کو جس طرح صفاتِ کمالیہ اور ان تمام محاسن اور اختیارات سے مجرّد ثابت کیا ہے، جو ادنیٰ مخلوقات

---

[1] نقض المنطق ص۱۱۳ [2] الرد علی البکری ص۲۰۶ [3] تفسیر سورۃ الاخلاص ص۳۷

ہیں پائے جاتے ہیں، اس کی بنا پر ان کا خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر خدا کی توہین ممکن نہیں، وہ کسی کا قول نقل کرتے ہوئے اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

لقد احسن بعض الفضلاء اذ قال	کسی کا مقولہ ہے کہ فلاسفہ کی توحید سے تو تھپڑ
الصّفع احسن من توحید الفلاسفة	مار دینا ہی بہتر ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کہنے
بل قصّر فیما قال۔[1]	والے نے بھی رعایت سے کام لیا۔

فلاسفۂ اسلام یونان کے مقلّدِ محض ہیں

ان کے نزدیک فلاسفۂ متاخرین جو اسلامی عہد میں پیدا ہوئے، اس فلسفۂ یونانی کے لکیر کے فقیر ہیں، اور ارسطو کے مقلّدِ محض ہیں، اور اسی تقلید کی پابندی کی وجہ سے ان کے یہاں فاش غلطیاں اور سخت تناقض پایا جاتا ہے، ان کو اس بات کی سخت شکایت اور رنج و غصہ ہے کہ ان مسلمان فلاسفہ نے اس نعمت کی بالکل قدر نہ کی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان تک پہونچی تھی، اور اس روشنی و ہدایت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا جو ان کی دسترس میں تھی، بلکہ انھوں نے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی، وہ لکھتے ہیں :۔

ان هٰؤلاء المتفلسفة المتاخرين في الاسلام	یہ پچھلے دور کے مسلمان فلسفی اہلِ علم و ایمان کے نزدیک
من اجهل الخلق عند اهل العلم والايمان	جاہل ترین مخلوق نظر آتے ہیں، ان کی گمراہی تضاد بیانی
وفيهم من الضلال والتناقض مالايخفى	ایسا کھلا ہوا ہے کہ ذرا ہوشیار بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں
على اذكياء الصبيان، لانهم لما التزموا	انھوں نے جب اس بات کو طے کر لیا کہ ان کو اپنے پیشروؤں
ان لايسلكوا الاسبيل سلفهم الضالين	اور پیشواؤں کے راستے پر چلنا ہے، جن کو خود راستہ نہیں ملا
وان لايفرّوا الابما يبنونه على تلك	تھا، اور ان کے قوانین پر استدلال کی جو عمارت کھڑی

[1] الرّد علی المنطقیین صـ۲۲۱

القوانين وقد جاءهم من النور والهدیٰ	ہوتی ہے اسی کو تسلیم کرتا ہے اور اس روشنی اور ہدایت سے
والبیان ما ملأ القلوب والالسنة والآذان	کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا ہے جس نے دلوں اور کانوں
صاروا بمنزلة من یرید ان یطفیٔ	کے پردے اٹھا دیئے تو اب ان کی مثال ایسی ہے جیسے
نور الشمس بالنفخ فی الهباء او یغطی	کوئی شخص آفتاب کی روشنی کو پھونک مار کر بجھانا
ضوءها بالعباء۔[1]	یا اپنے دامن کے نیچے چھپانا چاہے۔

ابن سینا حقیقت و منصب نبوت سے نا آشنا ہے

عہدِ اسلامی کے جن فلاسفہ نے فلسفہ کی تقلید اور ارسطو کے اتباع میں دینی حقائق اور عقائد کی تشریح کی کوشش کی، اور فلسفہ کی روشنی اور اس کے سہارے سے ان حقیقتوں کو سمجھنا اور سمجھانا چاہا، امام ابن تیمیہ ان فلاسفہ پر بھی جو حکمائے اسلام کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، سخت تنقید کرتے ہیں، ان کے نزدیک ان غیبی حقائق اور علوم کو فلسفۂ یونان کی تنہا مدد اور اس کے اصول و ضوابط سے نہیں سمجھا جا سکتا، اس سلسلہ میں ان کی سب سے بڑی تنقید ابن سینا پر ہے، جو اسلامی مشرق میں ارسطو کے فلسفہ کا سب سے بڑا شارح اور ترجمان سمجھا جاتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ابن سینا نے ثابت کیا ہے کہ منصبِ نبوت بھی نفس کی قوتوں میں سے ایک قوت ہے، اور نفوس کی قوتیں باہم بہت متفاوت ہیں، یہ بات ایک ایسا ہی شخص کہہ سکتا ہے، جو نبوت کی حقیقت سے محض نا آشنا اور اس سے بعید ہے، یہ بات ایسی ہے جیسے کوئی شخص صرف شعراء کے طبقوں اور ان کے گروہ سے واقف ہو، اور وہ یہ ثابت کرنا چاہے کہ دنیا میں فقہاء اور اطباء کا بھی ایک گروہ ہے، اور وہ شعراء کے وجود سے فقہاء اور اطباء کے وجود پر دلیل لائے بلکہ یہ مثال بھی پوری پوری چسپاں نہیں ہوتی، اس لئے کہ نبی اور غیر نبی میں اس سے بھی زیادہ تفاوت اور بُعد ہے، جتنا کہ فقیہ و طبیب و شاعر کے درمیان ہیں، لیکن فلاسفہ

---

[1] الرد علی البکری ص۱۱۵

نبوت کے مفہوم سے بالکل ناآشنا ہیں، جب انبیائے کرام کا چرچا ہوا، تو ان کے متبعین نے اس کو کبھی ان فلاسفہ کے اصول سے ثابت کرنا چاہا جس کو نبوت کا کوئی اندازہ اور انبیائے کرام سے کوئی واقفیت نہیں تھی"۔[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"ان گروہوں میں نبوت کے مفہوم و حقیقت سے سب سے زیادہ بعید فلسفۂ یونان کے پیرو (متفلسفہ) اور باطنیہ اور ملاحدہ ہیں، ان کے نزدیک نبوت کی بنیاد وہ قدر مشترک ہے جو تمام انسانوں کے درمیان پایا جاتا ہے، اور وہ خواب ہے، حقیقتہً ارسطو اور اس کے متبعین کے یہاں نبوت پر کوئی بحث نہیں ملتی، فارابی نے نبوت کو محض خواب کی ایک قسم قرار دیا ہے، اس لئے وہ اور اس کے ہم خیال فلسفی کو نبی پر ترجیح دیتے ہیں، ابنِ سینا کے نزدیک نبوت کا پایہ اس سے کچھ بلند ہے، اس نے نبی کی تین خصوصیتیں قرار دی ہیں، ایک یہ کہ اس کو علم بغیر تعلّم کے حاصل ہوتا ہے، اس کا نام اس کے نزدیک قوتِ قدسیہ ہے، اور اس کی حقیقت اس کے نزدیک وہی ہے، جو قوتِ حدسیہ کی ہے، دوسرے یہ کہ وہ اپنے نفس میں کسی معلوم چیز کا تخیل قائم کرتا ہے، اور اس کو اپنے اندرون میں کچھ نورانی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں، اور وہ اپنے باطن میں کچھ آوازیں سننے لگتا ہے، جیسے کوئی سونے والا نیند کی حالت میں کچھ صورتیں دیکھتا ہے، جو اس سے ہم کلام ہوتی ہیں، اور ان کا کلام سنتا ہے، اور اس سب کا وجود صرف اس کے اندر ہوتا ہے، خارج میں کوئی وجود نہیں، اس طرح ان سب لوگوں کے نزدیک ایک نبی جو کچھ سنتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے، اور لوگ اس کے دید و شنید میں اس کے شریک نہیں ہوتے، یہ سب اس کے اندرون میں پیش آتا ہے، اور اس کے باطنی مشاہدات موجودات ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں، یہی بات ایسے شخص کو پیش آسکتی ہے جس کے دماغ پر کوئی اثر ہو، یا صفرا و سودا کا غلبہ ہو، ان کے نزدیک نبی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کو ایک ایسی قوت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے سے وہ عالم کے ہیولیٰ میں تصرف کرتا ہے، اور عجیب امور اور حوادث ظاہر ہوتے ہیں، اور ان کے نزدیک

---

[1] النبوات صـ ۲۳

یہی انبیاء کے معجزات ہیں، اس لئے کہ ان کے نزدیک عالم میں جو حادثہ بھی پیش آتا ہے، وہ قوتِ نفسانیہ یا قوتِ ملکیہ یا قوتِ طبعیہ کا نتیجہ ہوتا ہے.........

ان متفلسفہ کے نزدیک انبیاء کے نفوس میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے، وہ سب عقل فعّال کا فیضان ہے۔

پھر جب انھوں نے انبیاء علیہم السّلام کا کلام سنا تو انھوں نے ان کے اور اپنے اقوال کے درمیان جمع و تطبیق کی کوشش کی، اس کے لئے وہ یہ کرتے تھے کہ الفاظ تو انبیاء علیہم السلام کے لیتے تھے، اور اس کی تشریح اپنے اصول کے مطابق کرتے تھے، اور اپنے مفہوم و معانی کو انبیاء علیہم السلام کے الفاظ میں ادا کرتے تھے، اس طرح وہ بحث کرتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام سے حاصل کئے ہوئے الفاظ اور اصطلاحات میں کتابیں تصنیف کرتے ہیں، جس شخص کو اس کی خبر نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی مراد کیا ہے اور ان فلاسفہ کی مراد کیا ہے اور دونوں کے مفہوم میں کتنا بڑا فرق ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان فلاسفہ کی مراد وہی ہے، جو انبیاء علیہم السلام کی تھی، اس طرح بہت سے گروہ اور جماعتیں گمراہ ہوئیں، ابن سینا اور اس کے متبعین کے کلام میں یہ بات صاف نظر آئے گی"۔[1]

علمِ کلام کا نقص، متکلّمین کا تذبذب

امام ابن تیمیہ کی تنقید صرف فلاسفۂ یونان اور ان کے مقلدین متفلسفۂ اسلام ہی پر نہیں ہے، بلکہ ان متکلّمین پر بھی ہے، جنھوں نے اگرچہ اسلام کی طرف سے مدافعت کرنے کی کوشش کی لیکن دینی اور غیبی حقائق کو ثابت کرنے کے لئے فلسفہ ہی کے طرز استدلال و مقدمات، اور اس کی محدود اور ناقص اصطلاحات کو اختیار کیا جو اپنا خاص مفہوم رکھتے تھے، اور جن کے ساتھ خاص روایات اور تاثرات وابستہ تھے، وہ کتاب "النبوات" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ان متکلمین کا کلام خلق و بعث، مبدأ و معاد، اور صانع کے اثبات میں نہ عقلی طور پر محققانہ اور

---

[1] النبوات ص ۱۶۸

تشفی بخش ہے نہ نقلی طور پر۔ اور ان کو خود بھی اس کا اعتراف ہے امام رازی نے آخر عمر میں کھلے طریقہ پر اعتراف کیا ہے کہ میں نے کلامی طریقوں اور فلسفیانہ مناہج پر بہت غور کیا آخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ان سے نہ کسی بیمار کی شفا ہوتی ہے نہ کسی پیاسے کی پیاس بجھتی ہے، میں نے سب سے قریب تر راستہ قرآن کے راستہ کو پایا، نفی کے بارے میں ذرا اس آیت کو پڑھو "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" "وَلَا يُحِيطُونَ بِهٖ عِلْمًا" اور اثبات میں ان آیات کو پیش نظر رکھو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" "اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ" "أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَآءِ" آخر میں وہ کہتے ہیں کہ جو میری طرح تجربہ کرے گا، وہ میری ہی طرح اس نتیجہ پر پہونچے گا، اسی طرح سے غزالی اور ابن عقیل نے بھی اسی سے ملتی جلتی باتیں کہی ہیں، اور یہی حقیقت ہے"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"متکلمین نہ تو فطرت عقلی کے راستہ پر ٹھیک ٹھیک چلے اور نہ شریعت نبوی کے راستہ پر، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو سلامت فطرت رہی، اور نہ شریعت کی استقامت، عقلیات میں وہ سفسطہ کی حد تک پہونچ گئے، اور سمعیات میں انتہائی باریک بینی اور بیجا تعمق کی سرحد تک پہونچ گئے"[2]

وہ بعض متکلمین کی اس کمزوری کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ بعض اوقات ان کے سوالات وشبہات بڑے طاقتور اور جوابات نسبتاً کمزور ہوتے ہیں، ان کے نزدیک اس سے ان لوگوں کو بعض اوقات بڑا نقصان پہنچتا ہے، جو ان کو اسلام کا وکیل وترجمان سمجھتے ہیں، اور جن کا مطالعہ انہی کی کتابوں تک محدود ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"جب یہ متکلمین نبوت کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اس پر ایسے سوالات وارد کرتے ہیں جو بڑے قوی اور عام فہم ہوتے ہیں، اور جب جواب دینے پر آتے ہیں تو جوابات کمزور نظر آتے ہیں، ہم اس کی مثالیں بھی دے چکے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص ان کتابوں سے علم، ایمان اور ہدایت

---

[1] النبوات ص ۱۴۸   [2] ایضاً

حاصل کرنا چاہتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ یہی اسلام کے حامی، اور اس کی طرف سے وکیل اور مناظر ہیں، اور انہی نے اس کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے، پھر اس کو نبوت کے ثبوت میں ان کی کتابوں میں تشفی بخش دلائل نہیں ملتے تو اس کے عقیدہ میں کچھ تذبذب اور تزلزل ہی پیدا ہوتا ہے، اس سے ایمان وعلم کا راستہ بند ہو گیا، اور نفاق وجہل کا راستہ کھل گیا خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کے معلومات متکلمین ہی کے دلائل تک محدود ہیں۔[۱]"

متکلمین وفلاسفہ کی مشترک غلطی وکمزوری

ان کے نزدیک متکلمین وفلاسفہ نے ایک ہی طرح کی غلطی کا ارتکاب کیا اور تمام اختلافات کے باوجود ان کا طریقۂ کار ایک ہے، ان دونوں گروہوں کی غلطی اور کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے قیاس سے اس چیز کو حاصل کرنا چاہا جو قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتی، اور فطرت ونبوت دونوں سے کشمکش اور زور آزمائی کی، اس لئے ان دونوں کی تحقیقات میں غلطیاں زیادہ اور نفع کم ہے۔[۲]

تطویل وتکلفات

متکلمین وفلاسفہ کے طرزِ استدلال اور دلائل کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری تطویل اور تکلفات ہیں، جن حقائق اور مقاصد کو ان متکلمین نے ان طول طویل دلائل ومقدمات سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اس سے زیادہ آسانی سے اختصار اور فطرت کے مطابق ثابت کئے جا سکتے ہیں، فلاسفہ ومتکلمین نے ان کے ثابت کرنے کے لئے ناحق طول طویل اور پیچدار راستہ اختیار کیا، وہ اپنے کسی پیشرو کا مقولہ لکھتے ہوئے اس کی مثال دیتے ہیں "کسی شخص سے پوچھا گیا کہ تمہارے کان کہاں ہیں؟ اس نے اپنا

---

[۱] النبوات ص۲۴۰ [۲] نقض المنطق ص۱۶۲

دایاں ہاتھ سر پر سے اٹھا کر بائیں کان تک مشکل پہونچایا، اور کہا کہ یہ، حالانکہ سیدھے طریقے پر اپنے دائیں ہاتھ سے دائیں کان یا بائیں کان کی طرف اشارہ کر سکتا تھا" اس موقع پر انھوں نے کسی شاعر کا شعر لکھا ہے ؎

اقام یعمل ایاما رویتہ — وشبہ الماء بعد الجھد بالماء

"بہت دن تک آدمی غور کرتا رہا، اور اپنے دماغ پر زور دیتا رہا، بڑی محنت کے بعد پھر پانی کی تعریف یہ کی کہ وہ پانی ہے"

متکلمین کے دلائل پر انحصار نہیں

ان کو متکلمین کی اس بات سے اختلاف ہے کہ ان مقاصد کو ثابت کرنے کے لئے وہی طریقۂ استدلال اور وہی مقدمات ہیں جو ان متکلمین نے اختیار کئے ہیں اور ان کے لئے اور کوئی راستہ نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات یہ طریقۂ استدلال اور یہ مقدمات تو صحیح ہوتے ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور طریقۂ استدلال، اور دوسرے مقدمات نہیں ہیں، اس لئے کہ مطالعہ اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کا علم انسانوں کے لئے زیادہ ضروری ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دلائل اور اس کی معرفت کو بھی اسی طرح آسان اور عام بنا دیتا ہے، اس بنا پر صانع کے اثبات اور اس کی توحید کے دلائل اور ثبوت کے علامات و دلائل بہت کثیر ہیں، اور لوگوں کے لئے ان کی معرفت کے ذرائع اور راستے بھی بہت کثیر ہیں، ان متکلمانہ دلائل اور مقدمات کی اکثر لوگوں کو سرے سے ضرورت ہی نہیں اور ضرورت بھی عام طور پر ان ہی لوگوں کو ہوتی ہے، جو ان کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے یا دوسرے طریقوں سے اعراض کرتے ہیں۔[1]

ایک طبقہ کو فائدہ

اس کے باوجود ان کو اعتراف ہے کہ بعض لوگوں کی ذہنی ساخت اور افتاد طبع ایسی ہوتی ہے کہ

---

[1] الرد علی المنطقیین ص ۲۵۵

ان کو اس طرزِ استدلال اور ان مقدمات کلامیہ اور منطقیہ سے فائدہ پہنچتا ہے اور اس کے بغیر ان کی تشفی نہیں ہوتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ علم ویقین ان طریقوں پر منحصر ہے بلکہ یہ ایک دماغی کیفیت ہے جو خاص ماحول وتربیت اور نفسیاتی احوال کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ طریقۂ استدلال اس قدر دقیق وخفی ہوتا ہے، اور اس کے مقدمات جتنے کثیر اور طویل ہوتے ہیں، اسی قدر اس کے لئے نفع بخش ہوتے ہیں، اس لئے کہ اس کو باریک امور میں طویل غور وفکر کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے، جب کوئی دلیل قلیل المقدمات ہوتی ہے، یا بہت واضح اور جلی ہوتی ہے تو اس کے نفس کو اس سے خوشی اور تسکین نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کے مقابلہ میں کلامی اور منطقی طریقۂ استدلال کو استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں، اس لئے نہیں کہ مطلوب کا علم اس پر موقوف ہے بلکہ اس لئے کہ یہ اس کے حال کے مناسب ہے کیونکہ اس طرح کے لوگوں کو جب ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو عوام کو معلوم ہیں، اور غیر ذہین لوگ بھی ان کو سمجھ سکتے ہیں، تو ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی، اور ان کو کوئی علمی امتیاز حاصل نہیں ہوا، وہ طبعی طور پر ایسے دقیق اور غامض مسائل کو جاننا چاہتے ہیں، جو کثیر المقدمات ہوں، ایسے لوگوں کے ساتھ بلاشبہ یہ راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے"[1]

قرآن کا اسلوبِ استدلال زیادہ دلنشیں اور یقین آفریں ہے

وہ اپنی کتابوں میں بڑے تشدد سے اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ مقاصدِ شریعت، حقائقِ غیبیہ اور حقائقِ دینیہ کے اثبات کے لئے سب سے بہتر اور طاقتور اور دلنشیں اسلوب وطرزِ استدلال قرآن مجید کا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اہلِ کلام وفلسفہ نے مطالبِ الٰہیہ پر جو دلائلِ عقلی قائم کئے ہیں، ان کے مقابلہ میں قرآن مجید کے دلائل کہیں زیادہ مکمل اور بلیغ ومؤثر ہیں، پھر اس کے ساتھ وہ ان بڑے بڑے مغالطوں سے بھی پاک وصاف

---

[1] الرد علی المنطقیین ص۲۵۵

ہیں، جو ان فلاسفہ و متکلمین کے دلائل میں پائے جاتے ہیں[۱]"۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید میں جو عقلی اور برہانی قیاسات اور ربوبیت، الٰہیت، وحدانیت، خدا کے علم و قدرت، امکان معاد وغیرہ جیسے مطالبِ عالیہ اور معارفِ الٰہیہ کے جو دلائل مذکور ہیں، وہ شریف ترین علوم و معارف ہیں، جن سے نفوسِ انسانی کی تکمیل ہوتی ہے[۲]"۔

ذات و صفات کے بارے میں قرآن اور فلسفہ کا بنیادی و اصولی فرق

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے ذات و صفات کے بارے میں قرآن مجید اور فلسفہ کا ایک اصولی فرق بیان کرتے ہوئے انھوں نے یہ اہم علمی نکتہ لکھا ہے کہ:۔

"قرآن مجید جہاں صفاتِ الٰہی ثابت کرتا ہے، وہاں تفصیل سے کام لیتا ہے اور صرف تمثیل کی نفی پر اقتصار کرتا ہے (لیس کمثلہ شیء) اور یہی انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے کہ ان کے یہاں اثبات مفصّل اور نفی مجمل ہے، اس کے برخلاف ان کے حریفوں اور مخالفین (فلاسفہ یونان) کے یہاں سارا زور نفی پر صرف ہوتا ہے اور اثبات سے وہ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں[۳]"۔

نفی صفات کا اثر پوری زندگی پر

فلسفۂ یونان کا پورا دفتر ابن تیمیہ کے اس نکتہ کی تصدیق کرتا ہے، فلاسفہ نے نفی میں جس مبالغہ اور اہتمام سے کام لیا ہے، اس نے خدا کے وجود کو محض ایک ذہنی تصور اور ایک مفلوج مجہول و مجبور ہستی بنا کر رکھ دیا ہے، لیکن خدا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اس بارے میں ان کے یہاں چند لفظوں اور فلسفیانہ

۱؎ الرد علی المنطقیین ص ۳۲۱ ۲؎ ایضاً ص ۱۵۰ ۳؎ النبوات ص ۱۵۳

اصطلاحات سے زیادہ کچھ نہیں ملتا، اس کا نتیجہ ہے کہ یونان کے اندر اور ان تمام حلقوں میں جو یونان کے فلسفہ کے زیر اثر رہے ہیں، خدا سے کوئی حقیقی زندہ اور عملی تعلق نہیں رہا ہے، اس لئے کہ اس حقیقی اور عملی قلبی اور جذباتی تعلق کے لئے اسماء وصفات وافعال کی ضرورت ہے، اور فلسفہ کو ان کی نفی پر اصرار ہے، دنیا کی پوری عقلی تاریخ میں کبھی انسان کو کسی ایسی ہستی سے قلبی تعلق اور وابستگی نہیں رہی ہے جس کی صفت وفعل کا اس کو کوئی علم نہ ہو، محبت، خوف، امید و رجاء، طلب و سوال سب کے لئے صفات کی ضرورت ہے، اور وہ فلسفۂ یونان میں بالکل منفی ہیں، اس لئے مورخین اخلاق وادیان کا بیان ہے کہ اہلِ یونان کا تعلق نہ صرف خدا کے ساتھ بلکہ مذہب کے ساتھ بالکل سطحی اور برائے نام تھا، اور اس میں کوئی روح اور گہرائی نہیں تھی، امام ابن تیمیہ نے ایک جگہ پر صحیح لکھا ہے کہ "لاکھوں نفی ایک اثبات کے قائم مقام نہیں ہو سکتے"، واقعہ یہ ہے کہ نفی محض پر کسی مذہب اور زندگی کی عمارت نہیں کھڑی ہو سکتی، اور غالباً مغرب میں فلسفۂ یونان اور مشرق میں بودھ مذہب اسی وجہ سے ایک ایسی انسانی سوسائٹی کے پیدا کرنے میں ناکام رہے جس کی عمارت خدا کے تصور اور عقیدہ پر قائم ہو اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان دونوں فلسفہ کے حلقۂ اثر میں ایک طرف بت پرستی اور دوسری طرف الحاد اور انکارِ خدا کا رجحان بہت جلدی دبے پاؤں چلا آیا، اس لئے کہ عوام کی تشفی (جن کی فطرت میں عبادت اور خدا پرستی کے جذبات ودیعت ہوتے ہیں) ایسے فلسفہ سے نہیں ہو سکتی جس میں سارا زور دماغی ورزش اور فلسفیانہ تصورات پر ہو، اور قلب و دماغ کے لئے معرفت ومحبت کی کوئی غذا فراہم نہ کی جائے۔

صحابۂ کرام کا امتیاز

ان کے نزدیک اس کا نتیجہ ہے کہ صحابۂ کرام کو جو نبوت کے فیض یافتہ تھے، جو معرفت وعلوم حاصل ہوئے، وہ بڑے مکمل اور گہرے ہیں، اور ان میں تکلف کا نام ونشان نہیں ہے، وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور متاخرین کا، جو فلسفہ اور علمِ کلام سے متاثر تھے، مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

واصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)	صحابۂ کرام باوجود اس کے کہ علم نافع اور عمل صالح
کانوا مع انھم اکبر النّاس علماً نافعاً	کے اعتبار سے کامل ترین خلائق تھے تکلفات سے بالکل
وعملاً صالحاً اقل الناس تکلّفاً یصدر	پاک و بری تھے کسی صحابی کی زبان سے ایک یا دو لفظ
من احدھم الکلمۃ والکلمتان من	حکمت و معارف کے نکل جاتے ہیں، اور ان دو لفظوں کے اثر و
الحکمۃ او من المعارف مایھدی اللہ	برکت سے پوری کی پوری قوم کو ہدایت نصیب ہو جاتی
بہ امۃ وھذا من منن اللہ علی ھٰذہ	ہے، یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اس کے
الامۃ، وتجد غیرھم یحشون الاوراق	مقابلہ میں دوسرے لوگ صفحے کے صفحے ان تکلفات
من التکلفات والشطحات ماھو من	و شطحات سے بھر دیتے ہیں، جو محض غیر ضروری مباحث
اعظم الفضول المبتدعۃ والآراء المخترعۃ۔[1]	اور نو ایجاد آراء و نظریات ہیں۔

منطق یونانی کا سحر اور رعب عالم اسلام پر

امام ابن تیمیہ نے فلسفہ پر اجمالی و تفصیلی تنقید کرنے اور اس کے بکثرت مسائل و مباحث کو خالص عقلی و استدلالی طریقہ پر رد کرنے اور ان کو کمزور و بے بنیاد ثابت کرنے کے بعد یونان کے پایۂ ناز علم منطق پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے، علمائے اسلام پر منطق کا سحر فلسفہ سے کچھ زائد ہی غالب تھا، اور اس کے سرتاپا معقول و مدلل اور محکم و مبرہن ہونے پر عام طور پر اتفاق تھا، ساعد قرطبی کے بیان کے مطابق تیسری ہی صدی میں منطق کی کتابوں کا عام رواج ہو گیا تھا، پانچویں صدی میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی منطق کو بڑی اہمیت دی اور اس کو تمام علوم کا مقدمہ قرار دیا، اپنی معرکۃ الآراء کتاب "المستصفیٰ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں "ھی مقدمۃ العلوم کلھا ومن لا یحیط بھا فلا ثقۃ بعلومہ اصلاً" (منطق تمام علوم کا مقدمہ ہے اور جس کو

[1] نقض المنطق ص۱۴۲

اس پر عبور نہیں، اس کو اپنے علوم پر مطلقاً اعتبار نہیں کرنا چاہئے[1]) اپنی دوسری کتاب (مقاصد الفلاسفہ) میں لکھتے ہیں:۔

امّا المنطقیات فاکثرها علی منهج الصواب	جہاں تک منطقی مسائل و مباحث کا تعلق ہے تو واقعہ
والخطاء نادر فیها وانما یخالفون اهل الحق	یہ ہے کہ ان میں سے اکثر درست اور ثابت ہیں اور ان میں غلطی
فیها بالاصطلاحات والایرادات دون	شاذ و نادر ہے اگر ان یونانی علمائے منطق کا اہلِ حق
المعانی والمقاصد، اذ غرضها تهذیب	سے کوئی اختلاف بھی ہے تو محض اصطلاحات اور اعتراضات
طرق الاستدلالات وذلك ممّا یشترك	کا ہے معانی اور مقاصد کا نہیں، اس لئے کہ اس فن کی
فیه النُّظّار[2]	غرض طرقِ استدلال کی درستگی اور اصلاح ہے اور
	اس بارے میں تمام اہلِ نظر متفق ہیں۔

ساتویں صدی کے مشہور حکیم و فلسفی ابن رشد کو منطق کے بارے میں اتنا غلو اور اعتماد تھا کہ وہ اس کو انسانی سعادت کا سرچشمہ اور معیار سمجھتا تھا، اور اس کے بغیر حقیقت تک پہنچنا اس کے نزدیک ناممکن تھا، اس کا سوانح نگار لکھتا ہے:۔

کان متهوسًا بمنطق ارسطو وقال عنه	ابنِ رشد کو ارسطو کی منطق سے عشق تھا، اس کے بارے
انّهٗ مصدر السّعادة للناس وان سعادة	میں اس کا قول ہے کہ وہ انسانوں کے لئے سعادت کا
الانسان تقاس بعلمه بالمنطق والمنطق	منبع ہے کسی انسان کی سعادت کے لئے صحیح پیمانہ یہ ہے کہ
أداة تسهل الطریق الشاقة فی الاصول	وہ منطق کتنی جانتا ہے منطق ایک ایسا آلہ اور ذریعہ ہے،
الی الحقیقة الّتی لا یصل الیها العامة	جو اس حقیقت تک پہونچنے کا راستہ آسان کر دیتا ہے،
بل بعض الخاصة بفضل المنطق۔[3]	جس تک عوام تو کیا بعض خواص بھی نہیں پہنچ سکتے۔

---

[1] المستصفیٰ ج۱ اول ص۱۰   [2] مقاصد الفلاسفہ ص۳   [3] تاریخ فلاسفۂ اسلام محمد لطفی جمعہ ص۱۲۰-۱۲۱

یونان کی اس منطق کے دفتر کو علمائے اسلام نے ہمیشہ ادب اور احترام کے ہاتھوں سے لیا اور وہ اس کے دعاوی و مقدمات اور اصول و کلیات سے مرعوب سے رہے، فلسفہ پر تنقید اور اس کی تشریح (چیر پھاڑ) کا کام تو طول طویل وقفوں کے بعد کسی حد تک ہوا، لیکن ہمارے علم میں کسی نے مستقل طور پر منطق یونانی کے علمی محاسبے و محاکمے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور اس موضوع پر کوئی بڑی محققانہ اور مفصل کتاب نہیں ملتی۔

منطق علومِ عقلیہ کی میزان نہیں!

ابن تیمیہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس کو مستقل موضوع بنایا اور اس پر آزادانہ اور مجتہدانہ تبصرہ اور تنقید کی، اس موضوع پر ان کی ایک مختصر اور مجمل کتاب "نقض المنطق" اور دوسری مفصل کتاب "الرد علی المنطقیین" ہے، آخر الذکر کتاب میں انھوں نے فنی اور علمی طور پر منطق کے قضایا، دعاوی اور حدود و تعریفات اور جزئیات و کلیات سے بحث کی ہے[1]، اور ثابت کیا ہے کہ اس فن کو علمائے اسلام نے جتنی اہمیت دی ہے اور اس کو جس قدر مسلّم الثبوت اور محکم سمجھا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، ان کو اس بات سے انکار ہے کہ وہ علومِ عقلیہ کی میزان ہے، اور اس پر استدلال و استنتاج کا اور علم یقین تک پہونچنے کا انحصار ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ منطق علوم عقلیہ کی میزان ہے، اور اس کی رعایت و پابندی، ذہن کو فکری غلطی سے بچا لیتی ہے، جیسے فنِ عروض شعر کے لئے اور نحو و تصریف عربی کے مرکب و مفرد الفاظ کے لئے میزان کا درجہ رکھتے ہیں، اور جس طرح آلات ہیئت اوقات کے لئے میزان ہیں۔

لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، اس لئے کہ عقلی علوم ان اسباب ادراک کے ذریعہ سے حاصل کئے جاسکتے

---

[1] یہ کتاب حال میں مطبعہ قیمہ کی طرف سے شائع ہو گئی ہے، جس پر مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ ہے، اس کتاب کی ضخامت ۵۴۵ صفحات ہے، علمائے فن کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی فطرت میں ودیعت کئے ہیں، ان کا کسی شخص معین کے وضع کئے ہوئے میزان پر انحصار نہیں، اور جس طرح عربیت میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں اس لئے کہ وہ ایک قوم کی عادت ہے جو صرف سماع سے معلوم کی جاسکتی ہے اور اس کے قوانین کا ذریعۂ علم صرف استقراء ہے اس طرح عقلیات میں تقلید نہیں چلتی، اس طرح سے کیل، وزن، عدد و شمار اور زراعت وغیرہ میں پیمانوں وغیرہ کی ضرورت ہے۔

منطقِ یونانی کی وضع و ایجاد سے پہلے بھی دنیا کی قومیں حقائق اشیاء کو جانتی تھیں، اور اس کی وضع و ایجاد کے بعد بھی اکثر قومیں ہیں، جو منطق کی مدد کے بغیر حقائق اشیاء کو جانتی سمجھتی ہیں اور تمام دنیا کی قوموں کے اکثر عقلاء ارسطو کے ان اصول و قواعد کو سیکھے بغیر حقائق کو سمجھتے ہیں اور یہ لوگ بھی اگر اپنی حالت پر غور کریں گے تو ان کو محسوس ہوگا کہ ان کے نفوس کو اس وضعی فن کے بغیر حقائق کا علم حاصل ہوتا ہے"۔[۱]

بہت سی منطقی حدود و تعریفات مخدوش اور کمزور ہیں

ان کو اس سے بھی انکار ہے کہ منطقی حدود و تعریفات پورے طور پر جامع و مانع اور فنی طور پر مکمل ہیں، اور ان پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

وصاروا يعظمون امر الحد ويدّعون	اہلِ منطق حدودِ منطقیہ کی اہمیت میں بڑا مبالغہ
انّهم هُمُ المحققون لذلك وان مايذكره	کرنے لگے، ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس فن کے محقق ہیں
غيرهم من الحدود انما هي لفظية	اور یہ کہ ان کے علاوہ دوسرے علماء جو حدود بیان کرتے
لاتفيد تعريف الماهية والحقيقة	ہیں وہ لفظی ہوتی ہیں اور ماہیت اور حقیقت کو پورے
بخلاف حدودهم ويسلكون الطرق	طور پر بیان نہیں کرتیں بخلاف ان کے حدود کے اور یہ
الصعبة الطويلة والعبارات المتكلفة	اہلِ منطق بڑے دشوار اور طویل راستے اختیار کرتے ہیں

[۱] الرد علی المنطقیین ص ۲۷-۲۸

الھائلۃ ولیس لذلک فائدۃ الاتضیع الزمان وانتعاب الاذھان وکثرۃ الھذیان ودعوی التحقیق بالکذب والبھتان وشغل النفوس بما لاینفعھا بل قد یضلھا عما لابد لھا منہ واثبات الجھل الذی ھو اصل النفاق فی القلوب وان ادّعوا انہ اصل المعرفۃ والتحقیق۔[1]

اور بڑی پُرتکلف اور مرعوب کرنے والی عبارتیں استعمال کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوائے اضاعت وقت، دماغی تکان، کثرت ہذیان اور تحقیق کے دعویٰ اور لاف زنی کے اس کا کوئی فائدہ نہیں، یہ نفوس کو ایسی چیزوں میں مشغول کرتے ہیں جو کچھ مفید نہیں، بلکہ بعض اوقات گمراہی اور جہالت آفرینی کے سوا جو قلوب کے نفاق کا ذریعہ ہے کچھ اور حاصل نہیں اگرچہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ معرفت اور تحقیق کی بنیاد ہے

کوہ کندن وکاہ برآوردن

ایک جگہ وہ ثابت کرتے ہیں کہ منطق درحقیقت ایک "کوہ کندن اور کاہ برآوردن" کا سا عمل ہے کہ محنت اور بحث بہت زیادہ اور حاصل محصول بہت کم "نقض المنطق" میں فرماتے ہیں:۔

"یہ بات واضح ہے کہ منطق کو واجب قرار دینا محض ان لوگوں کا قول ہے جو غالی اور حقیقت سے ناآشنا ہیں، خود ماہرین فن بھی اپنے تمام علوم میں منطق کے قوانین کی پابندی نہیں کرتے، بلکہ بعض اوقات کبھی تو ان کی طوالت کی وجہ کبھی غیر مفید ہونے کی بنا پر اور کبھی بعض قوانین کے فاسد ہونے کی وجہ سے اور کبھی ان کے اجمال اور اشتباہ کی وجہ سے وہ ان سے خود اعراض کرتے ہیں، اس میں متعدد ایسے مقامات ہیں، جو کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہیں۔"[2]

---

[1] الرد علی المنطقیین ص ۳۱۱   [2] نقض المنطق ص ۱۵۵

منطق کا اثر ذہن اور قوت بیانیہ پر

ان کے نزدیک منطق سے اکثر اوقات یہ نقصان بھی پہنچا ہے کہ طبیعت کی جولانی اور زبان و خیالات کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے، چنانچہ جو لوگ قواعدِ منطقیہ اور منطقی اسلوب کی بڑی پابندی کرتے ہیں ان میں ژولیدہ بیانی، مشکل پسندی و اغلاق اور ایک طرح کی ذہنی کجی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ متاخرین کے متون اور پچھلے دور کی نصابی کتابیں اس کا واضح نمونہ ہیں، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

ومازال نظّار المسلمين يعيبون طريق اهل المنطق ويبيّنون ما فيها من العيّ واللكنة وقصور العقل وعجز المنطق ويبينون انها الى افساد المنطق العقلى واللسانى اقرب منها الى تقويم ذلك۔[1]	مسلمان اہلِ نظر و مناظرہ شروع سے اہلِ منطق پر کڑی تنقید کرتے رہے کہ اس سے اشتغال کرنے والوں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ بے تکلف اظہارِ خیال نہیں کر سکتے ان کی زبان و قلم میں ایک طرح کی بندش اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، ذہن اپنا پورا کام نہیں کرتا اور زبان ساتھ نہیں دیتی، اور وہ اس بات کو واضح کرتے رہے کہ بجائے ذہن اور زبان کی ترقی اور تقویت کے اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ ذہن اور زبان کو اس نے نقصان ہی پہنچایا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اذا اتسعت العقول وتصوّراتها اتسعت عباراتها واذا ضاقت العقول	قاعدہ یہ ہے کہ جب عقول و تصورات میں وسعت ہوتی ہے تو عبارتوں میں بھی وسعت ہوتی ہے، اور

[1] الرد علی المنطقیین ص ۱۹۴

والتصورات بقى صاحبها كانه محبوس العقل واللسان كما يصيب اهل المنطق اليونانى تجده من اضيق الناس علمًا وبيانًا، واعجزهم تصورًا وتعبيرًا، ولهذا من كان منهم ذكيًّا اذا تصرف فى العلوم وسلك مسلك اهل المنطق طوّل وضيّق وتكلّف وتعسّف وغايته بيان البين وايضاح الواضح من العيّ وقد يوقعه ذلك فى انواع من السفسطة التى عافى الله بها من يسلك طريقه۔[1]

دماغ تنگ اور تصورات محدود ہوتے ہیں تو انسان ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ عقلی اور لسانی طور پر محبوس ہے جیسے کہ منطق یونانی سے اشتغال کرنے والوں کو اکثر پیش آتا ہے، تم دیکھو گے کہ وہ اپنے علم و بیان میں بڑے تنگ دامن اور اپنے تصوّر و تعبیر میں بڑے عاجز نظر آتے ہیں، اسی لئے ان میں سے جو ذکی بھی ہوتا ہے جب علوم میں تصرف کرتا ہے، اور اہلِ منطق کا راستہ اختیار کرتا ہے تو تطویل و تضییق اور تکلف و مشقت سے کام لیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معلوم چیز کو بیان اور ایک واضح چیز کو زیادہ واضح کر دے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ منطق کے اشتغال سے اس کے ذہن و زبان پر قفل سے پڑ گئے ہیں بعض اوقات وہ سفسطہ اور حقائق اشیاء کے انکار کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے وہ لوگ محفوظ ہیں، جنھوں نے ان اہلِ منطق کا راستہ اختیار نہیں کیا ہے۔

بعض مستثنیات

امام ابن تیمیہ کے سامنے بعض ایسے اشخاص بھی ہیں جو یونانی علم و حکمت میں انہماک رکھنے اور ان علوم

[1] الرد علی المنطقیین ص۱۶۷

ہیں درجۂ امامت تک پہونچنے کے باوجود بڑے شگفتہ قلم، خوش تحریر اور ادیب تھے، مثلاً ابن سینا جس کا قصیدۂ روحِ عربیت کا بڑا عمدہ نمونہ اور جس کی تحریروں میں اہلِ حکمت کے برخلاف حلاوت و بلاغت پائی جاتی ہے، ان کے نزدیک یہ اسلامی اور عربی ادب و لٹریچر سے اشتغال اور علوم اسلامیہ کا فیض ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ ابن سینا کے حالات و سوانح سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

ومن وجد فی بعض کلامہ فصاحۃ وبلاغۃ	ان فلاسفہ و اہلِ منطق میں سے جس شخص کے کلام میں کچھ
کما یوجد فی بعض کلام ابن سینا وغیرہ فلما	فصاحت یا بلاغت محسوس ہوتی ہے جیسے کہ ابن سینا
استفادہ من المسلمین من عقولھم	کی بعض تحریروں میں نظر آتی ہے تو یہ مسلمانوں کے
والسنتھم والافلو مشی علی طریقۃ سلفہ	عقول و آداب سے فائدہ اٹھانے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر
واعرض عمّا تعلمہ من المسلمین لکان	وہ اپنے پیشروؤں کے راستہ پر چلتا رہتا، اور اس نے
عقلہ ولسانہ یشبہ عقولھم والسنتھم[1]	مسلمانوں سے جو علوم حاصل کئے ہیں ان سے اعراض
	کرتا تو اس کی عقل و زبان بھی ان ہی کے عقل و زبان
	کی طرح کوتاہ اور قاصر نظر آتی۔

منطق کے متعلق اجمالی رائے

ان تنقیدات اور تبصروں کے بعد اس فن کے متعلق ان کی اجمالی رائے خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

فحقہ النّافع فطری لا یحتاج الیہ	منطق کا جتنا حصہ درست اور مفید ہے وہ تو فطری ہے
وما یحتاج الیہ لیس فیہ منفعۃ	جس کی (ایک سلیم الفطرت کو) ضرورت نہیں، اور جتنے حصے
الا معرفۃ اصطلاحھم وطریقھم	کی ضرورت ہے اس کا بھی فائدہ صرف اتنا ہے کہ اہلِ فن کی

---

[1] الرد علی المنطقیین ص ۱۹۹

او خطأهم۔[1]

اصطلاحات، ان کا طریقۂ استدلال یا ان کی غلطیاں معلوم ہو جاتی ہیں۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

انی کنت دائماً اعلم ان المنطق الیونانی لا یحتاج الیہ الذکی ولا ینتفع بہ البلید۔[2]

میرا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے فطری ذکاوت عطا فرمائی ہے اس کو تو اس یونانی منطق کی ضرورت نہیں اور جو اس ذکاوت سے محروم ہے اس کو اس منطق سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

منطق کا صحیح مقام اور فائدہ

منطقِ یونانی کے بارے میں امام ابن تیمیہ کے ان آراء و خیالات میں خواہ کسی قدر انتہا پسندی اور غلو کا رنگ نظر آئے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منطق کی عظمت و تقدیس کے اس طلسم پر جو تمام عالمِ اسلام پر پانچویں صدی کے بعد سے چھایا رہا ہے، ابنِ تیمیہ کی تنقیدوں سے ایک ضرب لگی، اور ایسا ہونا ضروری تھا، اس کے بارے میں ہمارے درسی اور علمی حلقوں میں جس قدر غالیانہ اور مبالغہ آمیز عقیدت قائم رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جو منطق سے ناآشنا ہو، اس کو اس کے تمام علوم و کمالات اور فطری ذکاوت کے باوجود جاہل اور احمق سمجھا جاتا رہا ہے، اور عرصہ تک ہندوستان میں منطق و فلسفہ کو "دانشمندی" اور ان کی کتابوں کو "کتبِ دانشمندی" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے، اس غلو اور عقیدت کے خلاف ردّ عمل بھی قدرتی امر ہے، اور اسی ردّ عمل سے اس بات کا امکان ہے کہ اس کے بارے میں معتدل رائے قائم کی جائے گی، اور اس کو اس کا صحیح مقام دیا جائے گا، منطق ایک طرح کی ذہنی ورزش اور دماغی ریاضت ہے، اور اس میں کوئی شبہ

---

[1] الرد علی المنطقیین ص۲۰۱ [2] ایضاً ص۳

نہیں کہ اس سے تشحیذ ذہن کا کام لیا جا سکتا ہے، اور اگر اس کو اسی حد تک رکھا جائے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، خود امام ابن تیمیہ کو اس کا اعتراف ہے "الرّد علی المنطقیین" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

وایضاً فان النظر فی العلوم الدّقیقۃ	یہ بات بھی ہے کہ علوم دقیقہ میں غور و مطالعہ سے
یفتق الذھن ویدربہ ویقوّیہ	ذہن کھلتا ہے اور اس کی مشق ہوتی ہے اور علم کی
علی العلم فیصیر مثل کثرۃ الرّمی بالنشاب	طاقت حاصل ہوتی ہے، بالکل جس طرح سے تیر اندازی
ورکوب الخیل تعین علی قوۃ الرّمی	اور شہسواری کی مشق سے نشانہ ٹھیک ہوتا ہے اور گھوڑے
والرکوب وان لم یکن ذلک وقت	کی سواری آسان ہو جاتی ہے اور لوگ جنگ سے پہلے بھی
قتال، وھذا مقصد حسن۔[1]	ان چیزوں کی مشق کرتے ہیں یہ ایک اچھا مقصد ہے۔

لیکن لوگوں نے جس طرح اس کو بجائے وسیلہ کے مقصود، اور بجائے مقدمہ کے اصل علم سمجھ لیا ہے، اس سے ہر منصف اور بالغ نظر کو اختلاف ہوگا۔

دینی و الٰہی حقائق کے بارے میں منطق کی بے بسی

منطق و فلسفہ کے بارے میں ایک غلو شروع سے یہ چلا آ رہا ہے کہ جس طرح اس کے قواعد و اصول کو علوم عقلیہ میں فیصلہ کن اور حَکَم سمجھا جاتا ہے، اس طرح سے دینی و الٰہی حقائق کے بارے میں بھی ان سے بے تکلف کام لیا جاتا ہے اور ان کے فیصلہ کو تسلیم کیا جاتا ہے، امام ابن تیمیہ اس بات کو پوری طاقت سے واضح کرتے ہیں، کہ اگر منطق کو ایک میزان و ترازو کا بھی درجہ دیا جائے تو اس ترازو کا کام اور اس کا دائرۂ عمل بہر حال محدود رہے گا، اس ترازو پر حقائقِ دینیہ کو تولنا ایسا ہی ہے، جیسے لکڑی، سیسہ اور پتھر تولنے کی ترازو پر سونے چاندی اور جواہرات کو تولا جائے "نقض المنطق" میں لکھتے ہیں:-

---

[1] الرد علی المنطقیین ص ۲۵۵

"اتنی بات مسلم ہے کہ لکڑی اور سیسہ اور پتھر کو تولنے کے لئے جو ترازو بنائے گئے ہیں، ان پر سونے چاندی کو نہیں تولا جا سکتا، نبوت کا معاملہ اور انبیاء علیہم السلام جن حقائق کو لے کر آئے ہیں، وہ علوم میں اس سے کہیں زیادہ رفیع اور نازک ہیں، جتنا کہ سونا مالیات میں ہے، تمہاری منطق اس کے لئے کوئی میزان نہیں بن سکتی، اس لئے کہ اس میزان میں جہل و ظلم دونوں جمع ہیں، یا تو وہ ان کے وزن و درجہ سے واقف نہیں، اور ان کو وزن کرنے اور ان کی حیثیت بیان کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں اس لئے جاہل ہے، یا وہ حق کا انکار کرتی ہے اور اس کو قبول نہیں کرتی ہے اس لئے ظالم ہے، حالانکہ وہ حق ہے جس کا طبائع انسانی کے پاس کوئی بدل نہیں اور نہ ان علوم سے کسی کو استغنا ہے اور اسی پر بنی نوع کی سعادت منحصر ہے[1]"

اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا کہ نویں صدی کے ایک دوسرے سلیم الطبع اور نقاد عالم ابن خلدون کا ایک اقتباس بھی پیش کر دیا جائے جو بالکل اس مفہوم و معنی کو ادا کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں مختلف اور متعدد سلیم الطبع انسان محض اپنی سلامتِ طبع سے کس طرح ایک حقیقت تک پہونچ جاتے ہیں، اور ان میں خیالات و افکار کا کیسا توارد ہوتا ہے، عقل کے محدود ہونے اور حقائق دینیہ و غیبیہ کا احاطہ کرنے سے قاصر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"عقل ایک صحیح ترازو ہے، اس کے فیصلے یقینی ہیں، جن میں کوئی جھوٹ نہیں لیکن تم اس ترازو میں امورِ توحید، امورِ آخرت، نبوت، صفاتِ الٰہی اور وہ تمام امور و حقائق جو ماوراءِ عقل ہیں تول نہیں سکتے، یہ لاحاصل کوشش ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لئے ہے، اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کے تولنے کا شوق پیدا ہوا، جو ناممکن ہے، اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے،

---

[1] نقض المنطق ص ۱۶۴

اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی، وہ اللہ اور اس کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے۔"[1]

منطق پر تفصیلی وفنّی تنقید اور ابن تیمیہ کے اجتہادات واضافات

امام ابنِ تیمیہ نے فن منطق پر محض اجمالی تبصرہ اور اصولی اعتراضات پر اکتفا نہیں کی، بلکہ پورے فن پر ایک ناقدانہ اور مجتہدانہ نظر ڈالی، اور اس کا علمی احتساب کیا، انھوں نے اس کے بہت سے اصول ومسلّمات کے تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور ان پر خالص عقلی اور فنی حیثیت سے بحث کی، اس کی بہت سی تعریفات وحدود کو مخدوش وکمزور ثابت کیا، اور ان سے بہتر تعریفات وحدود پیش کئے، اس کے بہت سے قضایا اور ان کی ترتیب سے اختلاف کیا، قیاس کے مقابلہ میں جو ارسطو کے منطق کی اساس ہے، استقراء کی ترجیح ثابت کی اور اس کو حصولِ علم ویقین کا زیادہ طبعی سہل اور محفوظ طریقہ بتلایا، اسی کے ساتھ انھوں نے منطق وفلسفہ میں کئی جدید نظریات پیش کئے، اور فن میں اضافے کئے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم "الرد علی المنطقیین" کے مقدمہ میں ان کی اس خدمت وعظمت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر تم اس کتاب کا غور وفکر سے مطالعہ کرو گے تو تم کو متعدد ایسے منطقی اور فلسفی مسائل ملیں گے جن کے ابن تیمیہ موجد ہیں، اور وہ اس وقت کے مغربی فلاسفہ کی تصنیفات ونظریات سے بالکل مطابقت رکھتے ہیں، مثلاً تمام مسلمان علمائے منطق نے اس بارے میں ارسطو کی پیروی کی ہے کہ کلیات علم کی بنیاد ہیں، اور اس بنا پر انھوں نے برہانیات کو ترجیح دی ہے، اور اصول استقراء کی تحقیر کی ہے، اس بنا پر بعض علمائے فرنگ نے یہاں تک لکھا کہ مشہور انگریز منطقی عالم مل (MILL) پہلا شخص ہے جس نے استقراء کے اصول کو مرتب کیا، اور منطق جدید کی بنیاد رکھی (حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صـ۴۷۳

کئی صدی پہلے امام ابن تیمیہ اس پر زور دے چکے ہیں۔

اسی طرح سے انھوں نے حقیقتِ حد، جنس فصل، لزوم، حقیقت علت، قیاس، استقراء، استدلال بالمشہورات، قیاس میں ایک مقدمہ پر اکتفا وغیرہ جیسے اہم اور پیچیدہ مباحث کو جس طرح حل کیا ہے اور محکم دلائل سے اپنے نظریات ثابت کئے ہیں، وہ ان کی ذکاوت و اجتہاد پر گواہ ہے علت و لزوم کے بارہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے، بعینہٖ وہی نظریہ ہے جس کو مشہور فلسفی ہیوم (HUME) نے اپنی کتابوں میں ثابت کیا ہے، اہلِ علم کو معلوم ہے کہ لزوم و علّیت ان دشوار ترین مسائل میں سے ہے، جن میں دماغوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اسی سے طبائعین (نیچر کو ماننے والے) اور ملحدین کی بہت سی گمراہیاں نکلی ہیں، اس کتاب میں امام ابنِ تیمیہ کی بہت سی جدید تحقیقات اور جدید نظریات ہیں، جو ان کی علمی عظمت اور غیر معمولی ذکاوت کی دلیل ہے[1]۔"

علومِ عقلیہ میں تقلید درست نہیں ہے

امام ابنِ تیمیہ کو اس بات کا احساس ہے کہ لوگ ان کے ان اعتراضات اور اختلافات کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ یونانی علوم ایک بڑا قدیم علمی ذخیرہ ہے جس کی ترقی و تہذیب میں کئی نسلوں کے بہترین دماغوں نے حصہ لیا ہے، اور ان کو ترقی و کمال کے اعلیٰ مقام تک پہونچا دیا ہے، اس لئے اب ان میں غلطی کا بہت کم احتمال رہ گیا ہے، اور ان پر پچھلے دور کے کسی ناقد کا تنقید اور اعتراض کرنا ایک بڑی علمی جسارت اور اضاعت وقت ہے امام ابن تیمیہ اس مقدمہ کو تسلیم نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ جب یہ علوم محض عقلی ہیں، اور ان کی بنیاد غور و فکر اور مطالعہ پر ہے تو ان میں محض تقلید کا کیا جواز ہے، خود اس کے ناقل اس کو کسی وحی والہام پر مبنی نہیں بتاتے بلکہ اس کی بنیاد عقل پر رکھتے ہیں اس لئے ہر زمانہ کے اہل عقل کو یہ حق ہے کہ ان پر ناقدانہ

---

[1] مقدمہ الرد علی المنطقیین ص ق

نظر ڈالے اور عقل کے ترازو پر تولے اور جو چیز خلافِ عقل ہو اس کو بے تکلف رد کردے" وہ "الرد علی المنطقیین" میں ایک جگہ بعض شیوخِ منطق کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "یہ علوم وہ ہیں جن کو ہزار برس تک بہترین دماغوں نے صیقل کیا ہے، اور ہر زمانہ کے اہل فضل نے ان کو قبول کیا ہے" پھر اس کا جواب دیتے ہیں :-

هب ان الامر كذلك فهذه العلوم	فرض کرو کہ بات یوں ہی ہے لیکن یہ علوم تو خالص
عقلية محضة ليس فيها تقليد لقائل	عقلی علوم ہیں، جن میں کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں
وانّما تعلم بمجرّد العقل فلا يجوز ان	یہ تو مجرد عقل سے معلوم کئے جاتے ہیں، اور اس لئے
تصحح بالنّقل بل ولا يتكلم فيها الا بالمعقول	نقل کے ذریعہ ان کی تصحیح درست نہیں اور ان میں
المجرّد فاذا دلّ المعقول الصريح على	خالص معقولات کی بنا پر کلام کیا جاتا ہے تو جب
بطلان الباطل منها لم يجز ردّه فان	معقول صریح ان میں سے کسی باطل کے بطلان پر
اهلها لم يدّعوا انها ماخوذة عمّن	دلالت کرے تو اس کا مسترد کرنا جائز نہیں اس لئے
يجب تصديقه بل عن عقل محض	کہ خود علمائے منطق نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ کسی
فيجب التحاكم فيها الى موجب	ایسی ہستی یا ذریعہ سے ماخوذ ہے جس کی تصدیق واجب ہے،
العقل الصريح۔[1]	وہ خود کہتے ہیں کہ ان کا تعلق عقل محض سے ہے اس لئے
	ان کے بارے میں عقل صریح کے موجبات ہی کی طرف رجوع
	کرنا صحیح اور اس کے فیصلہ کو قبول کرنا ضروری ہوگا۔

عالمِ اسلام کے پچھلے دور میں علومِ عقلیہ کا جمود و انحطاط، اور ابن تیمیہ کے کام کی اہمیت

واقعہ بھی یہی ہے کہ معقول کو ہمیشہ معقول ہی رہنا چاہئے منقول نہیں بننا چاہئے لیکن عالمِ اسلام

---

[1] الرد علی المنطقیین ص ۳۰۸

پر جب علمی و فکری زوال طاری ہوا اور دماغوں اور قوتِ فکریہ نے اپنا کام آزادی سے کرنا چھوڑ دیا تو تمام علمائے حکمت و فلسفہ بھی اپنے پیشروؤں کی لکیر کے فقیر بن گئے اور ان کی تحقیقات و تصنیفات کے ناقل و شارح بن کر رہ گئے، اور معقولات اور منقولات میں کوئی فرق نہیں رہ گیا، متاخرین کی بڑی سے بڑی پرواز یہ تھی کہ وہ متقدمین کے کلام کی شرح کر دیں، اور ان کے مطالب کو کم سے کم الفاظ میں ادا کر دیں، یہی مشرق کا وہ دورِ انحطاط ہے، جب علم و حکمت میں اضافہ، تجدید، اجتہاد اور "تخلیقی" کام کا دروازہ بالکل بند ہو گیا، یورپ میں (جس نے یونان کے منطق و فلسفہ کو مسلمانوں کے واسطے سے حاصل کیا تھا، اور حکمائے یونان کے افکار و فلسفہ کو ابن سینا اور ابن رشد کے ذریعہ سمجھا تھا) کچھ عرصہ تک اس علمی میراث پر قناعت کرنے کے بعد فکر و نظر اور تحقیق و تجربہ کا کام آزادانہ طریقہ پر شروع ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانیوں کی منطق و فلسفہ کی بساط الٹ گئی، قیاس کے بجائے استقراء پر منطق کی بنیاد رکھی گئی مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کے بجائے جن کا عملی اور علمی زندگی میں کچھ حاصل نہ تھا، طبیعیات پر زور دیا گیا اور اس فکری انقلاب نے نہ صرف یورپ کی دنیا کو بلکہ سارے عالمِ انسانی کو متاثر کیا، اس کے برخلاف ہمارے قدیم علمی و مدرسی حلقوں میں یونانی علوم اور ان کے مشرقی شارحین اور پھر آخر میں ایرانی مصنّفین کی کتابوں اور شروح و حواشی کو اس مضبوطی سے پکڑا گیا کہ گویا وہ العروۃ الوثقیٰ اور فکر و نظر کا سدرۃ المنتہیٰ ہیں اس عقلی جمود و تقلید کے دشت بے نشان میں امام ابن تیمیہ کا یہ مجتہدانہ کارنامہ اور فلسفہ و منطقِ یونانی کی علمی تنقید و محاسبہ ایک سنگِ میل اور چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور نئے اجتہاد و تفکر کا دروازہ کھولتا ہے۔

غیر اسلامی ملل و فرق کی تردید

اور

ان کے عقائد و رسوم و اثرات کا مقابلہ

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے یوں تو تقریباً تمام غیر اسلامی مذاہب و عقائد کی تنقید و تردید کی خدمت انجام دی اور ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ اس علمی جہاد کی نذر ہوا، مشکل سے ان کی کوئی تصنیف متکلمانہ بحث و مناظرہ سے خالی ہوگی، لیکن ہم یہاں ان مذاہب و فرق میں جن کا ابن تیمیہ نے مقابلہ کیا، صرف دو (عیسائیت اور شیعیت) کو انتخاب کرتے ہیں، اس لئے کہ ان دونوں پر ان کی دو علیحدہ و معرکۃ الآراء تصانیف (الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح اور منہاج السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ) یادگار ہیں، نیز ان دونوں میں ایک لطیف مناسبت اور قدر مشترک بھی ہے، جس کا اظہار اس حدیث میں ہوا ہے، جس میں حضرت علیؓ کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے "یہلك فیك اثنان محب غال و مبغض" (اے علی! تمہارے بارے میں دو طرح کے لوگ ہلاک ہوں گے، ایک غالی محب اور ایک بغض رکھنے والے) اور اس لئے بھی کہ شیخ الاسلام کے زمانہ میں مذاہب میں سے صرف مسیحیت اور فرقوں میں سے صرف شیعیت (اپنی مختلف شاخوں اور اقسام کے ساتھ) دو زندہ تحریکیں اور طاقتور مذاہب تھے، اور شاید اسی لئے امام ابن تیمیہ نے ان دونوں کو اپنی مستقل اور منفرد تصانیف کا موضوع بنایا۔

ردِّ عیسائیت

عالمِ اسلام میں عیسائیت کی نئی تحریک

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی ملکوں میں دوسرے مذاہب و ادیان نے نئی کروٹ لی۔ ان مذاہب و ادیان میں سب سے زیادہ جرأت و ستعدی کا اظہار مسیحیت نے کیا جس کے ماننے والوں کی بڑی تعداد اسلامی ممالک بالخصوص مصر و شام میں موجود تھی خصوصیت کے ساتھ شام سے متصل عیسائی ممالک کا سلسلہ تھا، اور ان کی عظیم الشان عیسائی سلطنت (سلطنت قسطنطنیہ) کی سرحدیں اس سے ملتی تھیں، پانچویں صدی ہجری کے آخر میں یورپ نے شام و فلسطین پر حملوں کا وہ سلسلہ شروع کیا جو جنگ صلیبی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہیں، شام کا ایک بڑا حصّہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا اور نوّے ۹۰ برس تک بیت المقدس عیسائیوں کے اقتدار و تولیت میں رہا سلطان صلاح الدین ایوّبی نے اگرچہ حطّین کے میدان میں عیسائیوں کو فیصلہ کن شکست دی تھی، اور بیت المقدس کو بازیاب کر لیا تھا، لیکن شام کے ساحل پر اب بھی ان کی ایک ریاست باقی تھی، اور عیسائی مبلغین اور علماء کے حوصلے اس فتح سے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ وہ شام کو دوبارہ مسیحیت کے جھنڈے کے نیچے اور صلیب کے سایہ میں لینے کے خواب دیکھتے تھے، تاتاریوں کے حملے نے ایک طرف مسلمانوں کو نیم جان کر دیا تھا اور دوسری طرف عیسائیوں کو بڑا اسہارا دیا تھا کتاب کے پہلے حصہ میں گذر چکا ہے کہ ۶۵۸ھ میں جب تاتاری دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے تو عیسائیوں نے شہر سے نکل کر ان کا استقبال کیا، اور ان کو تحائف پیش کئے، وہ صلیب کو سروں پر بلند کئے ہوئے تھے، اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصۂ اول صـ ۴۰۲ دوسرا ایڈیشن۔

"الجواب الصحیح" کی تصنیف

یوں تو مسیحی علماء اور پادری مسلمانوں سے اکثر سوال و جواب کرتے رہتے تھے، اور علمائے اسلام ان کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے اور مذہب مسیحی کی کمزوریاں ظاہر کرتے رہتے تھے، لیکن امام ابن تیمیہ کے لئے اس موضوع کی طرف خصوصی توجہ کرنے کا خاص سبب یہ پیش آیا کہ قبرص (سائپرس) سے عیسائیوں کی ایک نئی مناظرانہ تصنیف ملک شام پہونچی جس میں عقلی اور نقلی حیثیت سے مسیحیت کا اثبات کیا گیا تھا، اور مسیحی عقائد کو عقلاً و نقلاً ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کتاب میں پوری قوت کے ساتھ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی نہیں، آپ صرف عربوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، اور مسیحی آپ پر ایمان لانے کے لئے مکلّف نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب نے شام کے علمی اور دینی حلقہ میں کافی اہمیت اختیار کر لی تھی۔

اس کتاب کا جواب دینے کے لئے وہی شخص موزوں تھا جو ایک طرف فلسفہ اور علم کلام اور عقائد و فرق پر بڑی وسیع اور گہری نظر رکھتا ہو، دوسری طرف عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے صحیفوں (بائبل) پر اس کو پورا عبور اور مسیحیت کی تاریخ پر اطلاع ہو، اس لحاظ سے اس عصر میں امام ابن تیمیہؒ سے زیادہ کوئی اس کام کا اہل نہ تھا، انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، اور "الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح" کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی، جو نہ صرف اس موضوع پر بلکہ خود امام ابن تیمیہ کی تصنیفات میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے[1]، اس کتاب سے ان کی وسعتِ نظر مطالعہ کے تنوع، مذاہب و ادیان کی تاریخ سے گہری واقفیت اور صحفِ سابقہ پر وسیع نظر کا اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب میں انھوں نے صرف مدافعت اور صفائی پیش کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ مسیحیت کی بنیادوں پر بھی حملہ کیا ہے، نبوتِ محمدیؐ کے ثابت کرنے کے لئے انھوں نے

---

[1] اس کتاب کے مجموعی صفحات ۱۳۹۵ ہیں، ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں شیخ فرج اللہ زکی کردی اور شیخ مصطفےٰ قبانی دمشقی کے اہتمام میں مصر میں شائع ہوئی۔

وہی قدیم اور اصطلاحی دلائل نہیں پیش کئے ہیں، جو علمِ کلام اور مناظرۂ فرق کی کتابوں کا قدیم شعار ہے بلکہ ایسے نئے وجوہ و دلائل پیش کئے ہیں، جو زیادہ دل نشین اور ایمان آفریں ہیں، ایک منصف مزاج اور معقولیت پسند انسان کو تسلیم و اعتراف پر مجبور کر دیتے ہیں، پھر اس کتاب میں مسیحیت کی تاریخ، مسیحی علم کلام، اور مسیحی علماء کی موشگافیوں اور تاویلات کا اتنا مواد نیز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارتوں اور آپ کے دلائل نبوت اور آپ کی پیشین گوئیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ پیش کر دیا ہے، جو تنہا کسی ایک کتاب میں دستیاب نہیں ہو سکتا اور جس کے لئے بہت بڑا کتب خانہ کھنگالنے کی ضرورت ہوگی، ہمیں مشہور مصری فاضل شیخ محمد ابوزہرہ کی اس رائے سے بالکل اتفاق ہے:۔

وان ھٰذا الکتاب أھدأ ماکتبہ ابن تیمیۃ	امام ابن تیمیہ کی مناظرانہ تصنیفات میں یہ کتاب سب سے
فی الجدال، وھو وحدہٗ جدیربان یکتب	زیادہ ٹھنڈی اور پرسکون ہے، یہ کتاب تنہا ان کو
ابن تیمیۃ فی سجلّ العلماء العاملین و الأئمۃ	باعمل علماء، مجاہد ائمہ، اور غیر فانی مفکرین کا مرتبہ
المجاھدین والمفکرین الخالدین[1]۔	دلانے کے لئے کافی ہے۔

پیشِ نظر مضمون میں اس کتاب پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہے، اور اقتباسات کی مدد سے اس کا ایک ایسا خلاصہ پیش کرنا ہے، جس سے ان کا نقطۂ نظر اور اس کتاب کی روح سامنے آجائے۔

مسیحیت حضرت مسیح کی تعلیم اور رومی بت پرستی کا مجموعہ ہے

جن مسلمان علماء و مصنفین نے مسیحیت کی تردید و تنقید پر قلم اٹھایا، ان میں سے اکثر خود مسیحیت کی تاریخ سے ناواقف تھے، انھوں نے مسیحیت کو حضرت مسیح کے اقوال و حالات کا مجموعہ سمجھ کر اور ایک آسمانی مذہب کا درجہ دے کر بحث کی اور اس طرح اس کو ایسا اعزاز بخشا جس کی وہ مستحق نہیں تھی، امام ابن تیمیہ

---

[1] ابن تیمیہ، ص ۵۱۹

چونکہ مسیحیت کی تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقاء و تغیرات پر نظر رکھتے ہیں، اس لئے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ ان کے زمانہ کی مسیحیت حضرت مسیح کی تعلیمات اور یونانیوں اور رومیوں کے مشرکانہ عقائد اور رسوم اور علم الاصنام (دیومالا) کا ایک معجون مرکّب ہے، اس لئے وہ عام ناقدین کی اس تاریخی غلطی کا شکار نہیں ہوتے، اور پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ موجودہ مسیحیت کی تنقید کا فرض انجام دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"رومی اور یونانی وغیرہ مشرک و بت پرست تھے، وہ ہیاکل علوی اور اصنام ارضی کی پرستش کرتے تھے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے سفراء و مبلغین کو ان کی طرف امر الٰہی کی دعوت دینے کے لئے بھیجا، ان میں سے بعض آپ کی زندگی میں ان ملکوں میں گئے، اور بعض آپ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد، انھوں نے ان کو اللہ کے دین کی دعوت دی، کچھ لوگوں نے اللہ کے دین کو قبول کیا، اور ایک مدّت تک اس پر قائم رہے، پھر شیطان نے ان میں سے کچھ لوگوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ وہ حضرت مسیح کے دین کو بدل دیں، انھوں نے ایک ایسا دین ایجاد کیا جو حضرت مسیح علیہ السلام کے دین اور مشرکین کے دین کا مجموعہ تھا۔"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"عیسائیوں نے دو دینوں کو ملا کر ایک دین بنایا، ایک انبیاء موحدین کا دین، ایک مشرکین کا دین، ان کے دین میں ایک حصّہ تو انبیاء کی تعلیمات کا ہے، اور ایک حصہ ان نئے اقوال و افعال کا ہے جو انھوں نے مشرکین کے دین میں سے لے کر شامل کئے ہیں، اس طرح سے انھوں نے اقانیم کے الفاظ ایجاد کئے جن کا انبیاء علیہم السلام کے کلام میں کہیں پتہ نہیں چلتا، اسی طرح سے انھوں نے مجسّم اور سایہ دار بتوں کی جگہ پر وہ بت ایجاد کئے جن کا سایہ نہیں، اسی طرح آفتاب، چاند اور کواکب کی طرف نماز پڑھنے، موسم بہار میں روزہ رکھنے کو دین میں داخل کیا، تاکہ دین شرعی اور امر طبعی دونوں کو وہ جمع کر لیں۔"[2]

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص ۱۱۹۔۱۲۰ [2] ایضاً۔ جلد ۳ ص ۱۹۹

موجودہ مسیحیت عہد قسطنطین کی تصنیف ہے

وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر یہ کہتے ہیں کہ مسیحیت کی ابتدائی تحریف و تبدیلی کے علاوہ جو مسیحیت کے ابتدائی عہد اور پال (پولس) کے زمانہ میں ہو گئی تھی، دوسری بڑی تحریف اور تبدیلی قسطنطین کے زمانہ میں ہوئی، جو چوتھی صدی مسیحی کا مشہور رومی بادشاہ ہے اور جو پہلی مسیحی سلطنت کا بانی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"عیسائیوں کے عقائد اور شریعت و احکام، ان کے علماء و اکابر برابر تصنیف کرتے رہے جیسے کہ بادشاہ قسطنطین کے زمانہ میں ۳۱۸ آدمیوں نے وہ عیسائی محضر تیار کیا جس پر مختلف مسیحی فرقوں نے اتفاق کیا اور اریوسی وغیرہ جو اس کے مخالف تھے ان پر لعنت کی، اس محضر میں وہ مسائل ہیں جن کا کسی آسمانی کتاب میں نشان نہیں ملتا، بلکہ تمام آسمانی کتابوں کی تعلیمات کے مخالف اور عقل صریح کے معارض ہیں۔"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"اس مذہبی سمجھوتے میں انھوں نے حضرت مسیحؑ اور انبیاء کی پیروی نہیں کی، بلکہ ایک نیا عقائد نامہ تیار کیا جس کا انبیاء علیہم السلام کے کلام میں کوئی سراغ نہیں ملتا، انبیاء علیہم السلام کے کلام نیز حضرت مسیح اور دوسرے انبیاء کے کلام میں، کہیں اللہ کے اقانیم کا ذکر نہیں، نہ تین کا نہ زیادہ کا، نہ کہیں صفات ثلاثہ کا ثبوت ہے، نہ کہیں کسی صفت الٰہی کو ابن اللہ یا رب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ اللہ کی حیات کو روح کہا گیا ہے، اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا ایک فرزند ہے جو الٰہ حق ہے اور الٰہ حق سے وجود میں آیا ہے، وہ اپنے باپ کے جوہر سے ہے اور وہ بھی اسی طرح خالق ہے جیسے کہ اللہ خالق ہے، اسی طرح سے اور وہ دوسرے اقوال جو مختلف اقسام کفر پر مشتمل ہیں، اس طرح کے اقوال کسی نبی سے بھی منقول نہیں۔"[2]

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص ۱۸۰   [2] ایضاً۔ حصہ سوم ص ۱۳۴

اناجیل کی صحیح حیثیت

بعض علمائے اسلام سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ انھوں نے انجیل کو قرآن مجید اور دوسرے صحفِ سماوی کے درجہ میں رکھ کر بحث کی ہے، اور عیسائی علماء و مبلغین کے دعوے اور شہرت عام سے متاثر ہو کر یہ تسلیم کر لیا کہ وہ بھی اسی طرح کی ایک آسمانی کتاب ہے، جیسے کہ دوسری آسمانی کتابیں، یہ ایک بنیادی غلطی تھی جو محض عہدِ جدید کی تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، امام ابن تیمیہ انجیل کو وہی مقام دیتے ہیں جس کی وہ مستحق ہے، ان کے نزدیک انجیل کے ان چار صحیفوں کی حیثیت سیرت اور حدیث کی عام کتابوں سے کسی طرح زائد نہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"ان اناجیل اربعہ میں بعض راویوں نے کچھ حضرت مسیح کے اقوال اور کچھ ان کے افعال و معجزات نقل کئے ہیں، انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح سے جو کچھ سنا اور دیکھا سب نقل نہیں کیا، پس جیسے محدثین اور اصحاب سیر و مغازی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال نقل کرتے ہیں اور کوئی ان کو قرآن کا درجہ نہیں دیتا، اسی طرح سے ان راویوں نے حضرت مسیح کے اقوال و افعال نقل کئے ہیں، اور اور ان کی حیثیت بھی وہی ہے، جو ہمارے یہاں سیرت اور حدیث کی کتابوں کی ہے"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"آج جو انجیل عیسائیوں کے ہاتھوں میں ہے، اس کے متعلق ان کو خود اعتراف ہے کہ وہ نہ حضرت مسیح کی لکھی ہوئی ہے، نہ ان کی لکھوائی ہوئی ہے، حضرت مسیح کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد متی اور یوحنا نے (جو حضرت مسیح کے حواری تھے، اور ان کو آپ کی صحبت حاصل ہوئی) اور مرقس اور لوقا نے (جنھوں نے حضرت مسیح کو نہیں دیکھا) لکھوایا، اس کو اتنے آدمیوں نے یاد نہیں کیا، جو تواتر کی حد تک پہنچ جائے، ان چاروں مصنفین کا بھی یہ بیان ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح کے اقوال و حالات کا

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم صفحہ ۱۰

کچھ حصہ نقل کیا ہے، انھوں نے پورے اقوال و افعال کا استیعاب بھی نہیں کیا، دو تین چار کے نقل کرنے میں غلطی کی گنجائش ہے خصوصیت کے ساتھ اس لئے اور بھی کہ خود حضرت مسیح کے بارے میں ان کو غلطی ہوئی، اور یہ بات مشتبہ ہوگئی کہ کون مصلوب ہے[1]"

وہ نہ صرف انجیل بلکہ تورات کے متعلق بھی لکھتے ہیں :-

"تورات کی نقل و روایت میں بھی انقطاع واقع ہوا جب بیت المقدس ویران کیا گیا اور بنی اسرائیل وہاں سے جلاوطن کئے گئے، یہودیوں کی روایت ہے کہ اس کے بعد ایک شخص نے تورات قلمبند کروائی جس کا نام عاذر بتلاتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ نبی تھے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ نبی نہیں تھے، ان کا بیان ہے کہ اس نسخہ کا ایک دوسرے پرانے نسخہ سے مقابلہ کیا گیا، ایک روایت یہ ہے کہ ایک نسخہ جو مغرب میں تھا لایا گیا، اس سے مقابلہ ہوا، اس سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے الفاظ متواتر نہیں ہیں، اور ان میں بعض مقامات میں غلطی کا وقوع ناممکن نہیں، جیسے ان تمام کتابوں میں پیش آتا ہے جس کو دو چار آدمی نقل کرتے ہیں، اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور حفظ کرتے ہیں[2]"

آخر میں وہ نتیجہ نکالتے ہیں :-

"عیسائیوں کے پاس ان انجیلوں کے الفاظ کی حضرت مسیح سے کوئی متواتر روایت نہیں اور نہ احکام و عقائد کی کوئی متواتر نقل ہے، جن پر وہ قائم ہیں، نہ یہودیوں کے پاس توراۃ کے الفاظ اور انبیاء کی پیشین گوئیوں کی کوئی متواتر نقل ہے، جیسی مسلمانوں کے یہاں قرآن اور احکامِ شرلعیت کی متواتر نقل موجود ہے، جو عوام و خواص سب کو معلوم ہے[3]"

وہ قرآن مجید اور تورات و انجیل کا فرق دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"قرآن مجید کے الفاظ و معانی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلے آرہے ہیں، اور ان پر

---

[1] الجواب الصحیح۔ حصہ اول ص۳۶۸-۳۶۹ [2] ایضاً ص۳۶۸ [3] ایضاً ص۳۷۲

اجماع ہے، اسی طرح سے سنت متواترہ، اسی طرح مسلمانوں کے پاس اپنے نبیؐ کے بہت سے حالات اور واقعات ہیں، جن کا صحیح ہونا مختلف طریقوں سے معلوم ہے مثلاً امت کی تصدیق، عادات کی دلالت وغیرہ، یہ قرآن مجید مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے، اس کا حفظ کسی لکھی ہوئی کتاب پر موقوف نہیں، اگر مصاحف خدانخواستہ دنیا سے ناپید ہوجائیں تو اس سے ان کے حفظ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، بخلاف اہلِ کتاب کے کہ اگر بائبل کے نسخے معدوم ہوجائیں تو ان کے پاس اس کے الفاظ کی کوئی متواتر نقل نہیں ہے، اس لئے کہ کتابوں کے معدودے چند حافظ ہیں، جن کے حفظ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے عہدِ نبوّت کے بعد ان کتابوں میں برابر تبدیلی (معنوی یا لفظی) واقع ہوتی رہی، اور اسی لئے ان میں اس سند کا رواج نہیں جس کا مسلمانوں میں رواج ہے، اور نہ جرح وتعدیل اور اسماء الرّجال کا وہ علم ہے، جو مسلمانوں کے پاس موجود ہے[1]"

اناجیل میں تحریف

امام ابن تیمیہ کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ وہ تورات وانجیل میں تحریف لفظی کے قائل نہیں، لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے اس کی تردید ہوتی ہے، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ اس پر بار بار زور دیتے ہیں کہ تحریف معنوی پر اتفاق ہے اور چونکہ ان کے نزدیک علمائے یہود و نصاریٰ بھی اس کے قائل ہیں کہ تحریف معنوی ہوئی ہے، اس لئے وہ اس سے زیادہ استدلال کرتے ہیں، اور علمائے یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں اس کو پیش کرتے ہیں، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

واذا عرف ان جمیع الطوائف من المسلمین	جب یہ بات مسلّم ہے کہ مسلمان یہود اور عیسائی سب
والیھود والنصاریٰ یشھدون انہ قد وقع	اس بات کے قائل ہیں کہ ان کتابوں (توراۃ وانجیل)

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم ص۱۲-۱۳

فی ھٰذہ الکتب تحریف وتبدیل فی معانیھا وتفاسیرھا وشرائعھا فھٰذا القدر کافٍ۔[1]

کے معانی وتفسیر واحکام میں تحریف واقع ہوئی ہے تو اتنی بات بھی کافی ہے۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

ولٰکن علماء المسلمین وعلماء اھل الکتاب متفقون علیٰ وقوع التحریف فی المعانی والتفسیر۔[2]

مسلمان علماء اور علمائے اہلِ کتاب اس بات پر متفق ہیں کہ توراۃ وانجیل کے معانی وتفسیر میں تحریف ہوئی ہے

لیکن کیا تورات وانجیل کے الفاظ میں بھی تحریف ہوئی ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں ان کو اس سے تو اتفاق نہیں ہے کہ یہ کتابیں سرتاپا محرّف ہوگئی ہیں، اور ان میں کہیں بھی اصل الفاظ نہیں ہیں، لکھتے ہیں کہ "اس قول کی نسبت مسلمانوں کی طرف صحیح نہیں کہ ان کتابوں کے تمام الفاظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تمام زبانوں میں بدل دیئے گئے ہیں" وہ کہتے ہیں کہ "میرے علم میں علمائے مسلمین میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہے"[3]

البتہ وہ اس کے قائل ہیں کہ ان کتابوں میں جزوی تحریف ضرور ہوئی ہے، اور بہت سے مقامات پر اس کے الفاظ بدل دیئے گئے ہیں، وہ اسی کو جمہور کا مسلک بتلاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :۔

فجمھور المسلمین یمنعون ھٰذا ویقولون انّ بعض الفاظھا بُدّل کما قد بدّل کثیر من معانیھا۔[4]

جمہور کو اس بات سے انکار ہے (کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے توراۃ وانجیل کے تمام الفاظ کی تصدیق کی ہے) اور ان کا مسلک ہے کہ ان کتابوں کے بعض الفاظ تو ضرور بدل دیئے گئے ہیں جیسے کہ اس کے بہت سے مطالب اور تشریحات بدل دی گئی ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

والصواب الذی علیہ الجمھور انہٗ

صحیح مسلک جس پر جمہور ہیں وہ یہ کہ ان کتابوں کے

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص۳۷۶ [2] ایضاً ص۳۸۰ [3] ایضاً ص۳۷۳ [4] ایضاً

بدّل بعض الفاظها[1]	بعض الفاظ میں ضرور تبدیلی ہوئی ہے۔

نصاریٰ الفاظِ انبیاء کو سمجھے نہیں

وہ لکھتے ہیں کہ عیسائیوں کی گمراہی اور عقیدۂ تثلیث اور مشرکانہ خیالات کا بڑا سبب اور فساد کا سرچشمہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے انبیاء علیہم السّلام کے بہت سے الفاظ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا، اور بہت سے الفاظ کے مفہوم کی تحریف کردی، وہ کہتے ہیں اس لحاظ سے یہودیوں کو عیسائیوں پر کسی درجہ میں فوقیت حاصل ہے اگرچہ وہ ضد تکبّر اور انکار حق میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی زبان اور الفاظ سے اتنے ناآشنا نہیں ہیں[2]۔

وہ اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ ان آسمانی کتابوں کے سمجھنے اور ان سے صحیح طور پر تعلیم کو اخذ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کی زبان اور اصطلاحات کا سمجھنا بہت ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

انّ معرفۃ اللغۃ الّتی خاطبنا بھا الانبیاء	اس زبان کا سمجھنا جس میں انبیاء علیہم السلام نے
وحمل کلامھم علیھا امر واجب متعین	ہم سے خطاب کیا اور ان کے الفاظ کا وہی مطلب لینا
ومن سلک غیر ھٰذا المسلک فقد	جو ان کی مراد تھی ضروری اور یقینی چیز ہے، جو اس کے
حرف کلامھم عن مواضعہ وکذب	علاوہ دوسرا راستہ اختیار کرے گا وہ ان کے کلام کو
علیھم وافتریٰ[3]۔	اصل مفہوم سے ہٹادے گا، اور ان پر جھوٹ باندھنے
	اور افتراپردازی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔

اسی زبان اور اصطلاحات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ابن اور روح القدس کے معنی غلط سمجھ لئے گئے اور تثلیث کا عقیدہ پیدا ہوگیا۔

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم صہ؟ [2] ایضاً صہ ۱۰۹ [3] ایضاً حصہ سوم صہ ۱۸۱

الفاظ کے صحیح معنی

وہ لکھتے ہیں :۔

"اہل کتاب نے انبیاء علیہم السلام سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اب (باپ) اور ابن (فرزند) کے الفاظ استعمال کئے، ان کی خود مراد اب سے رب اور ابن سے منتخب اور محبوب تھی، کسی نے بھی ان سے یہ نقل نہیں کیا کہ انھوں نے صفات الٰہی میں سے کسی صفت کو لفظ ابن سے تعبیر کیا ہو اور نہ اللہ تعالےٰ کی صفت کے متعلق یہ کہا ہو کہ اس کا اس سے تولّد ہوا، یا وہ اس کی مولود ہے، پس اگر حضرت مسیحؑ کے کلام میں یہ آتا ہے کہ لوگوں کو باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو تو لفظ ابن کی یہ تفسیر کرنا کہ وہ اللہ تعالےٰ کی ایک قدیم اور ازلی صفت ہے، حضرت مسیح پر محض افترا ہے اس لئے کہ ان کی زبان میں ابن سے مراد اللہ تعالےٰ کی قدیم ازلی صفت نہیں تھی، اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کے کلام میں اللہ تعالےٰ کی صفت حیات کو روح القدس کے لفظ سے کبھی تعبیر نہیں کیا گیا، ان کی زبان اور اصطلاح میں روح القدس سے مراد وہ ہستی یا شئ تھی جس کو اللہ تعالےٰ انبیاء اور صالحین پر نازل فرماتا تھا، اور اس سے ان کی تائید فرماتا تھا۔"[1]

دوسری جگہ عیسائیوں کو خطاب کر کے لکھتے ہیں :۔

"تمہاری گمراہی کا سبب یہ ہے کہ تم نے انبیاء علیہم السلام کے صریح اور واضح کلام کو چھوڑ کر وہ تاویلیں اختیار کیں جن پر انبیاء علیہم السلام کا کلام نصًّا اور ظاہرًا دلالت نہیں کرتا، تم نے محکم کو چھوڑ دیا، اور فتنہ اور تاویل کی جستجو میں متشابہ کی پیروی کی، اگر تم اس کلام کے ظاہر کو پکڑے رہتے تو گمراہ نہ ہوتے، اس لئے کہ ابن کا لفظ جہاں انبیاء علیہم السلام کے کلام میں آتا ہے وہاں اس سے کوئی صفت مراد نہیں ہوتی بلکہ اللہ کا دوست اور اس کا محبوب مراد ہوتا ہے، روح القدس

---

[1] الجواب الصحیح حصہ سوم ص۱۸۱-۱۸۲

سے بھی کوئی صفت مراد نہیں ہوتی، بلکہ وحی اور فرشتہ مراد ہوتا ہے تم نے ظاہر لفظ اور اس کے مفہوم کو چھوڑ کر ایسے معنی مراد لیئے، جن پر لفظ مطلقاً دلالت نہیں کرتے"۔[۱]

الفاظ "ابن" اور "روح القدس" مشترک اور عام ہیں

پھر وہ توراۃ و انجیل کی عبارتوں اور نصوص سے ثابت کرتے ہیں کہ ابن اور روح القدس کے الفاظ حضرت مسیح کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بکثرت دوسروں کے لئے استعمال ہوئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"ابن اور روح القدس کے الفاظ حضرت مسیح کے علاوہ دوسروں کے حق میں خود تمہارے نزدیک آئے ہیں، تم خود بیان کرتے ہو کہ حواریوں نے کہا کہ حضرت مسیح نے ان سے فرمایا بیشک اللہ میرا اور تمہارا باپ ہے، اور میرا اور تمہارا معبود ہے، وہ خود کہتے ہیں کہ روح القدس ان میں حلول کرتا ہے، تمہارے پاس جو تورات ہے اس کے اندر یہ عبادت موجود ہے کہ رب نے حضرت موسیٰ سے کہا فرعون کی طرف جا، اور اس سے کہہ "رب کہتا ہے اسرائیل میرا پلوٹھی کا لڑکا ہے، اس کو چھوڑ دے تاکہ وہ میری عبادت کرے، اگر تو نے میرے پلوٹھی کے بیٹے کو چھوڑنا منظور نہ کیا تو میں تیرے پلوٹھی کے بیٹے کو قتل کر دوں گا جب فرعون نے بنی اسرائیل کو نہ چھوڑا تو جیسے خدا نے کہا تھا تو خدا نے فرعون کے اور فرعون کی قوم کے پلوٹھی کے بیٹوں کو قتل کر دیا، اس فرعون کے بیٹے سے لے کر جو تخت پر بیٹھا تھا، دوسرے آدمیوں اور ان کے جانوروں کے پلوٹھی کے بیٹوں تک" تو یہ تورات تمام بنی اسرائیل کو اللہ کے بیٹے اور اس کی پلوٹھی کی اولاد کہہ رہی ہے، اور اہلِ مصر کے بیٹوں کو فرعون کے بیٹے بتلا رہی ہے اور اس سے بھی زیادہ وسعت سے کام لیتی ہے، اور جانوروں کے بچوں کو جانوروں کے مالک کا بچہ کہتی ہے اسی طرح سے مزامیر داؤد میں ہے تو میرا بیٹا ہے تو مجھ سے سوال کر میں دوں گا، انجیل میں حضرت مسیح کا یہ قول نقل

---

[۱] الجواب الصحیح حصہ سوم ص۱۵۵

کیا گیا ہے، میں اپنے اور تمہارے باپ اور اپنے اور تمہارے معبود کے پاس جانے والا ہوں اور انھوں نے فرمایا جب تم دعا کرو تو کہو اے ہمارے باپ جو آسمان میں ہے، قدوس تیرا نام ہے، ہمیں فلاں فلاں نعمتیں عطا کر، اسی طرح روح القدس کے حلول کرنے کا تذکرہ صرف حضرت مسیح ہی کے بارے میں نہیں آتا بلکہ اور انسانوں کے بارے میں بھی آتا ہے[1]"

غرض انھوں نے مدلّل طریقہ پر ثابت کیا ہے کہ جن الفاظ سے نصاریٰ حضرت مسیح کی ابنیت، حلول واتحاد اور الوہیّت کے لئے استدلال کرتے ہیں، وہ الفاظ تورات وانجیل میں بکرّات ومرّات غیر مسیح کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، اور وہ سب کنایات، مجازات ومحاورات ہیں[2]، آخر میں وہ نتیجہ نکالتے ہیں:-

"خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ پیشین گوئیوں اور تورات وانجیل وزبور جیسی آسمانی کتابوں اور دوسرے انبیاء کی پیشین گوئیوں میں کوئی بات ایسی نہیں کی گئی ہے جس سے حضرت مسیحؑ کے متعلق خصوصیت سے یہ ثابت ہو کہ ان کو الوہیت کا اتحاد وحلول حاصل تھا، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے، ان کی خصوصیت بس اتنی ہی بیان کی گئی ہے جتنی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس آیت میں بیان کردی ہے "اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ" واقعہ یہ ہے کہ انبیاء کے صحفِ سابقہ اور تمام پیشین گوئیاں اس کے بالکل مطابق ہیں جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی، اور ان میں سے ایک سے دوسرے کی تصدیق ہوتی ہے، عیسائی باقی جن الفاظ سے حضرت مسیح کی الوہیت پر استدلال کرتے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کے اقوال سے ثابت کرتے ہیں، یہ تمام الفاظ وکلمات حضرت مسیح کے علاوہ دوسروں کے متعلق بھی آئے ہیں تو حضرت مسیح کو الوہیت کے ساتھ مخصوص کرنا بے اصل بات ہے، مثلاً ابن مسیح، روح القدس کا آپ میں حلول کر جانا یا آپ کو الٰہ کے لفظ سے یاد کرنا، یا آپ کے اندر رب کا ظہور یا حلول کرنا، یا ساکن ہونا یا اس کی جگہ پر ساکن ہونا،

---

[1] الجواب الصحیح حصہ سوم ص۱۸۶،۱۸۵ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الجواب الصحیح حصہ دوم ص۱۱۹-۱۳۲

یہ سب الفاظ دوسروں کے لئے بھی موجود ہیں، اور اس سے وہ الٰہ ثابت نہیں ہوتے"۔[۱]

مسیحی کبھی ان منقولات سے ہٹ کر اقانیم و حلول و اتحاد پر عقلی بحث کرتے ہیں، اور اس کو ایک فلسفیانہ یا متصوفانہ بحث بنا دیتے ہیں، امام ابن تیمیہ نے اس پر خالص اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے، چونکہ یہ ان کا خاص موضوع ہے، اور علم کلام و عقائد اور وحدۃ الوجود کے سلسلہ میں وہ اس پر بار بار بحث کر چکے ہیں، اس لئے وہ دل کھول کر اس پر بحث کرتے ہیں، اور ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ بالکل خلافِ عقل باتیں ہیں، اور ایک خود ساختہ فلسفہ ہے، جس کا حقائق و معقولات سے کوئی تعلق نہیں[۲]۔

منافیٔ عقل باتیں

جب عقلی حیثیت سے عیسائیوں پر گرفت کی جاتی ہے، اور ثابت کیا جاتا ہے کہ تثلیث کا عقیدہ بالکل خلافِ عقل اور ناقابلِ فہم عقیدہ ہے، اور عام انسانی عقل اس کی تائید نہیں کرتی تو وہ پھر منقولات کی طرف پناہ لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کیا کیا جائے آسمانی کتابوں میں اسی طرح سے آیا ہے، اور یہ امور و عقائد عقل و قیاس سے بالاتر حقیقتیں ہیں، جن میں ایمان و تقلید ہی سے کام لینا پڑتا ہے، اس کو عقلی حیثیت سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، امام ابن تیمیہ اول تو اسی بات سے انکار کرتے ہیں کہ یہ عقائد و تعلیمات آسمانی کتابوں میں آئی ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں ان کے خلاف تعلیمات ہیں، پھر وہ کہتے ہیں کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک وہ جو عقلی حیثیت سے محال اور باطل ہے، اور سب جانتے ہیں کہ وہ چیزیں ناممکن ہیں، اور ایک وہ جس سے عقل قاصر ہے، وہ اس کی حقیقت کو پہچان نہیں سکتی، اور اس میں نفیاً و اثباتاً کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتی، وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور کلام میں صرف دوسری قسم پائی جاتی ہے، گویا ان کے کلام میں مخالفِ عقل چیزیں نہیں ہیں، ماورائے عقل

---

[۱] الجواب الصحیح حصہ دوم ص ۱۸۹-۱۹۰ [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الجواب الصحیح حصہ سوم ص ۱۱۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۱۵

چیزیں ہیں، اور مخالف عقل اور ماورائے عقل میں بڑا فرق ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

لایمیزون بین مایحیله العقل ویبطله	یہ عیسائی علماء ان چیزوں میں جن کو عقل محال بتلاتی
ویعلم انه ممتنع وبین مایعجز عنه العقل	ہے اور باطل ٹھہراتی ہے اور یقین سے معلوم ہے کہ وہ
فلا یعرفه ولا یعلم فیه بنفی ولا اثبات	ممتنع ہیں، اور ان چیزوں میں جن کے بارے میں عقل
وان الرسل اخبرت بالنوع الثانی ولا	عاجز ہے، وہ اس کی حقیقت نہیں معلوم کر سکتی، اور
یجوز ان تخبر بالنوع الاول فلم یفرقوا	نفی و اثبات کا فیصلہ نہیں کر سکتی، کچھ فرق نہیں کرتے
بین محالات العقول ومحارات العقول	حالانکہ انبیاء نے صرف دوسری قسم کی اطلاع دی ہے
وقد ضاهوا فی ذلک من قبلهم من	پہلی قسم کی اطلاع ان کے کلام میں ممکن نہیں، یہ درمیان
المشرکین الذین جعلوا الله ولدًا و	علم محالات ہیں، اور ان مسائل و حقائق میں جن میں
شریکا۔[1]	عقل سرگرداں و حیران رہتی ہے، تمیز نہیں کر سکے،
	انھوں نے اس بارہ میں مشرکین کا مقابلہ کیا ہے،
	جنھوں نے اللہ کے لئے بیٹا اور شریک ٹھہرایا۔

وہ بڑے شدّ و مد سے ثابت کرتے ہیں، اور ان کی تمام کتابیں اس بیان سے بھری ہوئی ہیں کہ دینِ صحیح عقلِ صریح کے خلاف نہیں ہوتا، وہ کہتے ہیں اس مقام پر دو جماعتوں نے ٹھوکر کھائی ہے، بعض لوگوں نے معقولات میں ایسا غلو کیا کہ جو معقول نہیں تھا، اس کو بھی معقول بنا دیا، اور اس کو حسیّات اور انبیاء کے نصوص پر ترجیح دی، ایک گروہ نے یہ بے اعتدالی کی کہ صریح معقولات کو رد کر دیا، اور اپنے خیالی سمعیات اور حسیّات کو ان پر مقدم رکھا، یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ایک حق دوسرے حق کا مخالف اور مکذّب نہیں ہوتا، بلکہ ان میں سے ایک کی دوسرے سے تصدیق ہوتی ہے، بخلاف باطل کے کہ وہ مختلف

---

[1] الجواب الصحیح حصہ دوم ص ۸۹

اور متناقض ہوتا ہے' اللہ تعالےٰ مخالفین انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے :۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ	آسمان جالی دار کی قسم ہے البتہ تم بیچیدہ باتیں
مُّخْتَلِفٍ ۝ یُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝	پڑے ہوئے ہو قرآن سے وہی روکا جاتا ہے'
(الذّاریات۔ ۷' ۸' ۹)	جو ازل سے گمراہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جو چیز عقل صریح سے ثابت ہو جائے' اس کی مخالف نہ تو خبر صحیح ہوتی ہے' نہ حسّ صحیح اور جو چیز نقل صحیح سے ثابت ہو جائے' اس کی معارض نہ عقل ہوتی ہے' نہ حسّ' اسی طرح جو چیز حسّ صحیح سے معلوم ہو جائے اس کے مناقض نہ خبر ہوتی ہے نہ معقول[۱]۔

اور یہی عیسائیت اور اسلام کا فرق ہے کہ اسلام میں عقل و نقل کی پوری مطابقت ہے' اس میں حقائق غیبیہ ضرور ہیں جو ماورائے عقل ہیں لیکن مخالف عقل نہیں' بخلاف مسیحیت کے جس میں بہت سے مسائل اور عقائد مخالف عقل ہیں' اور بہت سے مسیحی علماء بھی ان کو مخالفِ عقل مانتے ہیں' لیکن کہتے ہیں کہ یہ مرتبۂ عقل کے بعد کی چیزیں ہیں' اور ان کو آنکھ بند کر کے ماننا ہی پڑے گا۔

توحید اور حضرت مسیحؑ کی عبدیت کے قائل مسیحی علماء

اس کتاب میں امام ابن تیمیہ نے ایک بڑا مفید کام یہ کر دیا ہے کہ ان علمائے مسیحیت اور پیشوایان مذاہب کے اقوال اور ان کا کلام نقل کر دیا ہے' جو توحید اور حضرت مسیحؑ کی عبدیت کے قائل تھے' لیکن ان کو مختلف اسباب کی بنا پر مسیحی دنیا میں قبول عام حاصل نہ ہو سکا' اس سلسلہ میں انھوں نے فرق نصاریٰ کی تفصیل اور غالب مذہب کا تذکرہ اور اس کی تشریح کی ہے' جس سے ان کی گہری واقفیت' وسیع مطالعہ اور باریک بینی کا اظہار ہوتا ہے' اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک نو مسلم عالم حسن بن الیوب کا ایک طویل رسالہ نقل کر دیا ہے'

---

[۱] الجواب الصحیح حصہ سوم ص ۱۲۶

جس میں اس نے اپنے اسلام قبول کرنے کے اسباب اور دین اسلام کی ترجیح کے دلائل تفصیل سے نقل کئے ہیں، یہ رسالہ گرانقدر معلومات پر مشتمل ہے[1]۔

تورات و صحف سماویہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں

اس سب سے فارغ ہو کر امام ابن تیمیہ نے وہ بشارتیں اور پیشین گوئیاں نقل کی ہیں جن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی اطلاع اور بعثت کی خبر دی گئی ہے، ان بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے تذکرے میں انھوں نے بڑے استقصاء اور استیعاب سے کام لیا ہے، اور اشعیاء نبی، حبقوق، دانیال اور حضرت مسیح کے کلام سے وہ تمام جملے اور عبارتیں نقل کر دی ہیں، جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہیں، اس سلسلہ میں جتنا مواد اس کتاب میں آگیا ہے، وہ مشکل سے کسی اور کتاب میں مل سکتا ہے، انھوں نے ان پیشین گوئیوں کی تشریح بھی کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی پر منطبق ہوتی ہیں[2]۔

ان پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی انجیل یوحنا کی پیشین گوئی ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا کہ "ان ارکون العالم سیاتی ولیس لی شئی" (ارکون کے معنی عبرانی میں عظیم الشان اور جلیل القدر کے ہیں، اور عظماء و اکابر کو ارکنہ کہتے ہیں) امام ابن تیمیہ یہ ثابت کرتے ہوئے کہ اس پیشین گوئی کا مصداق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، لکھتے ہیں:-

"تمام اہل زمین کا اس پر اتفاق ہے، اور یہ بات بالکل بدیہی اور یقینی ہے کہ حضرت مسیح کے بعد صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ایسی تھی جن کی باطنی اور ظاہری سیادت تمام عالم پر قائم ہوئی، قلوب اور اجسام ان کے فرمانبردار تھے، اور اپنی زندگی اور اپنی وفات کے بعد تمام زمانوں میں اور مشرق و مغرب کے تمام اقالیم معتدلہ میں آپ کی ظاہراً اور باطناً اطاعت کی گئی، بادشاہوں کی صرف ظاہری

---

[1] ملاحظہ ہو حصہ دوم ص۳۱۲ تا حصہ سوم ص۳ [2] حصہ سوم ص۲۶۵ تا حصہ چہارم ص۲۰

طور پر اطاعت کی جاتی ہے، اور موت کے بعد کوئی ان کی فرمانبرداری نہیں کرتا، اور اہلِ مذہب کو ان کی ایسی اطاعت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا جس سے کہ ان کو آخرت میں اجر کی امید اور سزا کا خوف ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کی یہی شان ہوتی ہے۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے انبیاء سابقین کے دین کو ظاہر کیا، ان کی تصدیق فرمائی ان کے نام کا چرچا کیا، اور ان کا مرتبہ بلند کیا، آپ ہی کی بدولت وہ بڑی قومیں حضرت موسیٰ اور مسیح وغیرہ انبیاء اور مرسلین پر ایمان لائیں کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ان پر ایمان نہ لاتیں، اہل کتاب ان میں سے جن کے نام سے آشنا بھی تھے ان کے بارے میں بھی ان کو اختلاف تھا، وہ حضرت داؤد و سلیمان وغیرہ پر اعتراض کرتے تھے، اور ان پر طعن کرتے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے پیغمبر مثلاً ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ وغیرہ ہیں جن کو جانتے بھی نہ تھے"[1]

معجزات و دلائلِ نبوت

اس سے فارغ ہونے کے بعد امام ابن تیمیہ نے معجزاتِ نبوی (جن کے متعلق ان کو اصرار ہے کہ آیات کا لفظ اصل قرآنی اصطلاح اور زیادہ صحیح تعبیر ہے) کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اپنی عادت کے موافق اس سلسلہ میں اتنا مواد جمع کر دیا ہے جو آسانی کے ساتھ ایک جگہ نہیں مل سکتا[2]، اس سلسلہ میں معجزات کی تعریف، ان کے ثبوت کا طریقہ اور بہت سے اصولی اور کلامی مباحث اور لطیف نکتے آ گئے ہیں۔

ان معجزات و آیات کے بارے میں امام ابن تیمیہ نے صرف ان ہی مشہور و معروف معجزات پر اکتفا نہیں کیا ہے، جو عام طور پر سیرت و کلام کی کتابوں میں ذکر ہوتے چلے آ رہے ہیں، بلکہ آیات و دلائل نبوت کے دائرہ کو اتنا وسیع کیا ہے کہ اس میں آپ کی پوری سیرت و شمائل کو شامل کر لیا ہے، جو نبوت کی سب سے بڑی دلیل اور

---

[1] الجواب الصحیح حصہ چہارم ص۱۶-۸۶ تا ص۹۵ و ۷۸ تا ۸۶ [2] ملاحظہ ہو حصہ چہارم ص۶۶ تا ۲۲۸

اہلِ انصاف اور اہلِ نظر کے لئے نبوتِ محمدی پر سب سے بڑی حجت اور برہان ہے گویا وہ مولانا روم سے اس بارے میں اتفاق کرتے ہیں ؎

درد لِ ہر کس کہ دانش را مزہ است
روئے و آواز پیمبر معجزہ است

اس سلسلہ میں انھوں نے سیرت و شمائل نبوی کا بہت اچھا خلاصہ پیش کر دیا ہے[1]، وہ اس دائرہ میں اور وسعت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کے اخلاق اور اقوال و افعال بھی آپ کا معجزہ ہیں، آپ کی شریعت بھی آپ کا ایک مستقل معجزہ ہے، اور آپ کی امت اور آپ کی امت کا علم اور ان کی دینداری اور زندگی بھی آپ کا ایک معجزہ ہے، اور آپ کی امت کے صالحین کی کرامات بھی آپ کا ایک معجزہ ہے[2]۔"

اسلامی انقلاب اور امتِ محمدی مستقل معجزہ ہے

پھر حیاتِ طیبہ کا ایک خلاصہ پیش کرنے کے بعد جس کو پڑھ کر یہ اذعان پیدا ہو جاتا ہے کہ آپ پیغمبر صادق مؤید من اللہ اور رسول برحق تھے، لکھتے ہیں:۔

"اسلام کی دعوت تمام سرزمین عرب پر چھا گئی وہ اس سے پیشتر بتوں کی پرستش کاہنوں کی اطلاعات، خالق کے انکار اور مخلوق کی اطاعت، خونریزی اور قطع رحمی سے معمور تھی، نہ کسی کو آخرت کا علم تھا، نہ زندگی بعد موت کا ہوش، یہ جاہل و کندۂ ناتراش آپ کی تعلیم کے فیض سے روئے زمین کے سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے دیندار، سب سے بڑے عابد اور سب سے بڑے فاضل بن گئے، عیسائیوں نے ان صحابۂ کرام کو جب شام میں دیکھا تو انھوں نے کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ مسیح کے حواری ان لوگوں سے افضل نہ تھے، یہ ان کے علم اور عمل کی

---

[1] ملاحظہ ہو حصہ چہارم ص ۸۶ تا ۹۵ و ۷۸ تا ۸۶ [2] حصہ چہارم ص ۱۷۸

یادگاریں ہیں، جو تمام دنیا میں روشن و درخشاں ہیں، ان کے مقابلہ میں دوسری قوموں کی یادگاریں، اور آثار دیکھو اہل عقل کو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے[۱]۔"

"آپ کی امت ہر فضیلت میں تمام امتوں سے زیادہ مکمل ہے اگر تمام دنیا کی قوموں کے علم کا ان کے علم سے مقابلہ کیا جائے تو ان کے علم کی برتری ثابت ہو گی، اگر ان کے دین و عبادت اور طاعتِ الٰہی کو ان کے دین و عبادت و طاعتِ الٰہی کے مقابلہ میں لایا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ دیندار ہیں، اگر شجاعت و جہاد فی سبیل اللہ، اللہ کے راستہ میں صبر علی المکارہ اور جفاکشی کو دیکھا جائے تو ان کا پلّہ بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے، اگر سخاوت و انفاق اور فراخ دلی اور بلند حوصلگی کو دیکھا جائے تو ان ہی میں زیادہ سخاوت و کرم نظر آتا ہے، یہ تمام فضائل و مکارمِ اخلاق ان مسلمانوں کو آپؐ ہی سے حاصل ہوئے، اور آپ ہی کی ذات سے انھوں نے اخذ کئے اور آپ ہی نے ان کو ان کا حکم دیا، آپ کی بعثت و نبوت سے پہلے وہ کسی کتاب کے پیرو نہ تھے، جس کی آپؐ نے تکمیل فرمائی ہوتی جیسے کہ حضرت مسیح تورات کی شریعت کی تکمیل کے لئے تشریف لائے تو حضرت مسیح کے پیروؤں کے فضائل و علوم کچھ تورات سے ماخوذ تھے، کچھ زبور سے، کچھ اور تعلیماتِ انبیاء سے، اور کچھ حضرت مسیح سے اور کچھ حصہ حواریوں کے بعد بعض دوسری تعلیموں اور فلاسفہ وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہیں، لیکن امتِ محمدی میں آپؐ سے پہلے نہ کسی کتاب کا وجود تھا، اور نہ کسی نبی کی تعلیم تھی، بلکہ ان میں سے اکثر تو موسیٰؑ عیسیٰؑ اور داؤدؑ اور تورات اور زبور پر بھی آپ ہی کے ذریعہ سے ایمان لائے آپ ہی نے ان کو تمام انبیاء پر ایمان لانے اور تمام کتبِ منزّلہ کے اقرار کا حکم دیا، اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان تفریق کرنے کی ممانعت کی[۲]۔"

شریعتِ محمدیؐ کا اعجاز

شریعت محمدی کی کاملیّت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[۱] الجواب الصحیح حصہ چہارم ص ۱۸۱ [۲] حصہ چہارم ص ۸۲

"آپ کی شریعت مکمل ترین شریعت ہے، کوئی ایسی معقول اور بھلی بات نہیں جو عقلی طور پر معقول ومستحسن ہو، اور آپ نے حکم نہ دیا ہو اور کوئی ایسی نامناسب اور قبیح بات نہیں جس کو عقل نامناسب اور قبیح سمجھتی ہو اور آپ نے اس سے نہ روکا ہو، آپ نے کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا، جس کے متعلق آج یہ کہنے کا موقع ہو کہ کاش آپ اس کا حکم نہ دیتے، اور نہ کسی ایسی چیز کی ممانعت کی کہ آج یہ کہا جاسکے کہ کاش آپ اس کی ممانعت نہ کرتے، آپ نے تمام پاکیزہ صاف ستھری چیزوں کو حلال کیا، اور ان میں سے کسی چیز کو حرام نہیں کیا، جیسا کہ بعض شریعتوں میں حرام کیا گیا تھا، اور تمام ناپاک اور گندی چیزوں کو حرام کیا، ان میں سے کسی چیز کو حلال نہیں کیا جیسے کہ بعض شریعتوں میں حلال ہوئیں، دنیا کی تمام قوموں کے پاس جتنی خوبیاں اور محاسن ہیں، اس شریعت میں وہ سب جمع ہیں، تورات وانجیل وزبور میں اور اس کے فرشتوں اور یوم آخرت کے متعلق جو اطلاعات ہیں، وہ مکمل ترین طریقہ پر قرآن میں اور آپ کی شریعت میں آگئی ہیں، اور کچھ ایسی چیزوں کی بھی اطلاع دی گئی ہے، جن کا ان کتابوں میں تذکرہ نہیں، ان کتابوں میں عدل کی ضرورت، صحیح فیصلہ، فضائل کی دعوت اور حسنات کی جو کچھ ترغیب آئی ہے، وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لائے اور اس پر اضافہ کیا، اگر کوئی عقلمند ان عبادات کے بارے میں غور کرے گا، جو اسلام میں مشروع ہیں، اور دوسری قوموں کی عبادتوں پر بھی غور کرے گا، تو اسلامی عبادات کی برتری اور فوقیت ظاہر ہوگی، یہی حال تمام حدود واحکام اور شریعت کے مسائل وقوانین کا ہے۔"[1]

اس سلسلہ میں انھوں نے عبادات کا مقصود اور اس کے بارے میں مختلف گروہوں کے مذاہب اور نقطۂ نظر کا ذکر کرنے کے بعد اسلامی عبادات کے مقاصد واسرار اور فوائد وآثار پر بڑی حکیمانہ بحث کی ہے،[2] پھر ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صدق وعدل کا نمونۂ کامل تھے، اور آپ کے خلفائے راشدین

---

[1] الجواب الصحیح حصہ چہارم ص ۸۱-۸۲ [2] ایضاً ص ۱۰۴ تا ۱۱۰

اور صحابۂ کرام نے اپنی زندگی اور حکومت و خلافت اور معاملہ و سیاست میں اس صدق و عدل کا اظہار کیا اور ایسے زہد و ورع کی زندگی گزاری جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔[1]

نبوتِ محمدیؐ کا اقرار ہر مقرِ نبوت کے لئے ضروری ہے

امام ابن تیمیہ بڑے واضح اور مدلّل طریقہ پر ثابت کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نبوت کے مفہوم سے آشنا نبوت کا قائل اور کسی ایک نبی کا بھی کلمہ گو ہے، اس کے لئے نبوتِ محمدی کا انکار ممکن نہیں، اس لئے کہ دوسرے انبیاء کی نبوت کے جو بھی دلائل اور ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں، انہی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت بطریقِ اولیٰ ثابت ہوتی ہے، اگر کوئی کہے کہ ان انبیاء کی نبوت معجزات سے ثابت ہوتی ہے، تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات کہیں زیادہ عظیم اور ایسے تواتر سے ثابت ہیں، جس تواتر سے کسی نبی کا معجزہ ثابت نہیں، اسی طرح آپ کی لائی ہوئی کتاب دوسرے صحیفوں سے زیادہ مکمل، آپ کی امت دوسرے پیغمبروں کی امتوں سے زیادہ بہتر و برتر، آپ کے دین کے احکام و قوانین فائق و اعلیٰ ہیں، درحقیقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تکذیب سے تمام نبوتوں کی تکذیب لازم آتی ہے، اور کسی ایک کا ثابت ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔[2]

وہ کہتے ہیں کہ دوسرے انبیاء کی نبوت کے ثبوت پر اصرار کرنا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی فن کے علماء کی عظمت و امامت کا اقرار کیا جائے، اور اس فن کے استاذ الاساتذہ اور امام الائمہ کا انکار کیا جائے، وہ اس کی متعدد دلچسپ مثالیں دیتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے زفر، ابن القاسم، مزنی اور اثرم[3] تو بڑے فقیہ تھے، لیکن ابوحنیفہ، شافعی، اور مالک فقیہ نہیں تھے، یا کوئی شخص کہے کہ اخفش، ابن الانباری اور مبرد[4] تو ضرور نحوی تھے لیکن خلیل، سیبویہ اور فرّاء[5] نحوی نہیں تھے، یا کہے کہ ملکی اور مسیحی وغیرہ طب کے مصنفین تو بلاشبہ اطباء تھے، لیکن

---

[1] الجواب الصحیح حصہ چہارم ص۱۱۹ [2] ایضاً حصہ اول ص۱۸۰ [3] یہ ائمہ اربعہ کے تلامذہ اور ان کی فقہ کے مرتبین ہیں [4] مشہور علمائے نحو و لغت [5] مشہور ائمۂ نحو۔

بقراط وجالینوس وغیرہ طبیب نہیں تھے، یا کہے کہ کوشیار اور خلفی تو علم ہئیت سے واقف تھے لیکن بطلیموس وغیرہ کو ہئیت کا کوئی علم نہیں تھا، یا کوئی کہے کہ داؤد وسلیمان وملیخا وعاقوص اور دانیال تو ضرور پیغمبر تھے اور محمد ابن عبد اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نبی نہیں تھے، اس شخص کا تناقض اور اس کے قول کی نامعقولیت اوپر کے تمام اقوال سے زیادہ روشن ہے، بلکہ جو شخص یہ کہے کہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام تو بیشک اللہ کے رسول، اور تورات وانجیل تو ضرور آسمانی کتابیں تھیں لیکن محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں، اور قرآن آسمانی کتاب نہیں، جو شخص محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ سے پہلے آئے ہوئے ادیان وصحف پر غور کرے گا، اور اس کو نبوتِ محمدی کے دلائل وآیات اور انبیائے سابقین کی نبوت کے دلائل وآیات اور شرع محمدی اور شرائع سابقہ پر غور کرنے کا موقع ملا ہوگا وہ اس قول کو بالکل باطل اور مہمل سمجھے گا۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامّہ

آخر میں مسیحیوں کے اس دعویٰ کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب میں سب سے پہلے جگہ دی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صرف عرب جاہلیت کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اور انہی لوگوں سے ایمان کا مطالبہ تھا، اور مسیحی آپ پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں ہیں، اور اگر وہ ایمان نہ لائیں تو ان سے کسی طرح کا مواخذہ نہیں ہوگا، یہ عقیدہ اس زمانہ کے عرب عیسائیوں اور مسیحی علماء میں بھی پایا جاتا ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی کچھ دنوں سے بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا ہے کہ ادیانِ سابقہ کی مکمل پیروی نجات کے لئے کافی ہے، نبوتِ محمدی پر ایمان لانا ایک مکمل وصادق مسیحی یا یہودی یا غیر مسلم کے لئے ضروری نہیں، چونکہ یہ عقیدہ اسلام کی دعوتِ عامّہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص۱۸۱

بعثت عامّہ پر ایک بہت بڑی ضرب ہے اور اس سے تبلیغ و دعوتِ اسلام کا دروازہ بند ہوتا ہے، اور وہ ساری جد و جہد بے معنی اور عبث ٹھہرتی ہے، جو اسلام کی دعوت و اشاعت میں کی گئی، اس لئے امام ابن تیمیہ نے اس عقیدہ کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کیا، یہ بحث کتاب کے پہلے حصہ کے صفحہ ۲۸ سے صفحہ ۲۳۰ تک پھیلی ہوئی ہے، اور اس موضوع پر علمی اور استدلالی حیثیت سے سب سے مکمل اور وسیع بحث ہے جو ایک متکلّم اور عالم کے قلم سے نکلی ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں وہ تمام آیات و نصوص قرآنی اور احادیث صحیحہ جمع کر دی ہیں، جن کو دیکھنے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی اس شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ کی بعثت صرف عرب کی طرف تھی، یا آپ کی نبوت کے اقرار کے بغیر نجات ہو سکتی ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ" (پہلے پیغمبر اپنی قوم کی طرف مخصوص بھیجے جاتے تھے، اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ا۟لَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں، جس کی آسمانوں اور زمین پر سلطنت ہے) نیز ارشاد ہے" وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا" (ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام ہی انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر) قرآن مجید کی جن آیتوں میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ مشرکین اور بُت پرستوں اور تمام انسانوں اور جنات کو دعوت دی گئی ہے، ان کا بڑی مشکل و تکلّف ہی سے شمار ہو سکتا ہے، یہ ایک بدیہی اور یقینی مسئلہ اور اسلامی عقیدہ ہے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے خود عربوں کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنے مبعوث ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے، یہ آپ کی دعوت و تبلیغ کے واقعات، یہ آپ کے سفراء اور داعیانِ اسلام کے حالات ہیں، یہ یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں سے (علاوہ مشرکین کے) جہاد کے تذکرے ہیں، اور یہ آپ کی سیرت ہمارے سامنے ہے، پھر وہ کتاب مقدس جو تواتر سے آپ سے ہم تک پہونچی ہے اس میں جا بجا اہلِ کتاب کو آپ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے"[1]

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص ۱۱۵-۱۱۶

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"ان دلائل سے کئی گنا دلائل ہیں، جو ثابت کرتے ہیں کہ آپ نے خود اس بات کی اطلاع دی کہ آپ نصاریٰ اور دوسرے اہلِ کتاب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے، اور یہ کہ آپ نے ان کو دعوت دی، ان سے جہاد کیا، اور ان کو دعوت دینے اور ان سے جہاد کرنے کا حکم دیا، اور یہ کوئی ایسا فعل نہیں جو آپ کی امت نے آپ کے بعد اپنی طرف سے کیا ہو، اور اس کی کوئی سند نہ ہو جیسے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کے بعد بہت سے نئے کام کئے، اس لئے کہ مسلمان کسی کے لئے بھی اس کو جائز نہیں قرار دیتے کہ وہ آپ کے بعد آپ کی شریعت میں تغیر کرے اور کسی حرام فعل کو حلال اور کسی حلال کو حرام بنالے، ان کے نزدیک امت میں کسی کو کسی غیر واجب اور کسی واجب کو ساقط کرنے کا اختیار نہیں، ان کے نزدیک حلال وہی ہے جس کو اللہ و رسولؐ نے حلال کیا، اور حرام وہی ہے جس کو اللہ و رسولؐ نے حرام کیا، اور دین وہی ہے جس کو اللہ و رسول نے مشروع کیا۔"[1]

ردِّ شیعیت

یوں تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں شیعیت کا جا بجا رد کیا ہے، اور سنت و عقائدِ اہلِ سنت، خلفائے راشدین و صحابۂ کرام کی طرف سے پرزور مدافعت کی ہے لیکن ردِ شیعیت میں ان کی ایک ہی مستقل اور منفرد تصنیف "منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ" ہے، اس تصنیف کی تحریک و تقریب یہ ہوئی کہ ان کے ایک معاصر شیعی عالم ابن المطہر الحلّی نے اپنے ولی نعمت اور مخدوم تاتاری بادشاہ اولجا خدا بندہ خاں کے لئے جس نے عالمِ مذکور ہی کی تبلیغ و تحریک سے مذہبِ شیعہ اختیار کیا تھا، ایک ضخیم کتاب اثباتِ شیعیت و امامت و ردِ شیعیت و خلافت میں "منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ" کے نام سے لکھی،

---

[1] الجواب الصحیح حصہ اول ص ۱۱۷-۱۱۸

یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ شام پہنچی، اور شیخ الاسلام کے مطالعہ میں بھی آئی، شیعوں کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا، وہ اس کو ناقابلِ تردید اور لاجواب تصنیف سمجھتے تھے، اس کتاب کا بڑا حصہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہلِ بیت کی امامت و عصمت کے ثبوت اور خلفائے ثلثہ کی خلافت کی تردید اور ان کے اور صحابۂ کرام کے مطاعن پر مشتمل تھی، سیدنا علیؓ اور ائمۂ اثنا عشر کے فضائل اور ان کی امامت و عصمت کو آیات و نصوص قرآنی اور احادیث و روایات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اسی طرح سے خلفائے ثلثہ و صحابۂ کرام کے مطاعن کو آیات و احادیث اور تاریخ و سیر سے ثابت کیا گیا تھا، اور مصنف نے اپنی ذہانت، قوتِ استدلال اور علمی تبحر کا پورا ثبوت دینے کی کوشش کی تھی، اور اپنے نزدیک اہلِ سنت پر اتمامِ حجت کیا تھا، مصنف چونکہ عام متاخرین شیعہ کی طرح اصول و عقائد میں معتزلی العقیدہ ہے، اس لئے ذات و صفات اور اہلِ سنت کے اصول و عقائد پر بھی متکلمانہ اور فلسفیانہ بحث کی ہے، اہلِ سنت نے امام ابن تیمیہ سے اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے شدید اصرار کیا، چونکہ اس کتاب میں علم کلام، عقائد، فلسفہ، تفسیر، حدیث، تاریخ، اور آثار کے بکثرت مباحث آگئے تھے، اس لئے اس کتاب کا جواب دینے کے لئے وہی شخص موزوں تھا، جو ان تمام علوم و مضامین پر نہایت وسیع اور گہری نظر رکھتا ہو، اور ان علوم کا صاحبِ نظر جوہری و نقاد ہو اور چونکہ بدقسمتی سے شیعہ مصنفین احادیث کے وضع کرنے میں اور ان کا غلط حوالہ دینے میں نہایت مشاق اور جری واقع ہوئے ہیں، فنِ حدیث نے اتنی وسعت اختیار کر لی تھی، اور اس کے اتنے مجموعے اور دفاتر تیار ہو گئے تھے، کہ ان سب میں ان احادیث و روایات کی چھان بین کرنا اور جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے اصول پر ان کو جانچنا نہایت دشوار کام تھا، اس لئے یہ خدمت وہی شخص انجام دے سکتا تھا، جس کو حدیث و رجال کے ذخیرہ پر پورا عبور ہو اور حدیث کے کتب خانہ کا ایک ایک ورق اس کے سامنے ہو اور کسی روایت کسی راوی اور کسی حوالہ کے بارے میں اس کو دھوکا نہ دیا جا سکے، اسی کے ساتھ تاریخ اسلام پر بھی اس کی ایسی نظر ہو کہ وہ ایک نظر میں مصنف کی تاریخی غلطی پکڑ لے، اور کوئی غلط بیانی یا فرضی روایت اس کے سامنے چل نہ سکے

یہ بات مسلم ہے کہ کسی تاریخی شخصیت پر اعتراض کرنا، اور اس میں عیب نکالنا تاریخ کے وسیع ذخیرہ میں سے آسان ہے، لیکن صفائی پیش کرنا، اور مدافعت کرنا مشکل ہے، اور مطاعن صحابہ اہلِ تشیّع کا پسندیدہ موضوع اور ان کی جولانی طبع کا خاص میدان ہے، علم دین کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اس کتاب کے زمانۂ تصنیف ہی میں ایک ایسے عالم اہلِ سنت نے اس کے جواب کی طرف توجہ کی جو اپنے زمانہ کا امیر المومنین فی الحدیث تھا، جس کی آنکھوں کے سامنے حدیث و رجال کا پورا کتب خانہ کھلا ہوا تھا، اور اس کے متعلق اہلِ نظر کا مقولہ ہے کہ جس حدیث کو امام ابن تیمیہ کہہ دیں کہ میں نہیں جانتا وہ حدیث ہی نہیں، انھوں نے مطاعن صحابہ کے باب میں امت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا اور وہ کام کر دیا جو ان کے زمانہ کے بعد کسی دوسرے عالم کے لئے بہت مشکل تھا، اس باب میں ان کے بعد کے تمام علماء ان ہی کے خوشہ چیں رہیں گے۔

ابن المطہر الحلّی کی کتاب "منہاج الکرامہ" کے جواب میں انھوں نے "منہاج السنّہ" کے نام سے جو کتاب لکھی[1] وہ ان کی تمام تصانیف میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے، ابن تیمیہ کے علمی تبحر، وسعتِ نظر، حاضر دماغی، حفظ و استحضار، پختگی، اور اتقان اور ذہانت و طباعی کا اگر صحیح نمونہ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو دیکھنا چاہئے، مصنف "منہاج الکرامہ" کی عبارت نقل کرنے کے بعد جب ان کے علم و حمیّت دینی کو جوش آتا ہے، اور ان کے علم کے سمندر میں طوفان اٹھتا ہے، اور تفسیر و حدیث، تاریخ و سیر کے معلومات کا لشکر امنڈتا ہے تو بے اختیار ان کے فریق مقابل سے کہنے کو جی چاہتا ہے کہ "یَا أَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا یَشْعُرُونَ"[2]۔

کتاب کا محرک اور اندرونی باعث

امام ابن تیمیہ کے لئے اس کتاب (منہاج السنہ) کی تصنیف کا اصل محرک اور اندرونی باعث

---

[1] یہ کتاب بڑے سائز کی چار جلدوں میں ہے کتاب کے مجموعی صفحات ۱۲۱۴ ہیں ۱۳۲۲ھ میں شیخ مصطفےٰ البابی حلبی کے اہتمام میں مطبعۂ امیریہ مصر میں شائع ہوئی، علامہ ذہبی نے اس کا خلاصہ "المنتقیٰ" کے نام سے کیا تھا، حال میں وہ شیخ محمد نصیف کی توجہ اور عالی ہمتی سے اور استاد محب الدین الخطیب کے اہتمام سے مصر میں شائع ہوا ہے۔ [2] النمل - ۱۸

یہ ہے کہ مصنف "منہاج الکرامہ" نے خلفائے راشدین اور سابقین اولین پر جو امام ابن تیمیہ اور اہلِ سنت کے عقیدہ میں انبیائے کرام کے بعد افضل خلائق اور صالح ترین افراد انسانی ہیں، عامیانہ اور سوقیانہ طریقہ پر زبان طعن درازی اور ان کو شرار خلق اور ارذل مخلوقات ثابت کیا، اور یہ بات ان کے نزدیک اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلانے اور نبوت محمدی پر اعتراض و طعن اور الحاد و زندقہ کا دروازہ کھولنے کے مرادف ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اگر اس ستمگر، حد سے بڑھنے والے شخص نے ان لوگوں پر دست درازی نہ کی ہوتی جو سرخیل اولیاء اللہ اہلِ زمین کے سردار و پیشوا، اور انبیائے کرام کے بعد اللہ کی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، اور دست درازی بھی ایسی جو دین میں رخنہ ڈالتی ہے، اور کفار و منافقین کو دلیل اور حجت فراہم کرتی ہے، اور بہت سے اہلِ ایمان کے دلوں میں ضعف و شبہہ پیدا کرتی ہے تو ہمیں اس شخص کی تنقید و تردید کی اور اس کی قلعی کھولنے کی ضرورت پیش نہ آتی، اللہ تعالیٰ اس شخص سے اور اس کے ہم عقیدہ لوگوں سے انصاف کرے[۱]"

شیعوں کے نزدیک خیر الامم سے یہود و نصاریٰ بہتر ہیں

ایک دوسری جگہ شیعوں کے مطاعن اور صحابۂ کرام کی تنقیص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"امتِ محمدی خیر الامم ہے، اور اس امت محمدی میں سب سے بہتر قرن اول کے لوگ تھے، قرن اول کے لوگ علم نافع اور عمل صالح میں سب سے اکمل و اعلیٰ تھے لیکن ان افترا پردازوں نے اس کے خلاف نقشہ کھینچا ہے، ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ ان کو حق کا علم تھا، اور نہ وہ حق کی پیروی کرتے تھے، بلکہ ان میں سے اکثر حق کی جان بوجھ کر مخالفت کرتے تھے، جیسے کہ ان کا خلفاء ثلثہ اور جمہور صحابہ امت کے متعلق بیان ہے، اور ان کے نزدیک ان میں سے بہت سے حق سے آشنا نہیں تھے، بلکہ انھوں نے ظالموں کی تقلید کی، اس لئے کہ ان کو غور و فکر حاصل نہیں تھا، جو علم تک پہنچا سکے اور جس نے غور و فکر سے کام

---

[۱] حصہ چہارم ص۱۸

نہیں لیا، اس نے خواہش نفسانی یا دنیا طلبی میں کیا ہوگا، یا اپنے قصور و ادراک میں کمی کی وجہ سے ان کا دعویٰ ہے کہ صحابۂ کرام میں سے بعض استحقاقاً اپنے لئے خلافت کے طالب تھے، اس سبب سے یہ لازم آتا ہے کہ امت اپنے نبی کے بعد ساری کی ساری گمراہ تھی، اس میں سے کوئی ہدایت کے راستہ پر نہیں تھا، اسی طرح یہود و نصاریٰ (یہودیت و مسیحیت کے نسخ و تبدیل کے بعد) ان مسلمانوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں، اس لئے کہ قرآن شریف میں آتا ہے "وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ"[1] (اور موسیٰؑ کی قوم میں سے ایک جماعت ہے جو حق کی راہ بتاتے ہیں، اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی ہے کہ یہود و نصاریٰ میں ستر سے زائد فرقے ہو جائیں گے ان میں سے ایک نجات پانے والا ہوگا، لیکن اگر ان شیعوں کی بات مان لی جائے تو ان مسلمانوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک گروہ بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا، جو حق پر قائم ہو، اور انصاف کا علمبردار ہو، اور جب ان کے بہترین دور میں بھی ایسا نہیں تھا تو اس کے بعد تو اور بھی میدان صاف ہوگا، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نسخ و تبدیل کے بعد بھی اس امت سے بہتر ہیں، جن کی تعریف اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"۔

شیعوں نے خیار امت کو شرار امت بنا دیا

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"ان شیعوں نے ان اخیار امت کو جو انبیاء و مرسلین کے بعد اولین و آخرین میں سب سے اعلیٰ و افضل تھے، اور جن کی شان میں "كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" آیا ہے شرار الناس ثابت کیا، اور ان پر بڑے بڑے قبائح کا الزام لگایا، اور ان کے حسنات کو بھی سیئات بنا دیا، اور اس کے بالمقابل اسلام

---

[1] الاعراف۔ ۱۵۹۔ [2] حصہ اول صفحہ ۱۵۲

کی طرف اپنی نسبت کرنے والوں میں جو اہلِ اہواء تھے، اور جن سے بڑھ کر جاہل، کاذب، ظالم، کفر و فسق و معاصی سے قریب اور حقائق ایمانی سے دور کوئی نہیں، ان کو انھوں نے برگزیدہ ترین خلائق ثابت کیا، اور اس طرح ساری امت کی تکفیر کی یا اس کو گمراہ ثابت کیا، سوائے اپنی چھوٹی سی ٹولی کے جس کے متعلق ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہی برسرِ حق ہے۔

ایک مثال

ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بھیڑ بکریوں کے ایک بڑے ریوڑ میں جائے، اس سے کہا جائے کہ اس ریوڑ میں سب سے اچھی بھیڑ بکری چھانٹ دو، تاکہ ہم اس کی قربانی کریں، وہ ان میں سے ایک کانی لنگڑی لاغر، مریل، بکری چھانٹ دے، جس میں نہ گوشت نہ گودا، اور کہے یہ اس ریوڑ کی سب سے اچھی بکری ہے، اور قربانی اسی کی جائز ہے، باقی جتنی بھیڑ بکریاں ہیں، یہ سب بھیڑ بکریاں نہیں ہیں، بلکہ سوّر ہیں، ان کا قتل واجب اور قربانی ناجائز ہے[1]۔"

امام شعبی کا قول

وہ امام شعبی کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ روافض کے مقابلہ میں اپنے پیغمبر کے زیادہ مرتبہ شناس اور قدرداں ہیں، یہودیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون لوگ ہیں، انھوں نے کہا حضرت موسیٰؑ کے ساتھی اور ان کے اصحاب، عیسائیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے بہتر کون ہے، انھوں نے کہا حضرت عیسیٰؑ کے حواری، اور روافض سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے بدتر کون ہے، انھوں نے کہا اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان نیک بختوں کو حکم دیا گیا تھا صحابہ کے لئے مغفرت کی دعا کرنے کا انھوں نے ان کو سب و شتم کیا[2]۔

---

[1] حصہ سوم صہ ۴۰ [2] ۵۳ حصہ اول صہ ۶

سابقین اولین سے عداوت کفار سے محبت

"روافض کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ جماعت مسلمین کو چھوڑ کر ہمیشہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ساتھ دیتے ہیں اور انہی کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، ان لوگوں سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا، جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین سے عداوت رکھیں اور منافقین و کفار سے دوستی کریں۔"[1]

پھر وہ شیعوں کے کفار کا ساتھ دینے اور ان کی مدد کرنے کے واقعات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"ان میں سے اکثر نے دل سے کفار سے دوستی رکھتے ہیں مسلمانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ، چنانچہ جب تاتاری مشرق کی طرف سے آئے، اور انھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا، اور خراسان، عراق و شام اور جزیرہ میں ان کے خون کے دریا بہائے تو یہ روافض مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے حامی و مددگار تھے، اسی طرح جو شیعہ شام و حلب وغیرہ میں تھے، وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں دشمنان اسلام کے بہت زیادہ مدد کرنے والے تھے، اسی طرح سے جب عیسائیوں نے شام میں مسلمانوں سے جنگ کی تو روافض ان کی کمک پر تھے، اسی طرح اگر یہودیوں کی عراق میں یا کہیں اور حکومت قائم ہو جائے تو یہ روافض ان کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوں گے، تو وہ ہمیشہ کفار، مشرکین، یہود و نصاریٰ کی مدد کے لئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔"[2]

تعصب و بے انصافی

ایک جگہ ابن المطہر الحلی نے خواجہ نصیر الدین طوسی کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تعظیم و تقدیس سے ان کا نام لیا ہے، اور "شیخنا الامام الاعظم خواجہ نصیر الملۃ والحق والدین محمد بن الحسن الطوسی قدس اللہ روحہ"[3] کے الفاظ

---

[1] حصہ دوم صـ ۸۳ [2] حصہ دوم صـ ۸۴ [3] منہاج السنۃ ج ۲ صـ ۹۹

لکھے ہیں، اس پر ابن تیمیہ کی حمیّت ایمانی کو جوش آ گیا ہے، وہ خواجہ نصیر الدین طوسی کے فضائح اور خلیفہ عباسی اور بغداد کے قتل عام کے کارنامہ، اور ان کے ملحدانہ عقائد و خیالات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے تعجب سے لکھتے ہیں:۔

"حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ مصنف ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ اور سابقین اولین اور ان کے بعد کے ائمہ مسلمین اور اہلِ علم و دین کی شان میں گستاخی کرتا ہے، اور ان کی طرف بڑے بڑے قبائح کا انتساب کرتا ہے، اور ان کا سیدھے منہ نام نہیں لیتا، اور جس شخص کی اسلام دشمنی عالم آشکارا ہے، اس کو "شیخنا الاعظم اور قدس اللہ روحہ" لکھتا ہے، حالانکہ خود یہ ان عقائد پر تکفیر کا فتویٰ دے چکا ہے جن کا یہ شخص (نصیر الدین طوسی) اور اس کے پیرو قائل ہیں، حقیقت میں یہ بے انصاف اس آیت قرآنی کا مصداق ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ
يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ	حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں، اور
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ	کافروں کے لئے یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں سے
اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ	زیادہ راہِ راست پر ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر
اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ	اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اور جس پر اللہ لعنت
نَصِيْرًا ۝[1] (النساء۔ ۵۱۔ ۵۲)	کرے تو اس کا کوئی مددگار نہیں۔

شیعوں کی بوالعجبیاں

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شیعوں کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ وہ انبیاء سے نسبی تعلق رکھنے والے (اصول و فروع) یعنی ان کے والدین اور ان کی اولاد کی تو بڑی تعظیم کرتے ہیں، لیکن ان کی شریک زندگی اور رفیقۂ حیات بیویوں کی شان میں گستاخی اور طعن و تشنیع کرتے ہیں، یہ سب تعصب و خواہش نفسانی کا کرشمہ ہے، چنانچہ حضرت فاطمہؓ

[1] منہاج السنۃ ج ۲ ص ۹۹-۱۰۰

اور حضرت حسنؓ و حسینؓ کی تو تعظیم کرتے ہیں، اور حضرت عائشہ ام المومنینؓ کی توہین اور ان پر اعتراض کرتے ہیں[1]

ایک دوسری بوالعجبی یہ ہے کہ محمد بن ابی بکر کی تعظیم میں تو بڑا غلو اور مبالغہ کرتے ہیں، اور ان کے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں بے ادبی، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

"روافض محمد بن ابی بکر کی تعظیم میں بڑے غلو سے کام لیتے ہیں، اور یہ ان کی قدیم عادت ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش میں حصہ لیا تھا، ان کی مدح کرتے ہیں، اسی طرح سے جنھوں نے حضرت علیؓ کی معیت میں جنگ کی تھی، ان کی بڑی تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ محمد بن ابی بکرؓ کو ان کے والد حضرت ابوبکرؓ پر فضیلت دیتے ہیں، طرفہ تماشا یہ ہے کہ جو شخص پوری امت میں نبیؐ کے بعد سب سے افضل ہے، اس پر تو لعنت کرتے ہیں، اور جس کو نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہے، نہ سبقت نہ فضیلت، اس کی مدح کرتے ہیں، اور انساب کی تعظیم میں ان سے عجیب قسم کا تضاد و تناقض ظاہر ہوتا ہے"[2]

صحابۂ کرام سے دل میں کھوٹ دل کی ناپاکی ہے

وہ لکھتے ہیں:۔

"دلوں کی سب سے بڑی ناپاکی اور مرض یہ ہے کہ انسان کے دل میں ان لوگوں کی طرف سے کھوٹ ہو جو اخیار مومنین اور انبیائے کرام کے بعد اولیاء اللہ کے سرگروہ اور سرتاج تھے اسی لئے مال غنیمت (فئ) میں ان ہی لوگوں کا حصہ رکھا گیا ہے، جو مہاجرین و انصار اور سابقین اولین کی طرف سے دل میں کھوٹ نہ رکھتے ہوں، اور ان کے لئے دعا و استغفار کرتے ہوں"

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	اور ان کے لئے بھی جو مہاجرین کے بعد آئے دعا مانگا
اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ	کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو

[1] منہاج السنۃ حصہ دوم ص ۱۹۳ [2] ایضاً ص ۲۰۰-۲۰۱

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (الحشر-۱۰)

بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان داروں کی طرف سے کینہ قائم نہ ہونے پائے اے رب ہمارے! بیشک تو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

شیخین پر طعن کرنے والا دو حال سے خالی نہیں

ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما پر دو ہی طرح کے آدمی طعن کر سکتے ہیں ایک منافق زندیق، اسلام کا دشمن جس کو ان دونوں پر طعن واعتراض کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اور دین اسلام پر اعتراض وطعن مقصود ہو اور روافض کے معلم اول کا یہی حال تھا، اور ائمہ باطنیہ کا بھی یہی معاملہ ہے' دوسرے وہ جاہل شخص جو جہالت اور خواہش کی پیروی میں بہت بڑھا ہوا ہو اور شیعوں میں سے عوام کا حال یہی ہے اگر وہ اندر سے مسلمان ہیں"

رسالت پر الزام

"یہ بات تواتر سے عوام وخواص کے نزدیک ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خصوصی تعلق تھا، اور ان تینوں حضرات کو آپ کا قرب و اختصاص حاصل تھا، اور ان تینوں کے آپ کے ساتھ رشتے ہیں دو کی صاحبزادیاں آپ کے نکاح میں تھیں اور ایک کے نکاح میں آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں اور کہیں اس کا ذکر نہیں آتا کہ آپ ان کی مذمت کرتے تھے' یا ان پر لعنت کرتے تھے' بلکہ معروف یہی ہے کہ آپ ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی تعریف فرماتے تھے' اب دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تینوں حضرات آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات

لہ منہاج السنۃ

کے بعد ظاہراً و باطناً، صالح، وفادار، سلیم العقیدہ اور صحیح العمل تھے، یا یہ کہ وہ تینوں آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد استقامت پر نہیں تھے، اور (معاذ اللہ) دین سے منحرف تھے، دوسری صورت میں اگر اس حالت اور انحراف کے باوجود ان کو آپ کا یہ تقرب حاصل تھا تو دو میں سے ایک بات ماننی پڑے گی، یا تو آپ کو ان کے حالات کا علم نہیں تھا، یا علم تھا، لیکن آپ معاذ اللہ مداہنت کرتے تھے، ان دونوں صورتوں میں سے ہر صورت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان پر بڑا دھبہ اور بہت بڑا اعتراض ہے، یہ تو وہی بات ہو گی جو شاعر نے کہی ہے ؎

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ

وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ کی زندگی تک تو وہ راہِ راست پر تھے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے خواص اور اکابر اصحاب کے بارے میں بڑا دھوکا اور ناکامی ہوئی، جس شخص کو اپنے بعد کی اطلاعیں دی گئی تھیں، اور جس نے اپنے بعد ہونے والے واقعات کی خبر دی اس کو اتنی بات نہیں معلوم تھی کہ اس کے اخص خواص اس طرح منحرف ہو جائیں گے، اور احتیاط کا تو یہی تقاضا تھا کہ امت کو آپ اس کی خبر دے جاتے، تاکہ وہ غلطی سے کہیں ان کو خلیفہ نہ بنالیں اور جس شخص سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اس کا دین تمام ادیان پر غالب ہو گا، اس کے اکابر و خواص کیسے مرتد ہو سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ایسی باتوں سے روافض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر بہت بڑا اعتراض کرتے ہیں، حضرت امام مالک نے صحیح فرمایا کہ دراصل روافض نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو مطعون کرنا چاہا تاکہ لوگ کہیں کہ برے آدمی تھے اس لئے ان کے برے ساتھی تھے، اگر اچھے آدمی ہوتے تو ان کے ساتھی بھی اچھے ہوتے، اسی لئے اہلِ علم کا قول ہے کہ رفض زندقہ کی ایک سازش ہے۔[1]

---

[1] منہاج السنۃ حصہ چہارم ص ۱۲۳

فضائلِ صحابہ قطعی و متواتر ہیں

امام ابن تیمیہ صحابۂ کرام کی عدالت کو اسلام کی ایک اہم بنیاد مانتے ہیں، اور ان کو ان کی صداقت، ثقاہت پر بڑا یقین ہے، وہ ان کو اسلام کی تعلیم کا سچا نمونہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور فیض صحبت کا بہترین نتیجہ تسلیم کرتے ہیں، ان کے نزدیک صحابۂ کرام کے فضائل ایسے قطعی اور متواتر ہیں، اور قرآن مجید کی ایسی صریح نصوص و آیات سے اور ایسی صحیح احادیث و روایات سے ثابت ہیں کہ وہ کسی تاریخی روایت یا کسی غریب و شاذ حدیث سے مشکوک نہیں ہو سکتے، وہ لکھتے ہیں :۔

"جب کتاب و سنت اور نقل متواتر سے صحابۂ کرام کے محاسن و فضائل ثابت ہو چکے ہیں تو یہ درست نہیں کہ وہ ایسی منقولات سے رد ہو جائیں، جن میں سے بعض منقطع، بعض محرّف ہیں، اور بعض ایسی روایات ہیں جن سے ان ثابت شدہ حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لئے کہ یقین، شک سے زائل نہیں ہوا کرتا ہم کو کتاب و سنت، اور اپنے پیشروؤں کے اجماع اور ان کی مؤید اور متواتر روایات اور عقلی دلائل سے اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ صحابۂ کرام انبیاء علیہم السلام کے بعد افضل الخلق تھے، اس یقینی و متواتر چیز پر ان امور کا اثر نہیں پڑ سکتا جو مشکوک و مشتبہ ہیں، چہ جائیکہ جن کا باطل ہونا ظاہر ہو چکا ہے"[1]

صحابۂ کرام معصوم نہیں تھے

امام ابن تیمیہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ صحابۂ کرام انبیاء علیہم السلام اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم تھے، ان سے گناہ کا صدور ہو ہی نہیں سکتا تھا، لیکن وہ اس کے ضرور قائل ہیں کہ امت کے تمام لوگوں میں وہ سب سے زیادہ عادل، خدا ترس، صادق القول، امین اور راست باز تھے، اگر ان سے غلطیاں یا گناہ ہوئے تو

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۲۰۹

اس کے مقابلہ میں ان سے ایسے اعمال حسنہ اور خدا اور رسولؐ کو راضی کرنے والے کام ہوئے جو ان سیئات کا کفارہ بن گئے اور بہرحال ان کے حسنات اور اعمال کا پلہ ان کی تقصیرات پر بھاری ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے بھی گناہوں سے معصوم ہونے کے قائل نہیں، چہ جائیکہ خطاء فی الاجتہاد کے بھی قائل نہ ہوں، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ۝ لِیُکَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا وَیَجْزِیَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۝ (الزمر ۳۳ تا ۳۵)

اور جو سچی بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی پرہیزگار ہیں ان کے لئے جو کچھ وہ چاہیں گے ان کے رب کے پاس موجود ہوگا نیکو کاروں کا یہی بدلہ ہے تاکہ اللہ ان سے وہ برائیاں دور کر دے جو انھوں نے کی تھیں اور اللہ ان کو ان کا اجر دے ان نیک کاموں کے بدلہ میں جو وہ کیا کرتے تھے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ کَانُوْا یُوْعَدُوْنَ۝ (الاحقاف ۔ ۱۶)

یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہم وہ نیک عمل قبول کرتے ہیں، جو انھوں نے کئے اور بہشتیوں میں شامل کر کے ان کے گناہوں سے درگزر کرتے ہیں، یہ اس سچے وعدے کے مطابق ہے جو ان سے کیا گیا تھا۔

صحابۂ کرام کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی

وہ کہتے ہیں کہ ان بشری لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو انسانیت کا لازمہ ہیں، مجموعی حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور انسانوں کی کوئی نسل صحابۂ کرام سے بہتر سیرت و کردار

لے منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۲۳۸

کی نظر نہیں آتی، اگر ان کی زندگی میں کہیں کہیں کچھ ہلکے سے دھبّے اور داغ نظر آتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے سفید کپڑے میں کہیں کچھ تھوڑی سی سیاہی نظر آجائے یہ عیب چینیوں کا قصور ہے کہ ان کو اس کپڑے میں سیاہی کا نقطہ تو نظر آیا، اور اس کپڑے کی سفیدی نظر نہ آئی، دوسری جماعتوں کا تو حال یہ ہے کہ ان کا سارا نامۂ اعمال سیاہ نظر آتا ہے کہیں کہیں سفیدی نظر آتی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"صحابۂ کرام اخیار امت ہیں، امتِ محمدی میں کوئی ایسا گروہ نہیں ہے، جو ان سے زیادہ ہدایت اور دینِ حق پر مجتمع اور تفرّق و اختلاف سے دور ہو، ان کی زندگی میں کوئی نقص کی بات بھی نظر آتی ہے تو اگر اس کا کسی دوسری امت کے حالات و زندگی سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی، غلطی اس شخص کی ہے جس کو سفید کپڑے کی تھوڑی سی سیاہی تو نظر آتی ہے اور سیاہ کپڑے کی تھوڑی سی سفیدی نظر نہیں آتی، یہ بڑی نادانی اور بڑا ظلم ہے، اگر ان اکابر کا اپنے ہم مرتبہ لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو پھر ان کی فوقیت اور ان کی ترجیح ظاہر ہو جائیگی، یہ کہ کوئی شخص اپنے دل میں کوئی خیالی تصویر بنا لے یا کوئی معیار تجویز کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہ کیا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، ایک شخص اپنے دل میں ایک امام معصوم کا تصور قائم کر لیتا ہے، ایک شخص ایک اور ایسے امام کا تصور قائم کرتا ہے جس میں اور معصوم میں کوئی فرق نہیں اگرچہ اس کو صاف صاف معصوم نہیں کہتا، اور وہ تجویز کرتا ہے کہ [illegible] ایسا ہی ہونا چاہیئے اور خواہ وہ کیسا ہی [illegible] دیندار صاحب ایمان ہو اور اس کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے کیسے ہی خیر کے کام کرائے ہوں، لیکن یہ تجویز کرتا ہے کہ اس کو ایسا کامل العلم ہونا چاہیئے کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو، اور وہ کسی بھی مسئلہ میں غلطی نہ کرے اور بشریت کے لوازم و خصائص سے پاک ہو، کبھی اس کو غصہ نہ آتا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں، بلکہ بہت سے لوگ تو ان ائمہ کے متعلق وہ تجویز کرتے ہیں، جو انبیاء تک کے لئے تجویز نہیں کرتے ہیں"[1]

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۲۴۲

امام ابن تیمیہ اس پر بڑا زور دیتے ہیں کہ جس شخص کی ساری تاریخ پر نظر ہوگی، اور اس نے مختلف امتوں، قوموں اور ملتوں کے حالات پڑھے ہوں گے اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجربہ کیا ہوگا، اس کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ صحابۂ کرام سے زیادہ متحد، حق کا پیرو، فتنہ اور افتراق سے نفور، اور نفسانیت و دنیاداری سے دور کوئی جماعت نہیں گزری، وہ لکھتے ہیں:۔

فمن استقرأ اخبار العالم فی جمیع الفرق	جس شخص نے دنیا کے تمام فرقوں کے حالات و واقعات کا
تبیّن له انّه لم یکن قط طائفة اعظم اتفاقاً	اہتمام سے مطالعہ کیا ہے، اور ان کے حالات کا تتبع کیا ہے وہ
علی الهدی والرّشد وابعد عن الفتنة	جانتا ہے کہ کوئی گروہ ایسا نہیں گذرا جو ہدایت و رشد پر
والتفرق والاختلاف من اصحاب	صحابہ کرامؓ سے زیادہ مجتمع اور تفرق و اختلاف سے اتنا
رسول الله صلی الله علیه وسلم الذین هم	زیادہ دور ہو، ان صحابۂ کرام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے شہادت
خیر الخلق بشهادة الله لهم بذالك اذ یقول	دی ہے کہ وہ اس کی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، وہ فرماتا
تعالیٰ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ	ہے تم وہ بہترین امت ہو، جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے، تم
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔[1]	نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

مسلمانوں میں جو کچھ خیر ہے صحابۂ کرامؓ کی برکت ہے

امام ابن تیمیہ یہ بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس علم و دین کا جو کچھ سرمایہ ہے، خیر و برکت کا جو کچھ ذخیرہ ہے، شعائر اسلام کی بلندی، اسلام کی اشاعت، عمل خیر کے جو کچھ محرکات اور جو کچھ توفیق خیر ہے، اور سچ پوچھئے تو عالم میں اس وقت جو کچھ صلاح و خیر نظر آرہی ہے، وہ سب صحابۂ کرام کی جاں فشانیوں، اخلاص، علو ہمت، ایثار، اور قربانیوں کا نتیجہ اور ان کے نفوس قدسیہ کی برکت و نورانیت ہے، امام ابن تیمیہ بڑے

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۲۴۱

جوش سے لکھتے ہیں :-

واما الخلفاء والصحابة فكل خير فيه المسلمون	اس وقت سے لے کر قیامت تک مسلمانوں کے پاس جو کچھ
الى يوم القيامة من الايمان والاسلام والقرآن	خیر ہے مثلاً ایمان واسلام، قرآن، علوم و معارف، عبادات
والعلم والمعارف والعبادات ودخول الجنة	دخول جنت، جہنم سے نجات، کفار پر غلبہ، اللہ کے نام کی
والنجاة من النار وانتصارهم على الكفار و	بلندی، وہ سب صحابۂ کرام کی کوششوں کی برکت
علو كلمة الله فانما هو ببركة ما فعله الصحابة	ہے، جنھوں نے دین کی تبلیغ کی اور اللہ کے
الذين بلغوا الدين وجاهدوا في سبيل الله	راستہ میں جہاد کیا، جو مومن بھی اللہ پر ایمان لایا
وكل مؤمن امن بالله فللصحابة رضي الله	اس پر صحابہ کرام کا احسان قیامت تک رہے گا،
عنهم عليه فضل الى يوم القيامة وكل خير فيه	اور شیعہ وغیرہ کو بھی جو کچھ خیر حاصل ہے وہ صحابۂ کرام
الشيعة وغيرهم فهو ببركة الصحابة، وخير	کی برکت سے، اور صحابۂ کرام کی خیر خلفائے راشدین کی
الصحابة تبع لخير الخلفاء الراشدين فهم كانوا	خیر کی تابع ہے اس لئے کہ وہ دین و دنیا کی ہر خیر
اقوم بكل خير في الدين والدنيا من سائر الصحابة.[1]	کے ذمہ دار و سرچشمہ تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت دلیل نبوت و صداقت ہے

امام ابن تیمیہ نے یہ بات بھی بڑے کام کی لکھی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی جانشینی و خلافت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے کمال کی ایک دلیل ہے، اور اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ رسول برحق تھے، اور آپ کا مزاج، مزاج نبوت تھا، مزاج سیاست نہ تھا، اور آپ کو دنیا کے بادشاہوں اور سلاطین عالم سے کوئی مناسبت نہیں جو ہمیشہ اپنے بیٹے یا اپنے خاندانی آدمی کو اپنا جانشین بناتے ہیں، اگر آپ میں بھی معاذ اللہ سلطنت

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص۲۴۵

اور خاندان پرستی کا کوئی شائبہ ہوتا تو حضرت علیؓ اور عباسؓ کے علاوہ بنی ہاشم کے اور بھی بہت سے افراد تھے، جن کو اپنا جانشین بنا کر ایک خاندانی سلطنت کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی اور اس اثر و اقتدار کو جو آپ کو من جانب اللہ حاصل تھا، اپنے خاندان میں محفوظ کیا جا سکتا تھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا کمال ہے، اور جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ رسولِ برحق تھے، کوئی دنیاوی بادشاہ نہیں تھے، اس لئے کہ بادشاہوں کی عادتِ قدیمہ ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو ترجیح دیتے ہیں، اور انہی کو حکومتیں سپرد کرتے ہیں، اور اس سے وہ اپنے نزدیک اپنی سلطنت کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح اطراف و نواح کے والیوں اور حکمرانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا بھی یہی دستور ہے بنو بویہ، بنی سلجوق (سلاجقہ) اور مشرق و مغرب اور شام و یمن کے تمام سلاطین و ملوک اپنے ہی عزیزوں کو اور اپنے خاندانی لوگوں کو حکومت حوالہ کرتے ہیں، اسی طرح سے عیسائی اور مشرکین بادشاہوں کا بھی یہی معمول ہے، فرنگی بادشاہ اور چنگیز خاں کے خاندان کے بادشاہوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ سلطنت بادشاہ کے خاندان میں باقی رہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ شاہی خاندان میں سے ہے، یہ شاہی خاندان میں سے نہیں ہے، یہ ہڈی کا ہے، یہ ہڈی کا نہیں ہے، اس بنا پر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی تولیت اور اپنے چچا حضرت عباسؓ اور اپنے چچازاد بھائی علیؓ، عقیل، ربیعہ ابن الحارث بن عبد المطلب، ابوسفیان بن الحارث بن عبد المطلب وغیرہ کا خلیفہ نہ بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اس شاہی آئین کے پابند نہیں تھے، ان کے علاوہ بنی عبد مناف میں حضرت عثمانؓ بن عفان، خالدؓ بن سعید ابن العاص، ابان بن سعید بن العاص وغیرہ موجود تھے، اور بنو عبد مناف کا خاندان قریش میں سب سے جلیل القدر اور نسب میں آپ سے قریب تر تھا، یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندہ اور اللہ کے رسول ہیں، اور وہ کوئی بادشاہ نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے خلافت کے بارہ میں کسی کو محض قربِ نسب یا خاندانی شرف کی وجہ سے آگے نہیں کیا،"

بلکہ ایمان و تقویٰ کی بنا پر؛ اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت آپ کے بعد اللہ ہی کی عبادت کرے گی، اور اللہ ہی کے حکم پر چلے گی، قومی یا خاندانی یا ذاتی سربلندی اور علو فی الارض اس کا مقصود نہیں، یہاں تک کہ بعض انبیاء کے لئے جس سلطنت کی اجازت دی گئی، اس تک کو اختیار نہیں کریں گے، کیوں کہ اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ آپ عبد رسول رہیں، یا پیغمبر بادشاہ، آپ نے اسی کو اختیار کیا کہ آپ عبد رسول رہیں، درحقیقت حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی تولیت اسی کا تتمہ تھا، اس لئے کہ اگر آپ اپنے اہل بیت میں سے کسی کو اپنا قائم مقام بنا جاتے تو ان لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ آپ نے مال اپنے ورثا کے لئے جمع کیا ہے"[1]

جاہلیت کی نسب پرستی

درحقیقت ان تمام فرقوں میں جو حضرت علیؓ کے وصی ہونے کے مدعی ہیں، اور جن کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ حقیقی چچازاد بھائی اور داماد کے ہوتے کوئی دوسرا شخص خلیفہ ہو سکتا ہے جاہلیت کی بو اور اہلِ جاہلیت کی نسب پرستی کی رگ پائی جاتی ہے، جو اس بات کے تصور سے ہمیشہ قاصر رہے ہیں کہ مناصب و مراتب محض نسب و قرابت کی بنا پر نہیں بلکہ استعداد و قابلیت اور فضائل پر عطا ہوتے ہیں، عرب، ایران، ہندوستان اور اسلام سے پہلے تمام ملکوں کا یہی ذہن اور مزاج تھا جن لوگوں نے یہ فیصلہ صادر کیا، اور قطعی طور پر یہ رائے قائم کرلی کہ حضرت علیؓ ہی کو خلیفہ ہونا چاہیئے تھا، انھوں نے دراصل اپنی قومی عادات اور اپنی طبیعتوں پر قیاس کیا اور انھوں نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ اور مذاق و مزاج اور ان کا ظرف و حوصلہ نہیں سمجھا۔ ؎

فکر ہر کس بقدر ہمتِ اوست

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

[1] منہاج السنۃ: حصہ چہارم ص ۱۲۶

"روافض کا کلام مشرکین جاہلیت ہی کے کلام سے ملتا جلتا ہے، وہ نسب اور آباء کے بارے میں تو بڑا تعصب برتتے ہیں، اور خاندان کی بنیاد پر حمایت و محبت کرتے ہیں، اور انسان کے لئے وہ چیزیں قابلِ اعتراض قرار دیتے ہیں، جس سے ایمان و تقویٰ میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، اور یہ سب جاہلیت کے افعال ہیں۔"[1]

شیعوں کا انتساب اور مدح اولادِ حسین کے لئے ایک آزمائش ہے

امام ابن تیمیہ کے نزدیک شیعہ اہلِ بیت کے نادان دوست ہیں، اور ان کی مبالغہ آرائیوں، غلو، اور غلط واقعات و روایات سے اہلِ بیت کی بدنامی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اولادِ حسین کے لئے شیعوں کا ان کی طرف انتساب اور تعظیم و مدح بھی ایک مصیبت اور ابتلاء ہے اس لئے کہ وہ ان کی ایسی چیزوں کے ساتھ مدح کرتے ہیں، جو مدح کی بات نہیں، وہ ان کے لئے ایسے دعوے کرتے ہیں جن کی کوئی حجت نہیں اور ان کے متعلق ایسی باتیں ذکر کرتے ہیں کہ اگر ان کی فضیلت سنیوں کے کلام سے اور کتابوں سے نہ معلوم ہوتی تو شیعہ ان کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ مدح سے زیادہ قدح ہوتی۔"[2]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ان شیعوں کو مناقب و مثالب کی حقیقت کی خبر ہی نہیں، اور نہ ان کو ان طرق کا علم ہے جن سے یہ مناقب ثابت ہوتے ہیں۔"[3]

تعصب کی کرشمہ سازیاں

مصنف "منہاج الکرامہ" نے حضرت علیؓ اور ائمۂ اہلِ بیت کی امامت کے ثبوت میں اور ان کے مناقب میں بکثرت آیات اور احادیث و روایات جمع کر دی ہیں،[4] ان آیات و احادیث و روایات کو دیکھ کر اندازہ

---

[1] منہاج السنۃ حصہ چہارم صفحہ ۲۸۷ [2] حصہ دوم صفحہ ۱۲۵ [3] حصہ دوم صفحہ ۱۲۶ [4] ملاحظہ ہو حصہ چہارم از صفحہ ۲ تا ۷۹ و از صفحہ ۸۰ تا ۱۲۹ و از صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۳

ہوتا ہے کہ تعصب انسان کو کہاں تک پہنچا سکتا ہے' ان آیات میں بیشتر یا تقریباً تمام تر حصہ وہ ہے جس کا اہلِ بیت سے یا تو سرے سے کوئی تعلق نہیں یا وہ بھی عامۂ مسلمین کے ساتھ شامل ہیں' احادیث وروایات میں سے اکثر موضوع وضعیف ہیں' اور بقول امام ابن تیمیہ کے "الروایات المسیبۃ التی لا زمام لہا ولا خطام" یعنی وہ احادیث جن کا کوئی سر پیر نہیں' اس سلسلہ میں شیعہ مصنف نے ایسی جرأت وبے باکی سے کام لیا ہے کہ بہت سی احادیث کو صحیحین کی طرف اور بہت سی احادیث کو مسند احمد ابن حنبل کی طرف منسوب کیا ہے' اور امام ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ ان کا کہیں صحیحین ومسند میں وجود نہیں' بعض احادیث کے متعلق لکھا ہے کہ احادیث کے کسی مجموعہ اور دواوین اسلام میں کہیں ان کو نہیں دکھایا جا سکتا' شیعہ چونکہ قرآن وحدیث سے بہت ناواقف ہیں' اس لئے وہ معمولی اصطلاحات کو بھی نہیں سمجھتے اور بعض اوقات بے تکلف غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔

آیات کے سلسلہ میں مصنّف نے بڑے بڑے لطیفے کئے ہیں' ان کی تفسیر کو دیکھ کر وہ مشہور لطیفہ یاد آجاتا ہے کہ کسی بھوکے سے پوچھا گیا دو دو کتنے ہوتے ہیں' اس نے کہا چار روٹیاں' مصنف نے چالیس آیتیں لکھی ہیں' جو اس کے نزدیک حضرت علیؓ کے بارے میں نازل ہوئیں' یہاں پر چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" مصنف ابونُعیم کی ایک حدیث نقل کرتا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے خطبہ کے بعد نازل ہوئی ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ اکبر علی اکمال الدین واتمام النعمۃ ورضا الربّ برسالتی وبالولایۃ لعلی من بعدی"۔

امام ابن تیمیہ پہلے تو محدثانہ طریقہ پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث باتفاق اہلِ فن موضوع ہے' اور کتب حدیث میں سے کسی قابلِ اعتماد کتاب میں نہیں پائی جاتی' پھر مفسرانہ اور مورخانہ طریقہ پر ثابت کرتے ہیں کہ صحاح' مسانید اور تفسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت عرفہ کے دن وقوف کی حالت میں نازل ہوئی' ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ ایک آیت آپ کے قرآن میں ایسی ہے کہ اگر ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے' حضرت عمرؓ نے فرمایا کونسی' اس نے کہا "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا"

حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے خوب معلوم ہے کہ یہ کس دن نازل ہوئی تھی اور کس جگہ نازل ہوئی ہے، یہ عرفہ کے دن عرفات میں ایسی حالت میں نازل ہوئی تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وقوف میں تھے، امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ دوسرے ذرائع سے بھی یہ بات شہرت اور تواتر کو پہونچ گئی ہے اور یہ مسلمانوں کی تمام کتابوں میں موجود ہے، یہ یوم جمعہ ۹ ذی الحجہ یوم خم سے ۹ دن پہلے کا واقعہ ہے، تو یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ غدیر خم کے موقع پر نازل ہوئی، دوسرے اس روایت میں یہ الفاظ جو نقل کئے گئے ہیں "اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ" آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مستجاب الدعوات کون ہو سکتا ہے اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اس دعا کا تحقق ہوتا لیکن تاریخ سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔

مصنف نے لکھا ہے کہ آیت "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ"[1] بحرین سے مراد علی وفاطمہ اور "بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ" سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور "يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ" سے مراد حسن حسینؓ ہیں، امام ابن تیمیہ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ان ھذا وامثالہ یقولہ من لا یعقل ما یقول وھذا بالھذیان اشبہ منہ بتفسیر القرآن وھو من تفسیر الملاحدۃ والقرامطۃ الباطنیۃ للقرآن بل ھو شر من کثیر منھم۔	اس طرح کی باتیں وہی کہہ سکتا ہے جو بے سمجھے بات کرنے کا عادی ہے، اور یہ تفسیر کے بجائے ایسی ہی بے ربط اور مہمل باتیں ہیں، جیسی سرسامی کیفیت میں مریض کی زبان سے نکلتی ہیں، اور وہ اسی طرح کی تفسیر ہے جیسی ملاحدہ قرامطہ اور باطنیہ کرنے کے عادی ہیں بلکہ یہ اس سے بھی بدتر ہے۔

امام ابن تیمیہ نے پھر اس تفسیر کے غلط ہونے کے چھ وجوہ لکھے ہیں، ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ رحمٰن کی ہے، اور وہ بالاتفاق مکّی ہے، اور حضرت حسن حسین مدینہ طیبہ میں اس کے نزول کے کئی سال بعد پیدا ہوئے ہیں، دوسرے اس آیت کی تفسیر سورۂ فرقان کی آیت سے ہوتی ہے "وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ

---

[1] ترجمہ:۔ اس نے دو سمندر رلا دیئے جو باہم ملتے ہیں، ان دونوں میں پردہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کر سکتی (سورۂ رحمٰن۔ ۱۹۔ ۱۱)

وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ[۱] اگر اس سے مراد علی و فاطمہ ہیں تو ان میں سے ایک کو ملح اجاج (کڑوا نمکین) قرار دینا پڑے گا، تیسرے اگر برزخ سے مراد حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہیں تو آپ مانع وحجاب ہوئے اور یہ مدح نہیں بلکہ ذم ہے[۲] الخ

اسی طرح سے یہ حصہ عجائب و لطائف سے بھرا ہوا ہے، اور شیخ الاسلام نے مفسرانہ اور محدثانہ، فقیہانہ ومورخانہ اور ناقدانہ جوابات دیئے ہیں، جو ان کی ذہانت، وفورِ علم اور قوتِ مناظرہ کا روشن ثبوت ہیں، انھوں نے ان تمام دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حضرت علیؓ کی فضیلت وولایت اور علو مرتبت ایسے صحیح اور مسلّم طریقوں سے ثابت ہے جس سے یقینی اور قطعی علم حاصل ہوتا ہے، ان چیزوں کی موجودگی میں دروغ بافی، غلط بیانی اور مشکوک روایات و بیانات کی ضرورت نہیں[۳]"

کتاب کا دوسرا معرکۃ الآرا حصّہ وہ ہے جس میں "منہاج الکرامہ" کے اس حصہ پر بحث ہے جس میں مصنف نے صحابۂ کرام پر بالعموم اور شیخین پر بالخصوص اور صدیق اکبرؓ پر بالاخص مطاعن، اور اعتراض جمع کئے ہیں، یہ اعتراضات بزعم مصنف قرآن مجید سے بھی ماخوذ ہیں، احادیث وسیر سے بھی، اور تاریخ سے بھی، یہ مطاعن واعتراضات اس بات کا ثبوت ہیں کہ عداوت ایک پڑھے لکھے انسان کو بھی کہاں تک لے جاسکتی ہے، یہاں پر اس کے صرف دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

قرآن مجید کی مشہور آیت جو صدیق اکبرؓ کی خصوصیت کی سب سے بڑی دلیل، اور ان کی وہ فضیلت و منقبت ہے جس میں امت کا کوئی فرد ان کا شریک وسہیم نہیں، وہ یہ آیت ہے "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا[۴]" "منہاج الکرامہ" کا مصنف لکھتا ہے کہ اس میں حضرت ابوبکرؓ کے لئے فضیلت کی کوئی بات نہیں، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ آنحضرت صلے اللہ

---

[۱] ترجمہ:۔ اور وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو آپس میں ملا دیا، یہ میٹھا خوشگوار ہے، اور یہ کھاری کڑوا ہے (الفرقان ۔۵۳) [۲] حصہ ۴ ص ۶۷-۶۸

[۳] حصہ ۴ ص ۱۸۶ [۴] ترجمہ: اگر تم رسول کی مدد نہ کروگے تو اس کی اللہ نے مدد کی ہے جب وقت اسے کافروں نے نکالا تھا کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا تو غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے (التوبہ۔ ۴۰)

علیہ وسلم نے آپ کو صرف اس لئے ساتھ لیا ہو کہ وہ آپ کے روانہ ہوجانے کے بعد کہیں مخبری نہ کردیں اس لئے کہ ان کے متعلق اس بات کا اطمینان نہ تھا، دوسرے اس آیت کے اندر خود ان کی ہجو موجود ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ سے کہا "لاتحزن" اس سے معلوم ہوا کہ آپ (معاذ اللہ) بہت ڈرنے والے اور بے صبر تھے، اور آپ کو اللہ پر یقین اور اس کے فیصلہ پر اطمینان نہیں تھا، تیسرے یہ کہ قرآن مجید کا قاعدہ ہے کہ جہاں کہیں نزولِ سکینہ کا ذکر کرتا ہے، وہاں مومنین کو ضرور شریک کرتا ہے لیکن یہاں تنہا رسول کا ذکر کیا حضرت ابوبکرؓ کا ذکر نہیں جس سے معلوم ہوا کہ سکینہ کا نزول ان پر نہیں ہوا۔

امام ابن تیمیہ نے اول تو ثابت کیا ہے کہ اس آیت نے ابوبکرؓ کے لئے کیسے کیسے فضائل و مناقب جمع کردیئے ہیں، اور یہ معیت کیسی خصوصی تھی[1]، باقی مصنف کا یہ کہنا کہ ان کو اس لئے ساتھ لے لیا تھا تاکہ وہ دشمنوں کو خبر نہ کردیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناقابلِ اعتماد تھے، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کی طرف سے مطمئن نہیں تھے، تو دنیا کا ضعیف العقل سے ضعیف العقل انسان ایسے نازک اور خطرناک سفر میں ایسے ناقابلِ اعتماد آدمی کو ساتھ نہیں لے سکتا، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:۔

فقبح اللہ من نسب رسولہ الذی	اللہ سمجھے اس شخص سے جس نے رسول اللہ صلے اللہ
ھو اکمل الخلق عقلا وعلما وخبرۃ	علیہ وسلم کی طرف جو عقل و علم و تجربہ میں کامل ترین
الی مثل ھذہ الجھالۃ والغباوۃ۔[2]	انسان تھے ایسی جہالت و غباوت کی نسبت کی۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ بادشاہ خربندہ[3] جس کے لئے مصنف نے یہ کتاب تصنیف کی ہے، جب اس سے یہ کہا گیا کہ ابوبکرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھتے تھے، اور آپ کے دشمن تھے، اور اس کے باوجود آپ نے ان کو سفر ہجرت میں ساتھ لیا جو سب سے زیادہ خوفناک سفر تھا، تو اس نے

---

[1] منہاج السنۃ ص۲۴۰ تا ۲۵۵ [2] ایضاً حصہ چہارم ص۲۵۵ [3] منہاج السنۃ۔ اور بعض تاریخ کی اور کتابوں میں بھی اس تاتاری بادشاہ کو اس نام سے یاد کیا گیا ہے۔

سننے ہی وہ بات کہی جو ایسے موقعہ پر کہی جا سکتی ہے، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس سے بالکل منزّہ ہے، یعنی "یہ کسی عقلمند آدمی کا فعل نہیں ہو سکتا"[1] پھر تفصیل کے ساتھ ایک ایک بات کا جواب دیا ہے[2] اور بتایا ہے کہ قرآن مجید میں حزن و خوف کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے، کیسے کیسے انبیائے اولوالعزم اور صلحائے مومنین اور افرادِ اہلِ بیت سے طبعی طور پر خوف اور حزن ثابت ہوتا ہے، باقی مصنف کا یہ کہنا کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں نزول سکینہ کا ذکر ہے، وہاں مومنین کا ہمیشہ تذکرہ آتا ہے تو اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں بکثرت ایسا ہوا ہے، حالانکہ صرف ایک ہی آیت ایسی ہے[3]، جہاں نزول سکینہ کے موقع پر رسول کے ساتھ مومنین کا بھی ذکر ہے، اور وہ آیت یہ ہے "وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا"[4] وہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر مومنین کے ذکر کا خاص موقعہ تھا، اس لئے کہ "ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ" آچکا ہے، اس کے برخلاف قرآن مجید میں کئی جگہ صرف مومنین ہی کا تذکرہ نزول سکینہ کے موقع پر آیا ہے، پھر امام نے اس کے لطائف اور وجوہ تفصیل سے لکھے ہیں[5]۔

اس تعصب کا دوسرا نمونہ یہ ہے کہ روایات و سیر میں آیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم میدانِ بدر میں عریش[6] کے نیچے تھے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے، مصنف لکھتا ہے کہ چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ کو جنگ کا حکم دیا جائے گا تو کھیل بگڑ جائے گا، اس لئے کہ وہ آپ کے غزوات میں کئی دفعہ بھاگ چکے تھے، امام ابن تیمیہ کو اس موقع پر علمی و ایمانی جوش آگیا ہے،

---

[1] منہاج السنۃ حصہ چہارم ص۲۵۵ [2] ایضاً ص۲۵۶ [3] ایک دوسری آیت بھی ہے "إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ الخ" (سورۃ الفتح۔ ۲۶) [4] التوبہ ۲۵ [5] منہاج السنۃ حصہ چہارم ص۲۷۳ تا ۲۷۷ [6] میدانِ بدر میں ایک چھپر ڈال دیا گیا تھا، اس کے نیچے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سربسجود و مشغول دعا تھے، اس وقت تنہا حضرت ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے ملاحظہ ہو کتب سیرت و احادیث۔

وہ لکھتے ہیں کہ مصنف نے یہ جو کہا ہے کہ وہ غزوات نبوی میں کئی دفعہ راہِ فرار اختیار کر چکے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف غزواتِ نبوی کے بارے میں بالکل جاہل واقع ہوا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لئے کہ جس گروہ سے اس کا تعلق ہے اُس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات سے نہ کوئی واقفیت ہے، نہ کوئی دلچسپی، اس کو یہ خبر نہیں کہ بدر کی جنگ پہلی جنگ تھی جس میں لڑائی ہوئی، اس سے پہلے کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ شریک ہوئے ہوں، اس پر تمام اہلِ سیر، حدیث و مغازی، فقہ و تواریخ کا اتفاق ہے کہ بدر پہلی جنگ تھی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قتال فرمایا، اس سے پہلے کوئی غزوہ یا سریہ ایسا پیش نہیں آیا جس میں جنگ کی نوبت آئی ہو سوائے ابن الحضرمی کے واقعہ کے جس میں حضرت ابوبکرؓ شریک ہی نہیں تھے، تو یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ اس سے پہلے کئی بار میدان جنگ سے فرار اختیار کر چکے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا کسی جنگ سے بھاگنا ثابت نہیں، اس کا بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہے کہ وہ ثابت کرے کہ کس جنگ سے انھوں نے فرار اختیار کیا، تیسری بات یہ ہے کہ اگر معاذ اللہ حضرت ابوبکرؓ ایسے ہی بزدل تھے تو ان کو اپنے ساتھ عریش میں رکھنا مناسب نہیں تھا، بلکہ ایسے آدمی کو میدانِ جنگ میں لانا بھی مناسب نہیں تھا، چہ جائیکہ خاص طور پر تمام صحابہ کرام میں سے ان کو اپنی رفاقت کے لئے انتخاب فرمایا۔[1]

حضرت علیؓ کے بارے میں تناقض

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا اور خدا بنایا، دوسری طرف ان کی صلیب کے واقعہ کی ایسی تصویر کھینچی کہ وہ ایک بے بس و مجبور انسان نظر آتے ہیں، جو ہر طرح کی توہین و تذلیل اور تمسخر و استہزاء کا نشانہ و تختہ مشق ہیں، اسی طرح سے شیعہ حضرات نے ایک طرف تو حضرت علیؓ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۲۸۲ تا ۲۸۶

کے لئے وہ صفات اور قوتیں ثابت کیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پایہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی کچھ بلند تھا، اور اگر وہ نہ ہوتے تو اسلام کو فروغ نہ ہوتا، ان ہی کے پنجۂ خیبر شکن اور ذوالفقار آبدار سے اسلام کی فتح ہوئی، اور کفر سرنگوں ہوا، دوسری طرف خلفائے ثلثہ کی خلافت میں ان کو ایسا مجبور و بے بس ثابت کیا ہے کہ وہ سب کچھ اپنے ضمیر و عقیدہ کے خلاف دیکھتے اور ان کی اور ان کے اہلِ بیت کی ہر طرح توہین و تذلیل ہوتی، اور وہ کچھ نہ کر سکتے، یہ صریح تناقض اور تضاد ہے، امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں :۔

"یہ شیعہ جمع بین النقیضین کرتے ہیں، ایک طرف وہ حضرت علیؓ کو قوت و شجاعت میں سب سے کامل اور بڑھا ہوا بتاتے ہیں، یہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے ان ہی نے دینِ رسول کو قائم کیا، اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے محتاج تھے، اور ان کو اقامتِ دین میں اللہ کا شریک بتاتے ہیں، پھر اسلام کے غلبہ اور قوت کے بعد اور لوگوں کے اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد ان کے عجز و ضعف، اضطرار و تقیّہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ کمزور اور بے بس ہستی نہ تھی، حالانکہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ بہ نسبت سابق کے زیادہ حق کے پیرو ہو گئے، تو جو شخص دینِ محمدی کے قائم کرنے میں اللہ کا شریکِ حال تھا جس نے کفار کو مغلوب کیا، اور وہ اسلام لائے وہ اپنی طاقت اس جماعت کے مغلوب کرنے میں کیوں نہیں دکھاتا، جنھوں نے اس پر زیادتی کی تھی، حالانکہ وہ تعداد میں بھی ان کفار سے کم تھے، اور قوت و شوکت میں بھی کمزور تھے، اور یہ مخالفین بہرحال حق سے زیادہ قریب تھے"[1]

مبحثِ امامت

امام ابن تیمیہ نے امامت کے مبحث پر بھی بڑی مفصل بحث کی ہے، اور شیعہ امامت کی جو تعریف کرتے ہیں، اور اس کو دین کا رکن قرار دیتے ہیں، اس کا بہ شدّت انکار کیا ہے، اور ان تمام عقلی و نقلی دلائل کا رد کیا ہے جو اس کے

[1] منہاج السنۃ حصہ ۴ صفحہ ۵۶

ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں امام غائب کے عقیدہ کا بڑا مذاق اڑایا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ اس عقیدہ سے سوائے فساد، اختلاف، بے عملی اور تعطل کے کوئی فائدہ نہیں[1]۔

شیعوں کو قرآن و حدیث سے دلچسپی نہیں

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شیعوں کو حفظ قرآن کی طرف اور اس کے معانی و تفسیر کا علم اور ادلہ کی تلاش و جستجو کی طرف کوئی توجہ نہیں، اسی طرح احادیث صحیح و سقیم کی پہچان، حدیث کے معانی و مطالب اور صحابہ و تابعین کے آثار سے واقفیت کا کوئی اہتمام نہیں، ان کا سرمایہ اور مبلغ علم کچھ آثار ہیں، جو بعض اہل بیت سے نقل ہوتے چلے آرہے ہیں، ان میں جھوٹ سچ سب کچھ ہے[2]۔

مساجد و جمعہ و جماعت سے بیگانگی

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ شیعوں نے انبیاء بلکہ ائمہ کے بارے میں ایسا غلو کیا کہ ان کو "ارباباً من دون اللہ" بنادیا، اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت سے جس کا پیغمبروں نے حکم دیا تھا بے اعتنائی کی تم دیکھو گے کہ وہ مساجد جن کو بلند اور بارونق رکھنے اور ان میں اللہ کا نام لینے کا حکم دیا ہے، ان کو ویران رکھتے ہیں، اور ان میں جمعہ و جماعت کو قائم نہیں کرتے، اور ان کے نزدیک ان کا کوئی بڑا احترام نہیں ہے اور اگر ان میں کبھی نماز پڑھتے بھی ہیں تو الگ الگ، اور ان مشاہد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، جو قبور پر بنائے گئے ہیں، ان پر معتکف رہتے ہیں جیسے مشرکین، اور دور دور سے سفر کرکے ان کی زیارت کے لئے آتے ہیں، جیسے کہ حجاج خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں[3]۔

متاخرین شیعہ معتزلہ کے پیرو ہیں

متاخرین شیعہ عقلیات میں عام طور پر معتزلہ کے پیرو ہیں، اور کچھ لوگوں نے فلاسفۂ یونان کی پیروی کی ہے

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۲۴۹ تا ۲۵۰ [2] ایضاً ص ۴۰ [3] ایضاً حصہ اول ص ۱۳۱

اور ان پر تفلسف غالب ہے، ان کے علماء میں سے کوئی تو فلسفہ و اعتزال اور رفض کا جامع ہے، جیسے "منہاج الکرام" کا مصنف[1]، اس سلسلہ میں مصنف کتاب نے عقائد و علم کلام کی جو بحثیں چھیڑی ہیں، جن میں اعتزاض و فلسفہ کا رنگ صاف جھلکتا ہے، ان کا امام ابن تیمیہ نے تفصیلاً جواب دیا ہے، یہ حصہ گہری فلسفیانہ اور متکلمانہ بحثوں سے بھرا ہوا ہے، اور چونکہ وہ معقول و منقول دونوں سمندروں کے شناور ہیں، اس لئے انھوں نے اپنی عادت کے مطابق دل کھول کر بحث کی ہے[2]، اور ایک ایک حرف کا رد کیا ہے، اور اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ اس فرقہ کی واقفیت عقلیات سے بہت سطحی اور عامیانہ ہے اور ان کے علماء بھی اس علم میں طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں[3]۔

گذشتہ تاریخ

امام ابن تیمیہ نے جابجا لکھا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں شیعوں نے کفار و مشرکین کا ساتھ دیا، اور اسلام سے بے وفائی کی اور اسلامی سلطنت کو نقصان پہونچایا اور اخیر میں ان کا قلم یہ لکھنے پر مجبور ہوا ہے، "فایامهم فی الاسلام کلها سود"[4]

اہلِ سنت راہِ اعتدال پر

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں صرف اہلِ سنت ہی توسط اور اعتدال کی راہ پر ہیں، اور افراط و تفریط سے محفوظ ہیں، ان کے نزدیک اہل بیت کی محبت اور صحابہ کرام کی تعظیم میں کوئی تضاد نہیں، انھوں نے ان دونوں نعمتوں کو جمع کر رکھا ہے، اور یہی صحیح اسلام ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اہلِ سنت تمام مومنین کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، اور علم و عدل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں،

---

[1] منہاج السنۃ حصہ سوم ص ۴۰ [2] ملاحظہ ہو ص ۳ تا ۱۲۹ حصہ اولی [3] ایضاً

[4] ایضاً حصہ چہارم ص ۱۱۱ ترجمہ:۔ خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ان کی تاریخ بالکل سیاہ ہے۔

وہ نہ اہلِ جہل میں سے ہیں، نہ اہل اہواء میں سے، وہ روافض اور خوارج دونوں کے طریقہ سے بیزار، وہ تمام سابقین اولین کے معتقد ہیں، اور صحابۂ کرام کی قدر و منزلت کے شناسا اور معترف ہیں، اور ان کے مناقب کے قائل ہیں، اور اس سب کے ساتھ اہلِ بیت کرام کے حقوق کی ادائگی ضروری سمجھتے ہیں، جو شریعت سے ثابت ہیں[1]۔"

---

[1] منہاج السنۃ حصہ اول ص ۱۶۵

امام ابنِ تیمیہ کا عہد

امام ابن تیمیہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس میں شرعی اور دینی علوم بڑی وسعت اختیار کر چکے تھے، خصوصیت کے ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ میں سے ہر موضوع پر اتنا وسیع کتب خانہ مرتب ہو چکا تھا کہ ان میں سے کسی ایک موضوع پر عبور حاصل کرنا اور اس وقت تک کے علمی ذخیرہ سے اجمالی واقفیت بھی ایک متوسط آدمی کے لئے بہت بڑا علمی کارنامہ تھا، لیکن پھر بھی ان کے عہد میں بکثرت ایسے عالم اور مدرّس موجود تھے، جو اس کتب خانہ پر نظر ڈال چکے تھے، اور ان میں سے متعدد ایسے بھی تھے، جو اپنے قوی حافظہ، علمی اشتغال، کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ درس وتدریس کی وجہ سے اس کے ایک معتدبہ حصہ کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے تھے، اور تدریس ومناظرہ کے وقت اس سے بے تکلف استفادہ اور اس کا اعادہ کر سکتے تھے، علامہ کمال الدین ابن الزملکانی، تقی الدین علی بن السبکی، شمس الدین الذہبی، ابوالحجاج المزّی اس کا ایک نمونہ ہیں، "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں علمی استحضار، تبحّر، محفوظات کی کثرت اور علمی تفنّن کس حد تک پہونچ چکا تھا، متعدد اصحاب ایسے تھے جن کو علوم شرعیہ کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کہنا صحیح ہوگا۔

لیکن علم ومعلومات میں جتنی وسعت تھی، فکر میں اتنا عمق نہیں تھا، ایسے لوگوں کی عرصہ سے کمی چلی آرہی تھی، جو اس پورے علمی ذخیرہ پر ناقدانہ اور استادانہ نظر رکھتے ہوں، متقدمین کے آراء وخیالات میں موازنہ وتقابل کی قوت رکھتے ہوں اور مسائل وآراء میں اپنی کوئی ذاتی اور منفرد رائے بھی رکھتے ہوں، متقدمین نے جو قابلِ قدر

علمی اندوختہ چھوڑا تھا، اکثر متاخرین کا کام صرف اس پر عبور حاصل کر لینا، اور اس کی شرح و توضیح، اختصار و تلخیص رہ گیا تھا، عرصہ سے اس میں کوئی معتدبہ اور قابلِ قدر اضافہ نہیں ہو رہا تھا، کوئی ایسی تصنیف جس کو طبع زاد یا مجتہدانہ کہا جا سکے، کمیاب تھی، اس عصر کی جو بہترین اور مایۂ ناز تصنیفات سمجھی جاتی تھیں، ان کا جوہر بھی صرف یہ تھا کہ مصنّف نے اپنے سے پہلے کے منتشر معلومات کو یکجا جمع اور سلیقہ سے مرتّب کر دیا تھا، یا وہ کسی سابق فقہی متن کی عمدہ شرح تھی۔

ان کی تصنیفی و علمی خصوصیات

امام ابن تیمیہ نے اپنے حافظۂ خداداد سے اس پورے علمی ذخیرہ پر عبور حاصل کیا اور اس کو فکری طور پر ہضم کر لیا، اور اس سے اپنی تصنیفات میں پورا فائدہ اٹھایا، لیکن ان کی بے چین اور موّاج طبیعت، ان کا نکتہ سنج و نکتہ آفریں دماغ اور ان کا سیّال و رواں قلم اس پر قانع نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ صرف نقل و روایت اور شرح و تلخیص یا انتخاب پر اکتفا کریں قرآن مجید کا گہرا علم، مقاصد شریعت سے گہری واقفیت اور اصولِ فقہ اور اصولِ تشریع کا ملکۂ راسخہ ان کی ہر تصنیف میں ان کا رفیق ہے، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس میں اپنے تازہ علم سے جان ڈال دیتے ہیں، ان کی کوئی ایسی تصنیف نہیں ہوگی جس میں کچھ نئے علمی حقائق، علمی نکتے، ناقدانہ بحثیں اور جدید اصولی مباحث نہ ملیں، اور قرآن مجید کے فہم کی ایک نئی راہ اور شریعت کے مقاصد کے سمجھنے کا نیا دروازہ کشادہ نہ ہو، ان کی دو ضخیم تصنیفات "الجواب الصحیح" اور "منہاج السنۃ" پر مفصل تبصرہ اور ان کے مضامین کی تلخیص گزر چکی ہے، ان دونوں کے علاوہ ان کی متعدد تصنیفات ایسی ہیں، جو ان کے مجتہدانہ فکر و نظر و ذہن رسا، اور قوت تنقید کی شاہد ہیں، اور ہر عہد کے دماغوں کو جدید و صالح علمی و فکری غذا مہیا کرتی ہیں، اور زمانہ کے اہل علم کو ان میں نیا مواد، نئے دلائل اور نئی تحقیقات نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر "کتاب النبوات" "الرد علی المنطقیین"

"اقتضاء الصراط المستقیم"[1] نہ صرف اعلیٰ علمی تصنیفات اور اپنے موضوع پر کامیاب کتابیں ہیں، بلکہ اس طرح کی خیال آفریں و خیال افروز کتابیں ہیں، جو ذہن کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں، اور ان کے سامنے نئے علمی میدان اور سوچنے اور غور کرنے کے لئے نئے مسائل اور مضامین لاتی ہیں۔

تفسیر

امام ابن تیمیہ نے تفسیر کو اپنے فکر و تصنیف کا خاص موضوع بنایا، یہ ذوق ان پر اس قدر غالب تھا کہ ان کی کوئی تصنیف مشکل سے ایسی ہوگی جس میں قرآن مجید کی تفسیر کا مواد نہ ملے اور آیات سے استدلال اور ان کی شرح و تفسیر نہ ہو، ان کے سامنے جب کوئی آیت آتی ہے تو اس کی تفسیر کئے بغیر ان سے بڑھا نہیں جاتا، ان کے تلامذہ کا بیان ہے کہ انھوں نے جو تفسیری ذخیرہ چھوڑا وہ تیس[۳۰] جلدوں سے زائد ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اگر وہ ذخیرہ دستیاب ہو جائے تو وہ تفسیر کا ایک بہت قیمتی اور مستند ذخیرہ ہوگا، فکر و نظر کی گہرائی، سلامتِ ذوق، روایات پر کامل عبور اور ان سے استناد، آیات کی زندگی پر تطبیق، اپنے ماحول و معاشرہ سے واقفیت، داعیانہ روح اور جذبۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حمیت دین کی جو دولت اللہ نے ان کو عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے ان کے قلم سے نکلی ہوئی تفسیر شاید سب سے بہتر اور جامع تفسیر ہوتی اگرچہ یہ مفصل و مسلسل تفسیر اس وقت نایاب ہے لیکن قرآن مجید کی متعدد سورتوں کی تفسیریں چھپ چکی ہیں، اور ان سے ان کی مفسرانہ خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے، ان میں سے تفسیر سورۃ الاخلاص، تفسیر معوذتین اور تفسیر سورۂ نور، عرصہ ہوا

---

[1] "اقتضاء الصراط المستقیم مخالفة اصحاب الجحیم" کا موضوع اگرچہ صرف یہ ہے کہ غیر مسلموں کے رسوم و شعائر اختیار نہ کئے جائیں، اور ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت نہ کی جائے، مگر حسب معمول یہ کتاب بڑے نفیس مباحث و علوم پر مشتمل ہے، اور شیخ الاسلام کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے، اس کا ایک ایڈیشن بڑے اہتمام سے انصار السنۃ قاہرہ نے شائع کیا ہے، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کی جانب سے اس کے ضروری اور موجودہ حالات میں رہنمائی کرنے والے مباحث کو اردو میں "اسلام اور غیر اسلامی تہذیب" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

مصر میں چھپ چکی ہیں، حال میں ان کی مختلف تصنیفات میں سے تفسیری حصوں کو علیٰحدہ کرکے چھاپ دیا گیا ہے[1]، تفسیر سے ان کا تعلق اس ہی، ان کا اشتغال وانہماک ان کی زندگی میں بھی معروف تھا، یہ ان کا ایسا امتیازی نشان سمجھا جاتا ہے کہ ان کے جنازہ کی نماز کا اعلان بھی اسی عنوان سے ہوا" الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن" ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ اصول تفسیر پر بھی ہے، جہاں تک ہم کو معلوم ہے امام ابن تیمیہ کا یہ رسالہ اصول تفسیر کا پہلا مستقل رسالہ ہے۔

حدیث

حدیث اور شرح حدیث میں اگرچہ امام ابن تیمیہ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، اور حدیث کا فن ساتویں اور آٹھویں صدی میں جس وسعت و کمال کو پہونچ چکا تھا، اس کے بعد یہ کام کچھ ایسا ضروری بھی نہیں رہ گیا تھا، مگر ان کی تصنیفات میں اصول حدیث، اسماء الرّجال، جرح و تعدیل، نقد حدیث اور فقہ حدیث کا جتنا مواد ملتا ہے، اگر وہ سب علیٰحدہ جمع کر دیا جائے تو وہ ایک بہت بڑی تصنیف اور ایک بڑا قیمتی ذخیرہ ہوگا، خصوصیت کے ساتھ موضوعات پر ان کی جیسی بے لاگ اور محققانہ رائیں ان کی کتابوں میں ملتی ہیں، اس کا کہیں اور ملنا مشکل ہے، اس سلسلہ میں "منہاج السنۃ" میں جو مواد ملتا ہے، اور بیسیوں مشہور، متداول حدیثوں پر انھوں نے جو کلام کیا ہے، وہ بڑا کارآمد اور نادر ذخیرہ ہے۔

اصولِ فقہ

اصولِ فقہ ان کا ایک پسندیدہ اور ذوقی موضوع تھا، جس میں ان کو ملکۂ راسخہ حاصل ہوگیا تھا، اور جس میں وہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، ان کی کوئی تصنیف ان اصولی مباحث سے خالی نہیں "اقتضاء الصراط المستقیم" اور ان کے فتاویٰ میں اس کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اور بعض مستقل رسائل مثلاً رسالۃ القیاس،

[1] یہ "تفسیر ابن تیمیہ" کے نام سے مطبع قیمہ بمبئی میں چھپ چکی ہے۔

"منہاج الوصول الی علم الاصول" وغیرہ بھی یادگار ہیں۔

علم کلام

امام ابن تیمیہ کی تصنیفات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو شاید علم کلام و عقائد ان کی تحریروں کے پورے نصف حصہ پر مشتمل ہوگا، یا دو ثلث حصوں پر اس موضوع پر ان کے وہ رسائل جو مختلف مقامات اور شہروں کے نام پر معنون ہیں[1]، مثلاً شرح اصبہانیہ، رسالہ حمویہ، تدمریہ، واسطیہ، کیلانیہ، بغدادیہ، ازہریہ وغیرہ وغیرہ اس موضوع پر ان کے اصلی خیالات، قوتِ استدلال، حمیتِ دینی، اور ان کے علم و ذہانت کا مظہر ہیں۔

فقہ

ان کے زمانہ میں ہر مذہب کی فقہ اتنی مدوّن ہو چکی تھی کہ اس میں نیا اضافہ بہت مشکل تھا، پھر بھی انھوں نے بکثرت مسائل و احکام پر مجتہدانہ نظر ڈالی ہے اور کتاب و سنّت، اجماع و قیاس اور اصول فقہ ..... کی روشنی میں استنباط و اجتہاد سے کام لیا ہے، فقہ و حدیث میں تطبیق کی کوشش کی، اور فقہی آراء و جزئیات کو صحیح احادیث کے تابع بنانے کی کوشش کی، نئے پیش آنے والے مسائل و حالات اور نئی ضروریات کے لئے استنباط و اجتہاد سے کام لیا، جس طرح ہر مذہب کے فقہاء اور قضاۃ ہر عصر میں نئے مسائل پر اجتہاد و استنباط سے کام لیتے رہے تھے، اسی طرح امام ابن تیمیہ نے بھی (جن کے متعلق بعض اہلِ نظر کا خیال ہے کہ ان میں شرائط اجتہاد جمع تھے) ان نئے مسائل پر اجتہاد سے کام لیا، اور اپنے فتاوی اور اختیارات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا، یہ ذخیرہ فتاوی ابن تیمیہ کی چار ضخیم جلدوں میں محفوظ ہے، اور نہ صرف فقہی مسائل و احکام کا بلکہ بہت سے علمی مسائل و اصولی

---

[1] عام طور پر جس شہر سے کوئی استفتاء آتا تھا، اسی شہر پر اس رسالہ کا نام رکھ دیا جاتا تھا۔

بحثوں کا ایک بڑا قیمتی و نادر ذخیرہ ہے۔[1]

امام ابن تیمیہ کا اثر بعد کی صدیوں پر

اس عظیم علمی کارنامہ کے ساتھ جس میں وسعت بھی تھی اور عمق بھی تھا، اور جس میں نقل و عقل دوش بدوش ہیں، انھوں نے علوم شریعت کی تجدید کی خدمت انجام دی اور فکر اسلامی پر جو جمود و اضمحلال طاری ہونے لگا تھا، اس کو دور کیا نئی علمی راہیں اور نئے فکری دروازے کھولے، اور تصنیفات و مباحث کا ایسا علمی ذخیرہ چھوڑا جس کے مطالعہ سے ذہن میں وسعت، طبیعت میں جولانی اور فکر میں تحریک و نشاط پیدا ہوتا ہے، اور جس کے اثر سے ہر دور میں اچھے مصنّف، بلند خیال مفکّر، پرجوش مصلح اور مخلص داعی پیدا ہوتے رہے، اس فکری و اصلاحی تسلسل و حرکت میں جو آٹھویں صدی کے بعد سے نظر آتی ہے، بلاشبہہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نمایاں حصہ ہے اور وہ علوم و افکار اسلامیہ کے مجدّدین کبار میں شمار ہونے کے قابل ہیں، خصوصیت کے ساتھ بارہویں صدی ہجری سے عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں جو اصلاحی و فکری و علمی تحریکیں پیدا ہوئیں، ان کے ماخذوں میں ایک بڑا ماخذ اور محرک امام ابن تیمیہ کی تصنیفات ہیں۔

---

[1] یہ مجموعۂ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے نام سے شیخ فرج اللہ زکی کردی کے اہتمام سے ۱۳۲۶ھ میں مصر میں چار حصوں میں شائع ہوا ہے، مجموعی صفحات ۱۵۸۶ ہیں، چوتھے حصہ کے اخیر میں الاختیارات العلمیّہ کے نام سے کتاب ہے جس میں ان کے اختیارات و ترجیحات کو جمع کر دیا گیا ہے، فتاوی کا پانچواں حصہ عقائد و علم کلام کے مسائل و رسائل سے متعلق ہے، حکومت سعودیہ کی طرف سے "فتاوی ابن تیمیہ" کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی حیثیت ایک مستقل کتبخانہ اور دائرۃ المعارف کی ہے۔

فکرِ اسلامی کا احیاء

عقائد کا ماخذ کتاب و سنت

عقائد و دینی حقائق کا صحیح ماخذ

امام ابن تیمیہ کا ایک مستقل تجدیدی کارنامہ (جو شاید ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کا امتیازی کام ہے) یہ ہے کہ انھوں نے فکرِ اسلامی کا احیاء کیا، اسلام کا دوسرے نظامہائے فکر کے مقابلہ میں امتیاز یہ ہے کہ اس کی بنیاد وحی و نبوتِ محمدی پر ہے، اس کے عقائد و حقائق قیاس، تجربے، ظن و تخمین، اور انسانی ذہانت اور بحث و جدال پر مبنی نہیں، بلکہ اللہ تعالےٰ کی تعلیم اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ پر مبنی ہیں، پیغمبر نے خدا کی ذات و صفات و افعال، عالم کی ابتداء و انتہاء اور دنیا کے آغاز و انجام، معاد اور اعمال کے خواص و نتائج اور دوسرے مابعد الطبیعیاتی مسائل کے متعلق جن کا دین سے تعلق ہے جو کچھ اور جتنا کچھ کہہ دیا وہی عقائد ہیں اور وہی حقائق ہیں، اور وحی و نبوت کے سوا درحقیقت ان کے معلوم کرنے کا پھر ان پر یقین کرنے کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں، اس لئے کہ تمام معلومات اور حقائق کا ذریعۂ علم مبادی اولیہ ہی ہوتے ہیں، اور ان حقائق دینیہ و غیبیہ کے مبادی اولیہ ہی کسی کو حاصل نہیں، کسی نئی چیز کے علم کا ذریعہ ہی یہ ہے کہ معلومات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ مجہول تک رسائی ہو جائے، لیکن جس طرح ہم کو طبعیات و مادّیات کے معلومات اوّلیہ حاصل ہیں، ان غیبی و دینی حقائق کے ابتدائی معلومات و مقدمات حاصل نہیں، اللہ کی ذات و صفات حواس و عقل دونوں سے ماوراء ہیں، اور اس کے بارے میں انسان کو کوئی تجربہ و مشاہدہ حاصل نہیں، اور

نہ یہاں قیاس کے لئے کوئی بنیاد ہے "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ" اس لئے اس بارہ میں سوائے اس کے کہ انسانوں کے اس گروہ پر اعتماد کیا جائے جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنی ذات وصفات کا علم ویقین خود بخشا ہے، اور روشنی وہدایت عطا کی ہے، کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، اور ہمیں اس کے مقابلہ میں انکار وبحث کا کوئی حق نہیں، اسی حقیقت کو قرآن مجید میں ایک پیغمبر کی زبان سے اس طرح بیان کیا گیا ہے "قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰنِ" (کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں بحث وجدال کرتے ہو، حالانکہ اللہ تعالےٰ مجھے اس بارے میں راستہ پر لگا چکا ہے)۔

فلسفہ کی سعی لاحاصل

یہ ایک ایسی واضح اور روشن حقیقت تھی کہ جس کی موجودگی میں فلسفہ کو ذات وصفاتِ الٰہی کے بارے میں کسی دردسری کی ضرورت نہ تھی، لیکن یہ علم انسانی کی تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ کئی ہزار برس تک فلسفہ نے اس شغل لاحاصل کو جاری رکھا، اور اپنی بہترین ذہانتیں اور قوتیں ایک ایسے موضوع پر صرف کیں جس کے متعلق خود اس کو اعتراف ہے کہ اس کو اس کے مبادی ومقدمات بھی حاصل نہیں تھے اور اس کے بارے میں اس کے پاس یقین حاصل کرنے اور قطعی رائے قائم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، پھر اس نے اس بارے میں ایسی تدقیق وتفصیل اور ایسی بے تکلفی سے کام لیا جو علمائے لغت واشتقاق کسی لفظ کے بارے میں اور علمائے صرف ونحو تصریف وترکیب میں برتتے ہیں، بلکہ ماہرین علم الکیمیا ادویہ ونباتات کے بارے میں کرتے ہیں، اور مباحث وتفصیلات کا اتنا انبار اکٹھا کر دیا اور ایسی بال کی کھال نکالی کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری بحث کسی ایسی محسوس ومرئی ہستی کے بارے میں ہو رہی ہے، جو بالکل ان کے تصرّف اور دسترس میں ہے۔

متکلّمین کا تفلسف

اس سے زیادہ عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ متکلمین اسلام نے جو فلسفہ کے رد کے لئے اور اسلام کی

مدافعت کے لئے کھڑے ہوئے تھے، فلسفہ کی انہی اصطلاحات ومفروضات کو تسلیم کر لیا اور خدا کی ذات وصفات کے متعلق ایسے وثوق وتحکّم اور تفصیل وتدقیق سے بحث شروع کر دی گویا وہ بھی کسی محسوس ومشاہد ہستی اور کسی طبعی مسئلہ کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، وہ فلسفہ کی تردید کے لئے نکلے تھے لیکن وہ بھی فلسفہ کے مفروضات اور اصطلاحات کے جنگل میں گم ہو گئے، سوال وجواب وبحث ومباحثہ کے جوش میں ان کو یہ خیال نہیں رہا کہ وہ فلسفہ کو اس کی بنیادی غلطی پر سرزنش کریں کہ وہ ایک ایسے مسئلہ وموضوع سے بحث کر رہا ہے جس کے مبادی ومقدمات اور اس پر بحث کرنے کی استعداد واستحقاق حاصل نہیں اور وہ فلاسفہ سے یہ کہیں کہ تمہارے بحث ونظر کا میدان صرف ریاضیات وطبعیات ہے، تم کو اپنی بحث ونظر کو اسی میدان کے اندر محدود رکھنا چاہئے، الٰہیات میں تمہاری مداخلت اپنے حدود سے تجاوز اور "دخل در معقولات" ہے اور وہ قرآن کے حکیمانہ وبلیغ الفاظ میں فلاسفہ کو مخاطب کر کے کہیں :-

هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ	سنتے بھی ہو تم جھگڑ چکے ایسی باتوں میں جس کا تم کو
فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ	(تھوڑا بہت) علم تھا، پھر اب کیوں جھگڑا کرتے
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝	ہو، ایسی باتوں میں جس کا تم کو کچھ بھی تو علم نہیں، اور
(آل عمران - ٦٦)	اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

قرونِ متاخرہ میں اسلامی فکر کا انحطاط

پچھلی صدیوں میں تو اسلامی فکر کے انحطاط کا یہ عالم تھا کہ خدا کی ہستی، عالم کے حدوث، توحید، معاد تمام بنیادی عقائد کے ثبوت کے لئے ان ہی دلائل اور ترتیب مقدمات کو اصل قرار دے دیا گیا تھا، جو متکلمین نے ترتیب دیئے تھے اور جن کی بنیاد فلسفہ پر تھی، محدثین وفقہاء کے ایک چھوٹے سے گروہ کو چھوڑ کر عام طور پر متکلمین ونُظّار عقل کو معیار قرار دیتے تھے اور کتاب وسنت کو عقائد واحکام کا ماخذ بنانے کے بجائے

متکلمین کی کتابوں کو عقائد کا ماخذ بناتے تھے، اور فلسفہ کے اعتراضات سے بچنے کے لئے، یا فلسفہ کے بعض ثابت کئے ہوئے اصول کو قائم رکھنے کے لئے اور دین کو ان کے مطابق ثابت کرنے کے لئے وہ آیات واحادیث میں تاویل سے کام لیتے تھے، باوجود فلسفہ کی تردید کے ان پر فلسفہ کا اتنا رعب طاری تھا کہ وہ بجائے فلسفہ کے انکار اور اپنے علم کلام میں تبدیلی کر دینے کے آیات واحادیث کی تفسیر وتشریح میں تاویل وتوجیہ سے کام لیتے امام ابن تیمیہ اسی ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حالت یہ ہے کہ ہر فریق نے اپنے لئے انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم کے بارے میں ایک قانون بنا رکھا ہے، جس چیز کو ان کی عقول نے تسلیم کر لیا ہے اس کو وہ اصل قرار دیتے ہیں جس پر ان کو اعتقاد واعتماد ہے، اور جس کو انبیاء علیہم السلام لائے اس کو تابع قرار دیتے ہیں پس جتنا حصہ ان کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اس کو قبول کرتے ہیں اور جو اس کے مخالف ہوتا ہے اس کو قبول نہیں کرتے"[1]

ان متکلمانہ عقائد ومباحث کو اصل ومعیار قرار دینے کے بعد اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ ان مباحث میں بڑے بلند اور عمیق علوم اور بڑے حکم ومعارف ہیں، ایک کشمکش یہ پیش آئی تھی کہ اگر یہ اعلیٰ علوم ومعارف ہیں تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم وصحابۂ کرام کا کلام ان سے کیوں خالی ہے اور ان کے یہاں یہ تفصیلات وتدقیقات کیوں نہیں ہیں؟ جو لوگ فلسفہ اور علم کلام پر پورا ایمان رکھتے تھے، اور ان کا دماغ اس سے پورے طور پر مرعوب ومسحور تھا، وہ کبھی صاف صاف اور کبھی دبی زبان سے یہ کہہ دیتے کہ وہ زمانہ ابتدائی زمانہ تھا، اس زمانہ کے لوگ سیدھے سادھے لوگ تھے، ان کو ان حقائق اور ان گہرے علوم کی خبر نہیں تھی، جو لوگ فلسفہ کی عظمت کے بھی قائل تھے، اور صحابۂ کرام کی عظمت کے بھی معترف تھے، وہ ایک تحیّر اور کشمکش کی حالت میں تھے، اور ان سے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں بن پڑتا تھا، امام ابن تیمیہ ان مختلف گروہوں کی ذہنی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ علم کلام کی یہ بحثیں اصول دین پر مشتمل ہیں، اور ان کے اندر علوم کلیہ،

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصۂ اول ص۳

معارفِ الٰہیہ حقیقی حکمت اور بنیادی فلسفہ ہے، ان میں سے بہت سے لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اصولِ دین سے واقف نہیں تھے، جنھوں نے بہت رعایت کی، انھوں نے یہ کہا کہ آپ واقف تو تھے لیکن آپ نے ان اصول کو بیان نہیں کیا، جن کے دل میں نبیؐ کا احترام ہے، وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ و تابعین ان اصول سے واقف نہیں تھے، جن کے دلوں میں صحابہؓ و تابعین کی بھی عظمت ہے، اور ان متکلمین و فلاسفہ کے اقوال کی بھی، وہ ایک تحیر و کشمکش کی حالت میں ہیں، اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کہ ان بزرگواروں نے ان امور و مسائل میں کیوں کلام نہیں کیا، جو افضل العلوم ہیں، اور جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں، اور آپ کی عظمت بھی ان کے دل میں ہے، ان کو یہ بڑا اشکال معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دین کے ان اصولی مسائل کی تشریح و تفصیل کیوں نہیں فرمائی، حالانکہ دوسرے مسائل کے مقابلہ میں لوگوں کو ان کی ضرورت زیادہ ہے"[1]

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ فلسفہ و علم کلام کے ان پرستاروں نے اللہ اور اس کے رسول کے قول کو مجمل قرار دیا، جس سے کوئی علم و ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی، اور اپنے متشابہ کلام کو محکم، اور اللہ اور اس کے رسول کے محکم کلام کو متشابہ قرار دیا۔[2]

عقل کی تعظیم و تقدیس میں مبالغہ

فلاسفہ اور متکلمین دونوں نے مل کر صدیوں عقل کا ایسا آوازہ بلند کیا اور ذات و صفات کے مسائل میں اس کو اس طرح حکم و میزان قرار دیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان مسائل میں اسی طرح فیصلہ کرنے کی مجاز ہے جیسے محسوسات میں ہمارے حواس خمسہ اور عملیات میں تجربہ و استقراء، اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ عقل شریعت کے ثبوت کے لئے خواہ شرعیات ہوں، خواہ فقہیات، بنیادِ دین گئی، اسلام کی ان چھ صدیوں میں کسی مفکر اور عالم نے عقل کی اس غیر محدود فرمانروائی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی جرأت نہیں کی، حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفہ کے حصۂ الٰہیات کے

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصۂ اول ص ۱۲ [2] ایضاً ص ۱۶۴

خلاف قلم اٹھایا، اور اس کو اپنے طنز و تحقیر کا نشانہ بنایا، لیکن عقل کی اس مطلق العنان سلطنت اور اس کے دخل در معقولات کے خلاف انھوں نے بھی کوئی مؤثر آواز بلند نہیں کی، امام ابن تیمیہ (ہمارے علم میں) پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس صورتِ حال کے خلاف بلند آہنگی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی اور پوری جرأت کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ عقائد و حقائق کا اصل ماخذ وحی و نبوت اور کتاب و سنت ہے عقل ان کی مؤید اور مصدّق تو ہے لیکن ان کے ثبوت کی بنیاد نہیں وہ ایک جگہ صاف لکھتے ہیں:-

انّ العقل لیس اصلاً لثبوتِ الشرع فی	عقل فی نفسہ شریعت کے ثبوت کے لئے اصل کی حیثیت نہیں
نفسہ ولا معطیاً لہ صفۃ لم تکن لہ ولا	رکھتی، اور نہ اس کو کوئی ایسی صفت بخشتی ہے جو اس کو
مفیداً لہ صفۃ کمال[1]	پہلے سے حاصل نہ تھی اور نہ اس کو کمال کی صفت عطا کرتی ہے

عقل کا منصب و مقام

ان کا کہنا یہ ہے کہ عقل صرف معرّف و رہنما ہے، اس کا کام یہ ہے کہ رسول کی صداقت و عصمت کے اقرار و اعتراف تک پہنچا دے، پھر سبکدوش ہو جائے عقل یہ ثابت کر دیتی ہے کہ رسول جو کچھ اطلاع دے اس کی تصدیق اور جو کچھ حکم دے اس میں اس کی اطاعت واجب ہے، وہ رسول کی صداقت پر عمومی اور مطلق حیثیت سے دلالت کرتی ہے ان کے نزدیک اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی عامی شخص کسی ناواقف کو شہر کے مفتی کے پاس پہنچا دے اور بتلا دے کہ یہ عالم و مفتی ہے، پھر اگر اس عامی رہنما اور اس مفتی کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو مستفتی کا بھی فرض ہوگا کہ وہ مفتی کے قول کو ترجیح دے اور اس عامی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ میں نے ہی تو رہنمائی کی ہے، اگر میں رہنمائی نہ کرتا تو تم کو اس مفتی تک رسائی کیسے ہوتی؟[2] وہ لکھتے ہیں کہ رسالت کے علم کے بعد عقل کا کام ہے کہ وہ رسول پر اعتماد اور اس کی اطاعت کرے جس طرح ہر فن میں صاحبِ فن کی تقلید کی جاتی ہے،

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول۔ حصۂ اول ص۴۶ [2] ایضاً ص۷

اور بے چوں وچرا اس کے مشورہ پر عمل کیا جاتا ہے اور اس کے قول کو قولِ فیصل سمجھا جاتا ہے اسی طرح سے امورِ غیبیہ احکام وشرائع اور مابعد الطبیعات میں رسول سند کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کا قول قولِ فیصل ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"جب کسی شخص کو عقل سے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص رسول ہے اور اس کے نزدیک یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی چیز کی خبر دی ہے اور اس کی عقل اس میں کوئی اشکال پیش کرے تو اس کی عقل ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ یہ مختلف فیہ چیز ایسی ہستی پر محوّل کرے، جو اس کے مقابلہ میں اس کا زیادہ علم رکھتی ہے، اور اپنی رائے کو اس کے قول پر مقدم نہ رکھے، اور یہ سمجھے کہ اس کی عقل اس کے مقابلہ میں قاصر اور ضعیف ہے، اور اس ہستی کو اللہ تعالیٰ کا اور اس کے اسماء وصفات کا اور یوم آخرت کا علم زیادہ ہے، جو فرق اس عامی شخص اور ایک پیغمبر میں ہے، وہ فرق اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے جو عوام اور علمائے طب میں ہے، پس جب وہ اپنی عقل کے بموجب ایک یہودی طبیب کی بھی اطاعت کرتا ہے، اور غذا شربت ضماد (لیپ) اور مسہلات وغیرہ کی جو مقدار اور ترکیب تجویز کر دیتا ہے تو باوجود تکلیف اور مشقت کے وہ اس کی تعمیل کرتا ہے محض یہ سمجھ کر کہ یہ طبیب اپنے فن کا مجھ سے زیادہ واقف ہے اگر میں اس پر اعتماد کروں گا اور اس کے مشورہ کی تعمیل کروں گا تو صحت کی امید ہے، باوجود اس کے کہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اطباء سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، اور بہت سے لوگوں کو طبیبوں کی تجویز اور معالجہ سے صحت بھی نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات یہی علاج موت کا سبب بن جاتا ہے، اس کے باوجود وہ اس کا قول قبول کرتا ہے، اور اس کی تقلید کرتا ہے، خواہ اس کا گمان اور اجتہاد طبیب کی تجویز کے مخالف ہو اس سے سمجھنا چاہئے کہ پیغمبروں کے مقابلہ میں مخلوق کی حیثیت کیا ہے پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خدا کے پیغمبر صادق القول ہوتے ہیں اور ان کو بھی صحیح اطلاع دی جاتی ہے یہ ممکن نہیں کہ ان کی اطلاع خلاف واقعہ ہو اور جو لوگ محض اپنی عقل کی بنا پر ان کے اقوال کا مقابلہ کرتے ہیں ان کی جہالت اور ضلالت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔"[1]

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول۔ حصۂ اول صنہ ۸

رسول پر بلا شرط ایمان ضروری ہے

جو لوگ عقلیات اور فلسفہ سے متاثر تھے ان کی ذہنی ساخت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ شریعت کی جو بات عقل اور اصولِ فلسفہ کے مطابق ہوتی اس کو ان کا ذہن قبول کرتا اور جو ان کے اِن اصول و مسلمات کے خلاف ہوتی، اس کے قبول کرنے سے ان کا ذہن قاصر رہتا، اور اس میں ہزاروں الجھنیں محسوس کرتے، ان میں سے جو لوگ بیباک اور جری ہوتے وہ صاف انکار کر دیتے، اور کہتے کہ شریعت کا مطابقِ عقل ہونا ضروری ہے، یہ بات چونکہ عقل کے خلاف ہے، اس لئے قابلِ قبول نہیں، جو لوگ اس درجہ جری نہ ہوتے، وہ اس کی توجیہ کرتے اور بعید سے بعید تاویل سے ان کو باک نہ ہوتا، امام ابن تیمیہ نے جا بجا یہ ثابت کیا ہے کہ رسول پر بلا شرط ایمان ضروری ہے، اور رسول کی صحیح حیثیت و منصب یہی ہے کہ اس پر غیر مشروط طریقہ پر ایمان لایا جائے، اور درحقیقت اسی کا نام ایمان ہے، مشروط تصدیق کا نام شریعت کی اصطلاح میں ایمان ہی نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

ففی الجملۃ لا یکون الرجل مؤمنا حتّٰی یؤمن بالرسول ایمانا جازما لیس مشروطاً بعدم معارض فمتیٰ قال أومن بخبرہ اِلّا ان یظھر لہ معارض یدفع خبرہ لم یکن مؤمِنًا بہٖ فھٰذا اصل عظیم تجب معرفتہ[1]	خلاصہ یہ ہے کہ انسان اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ رسول پر ایسا قطعی ایمان نہ لائے جس کے ساتھ کسی معارض کے نہ ہونے کی بھی شرط نہ ہو، جب وہ شخص یہ کہے گا کہ میں رسول کی اطلاع پر اس وقت تک کے لئے ایمان لاتا ہوں جب تک کہ کوئی ایسا معارض ظاہر نہ ہو، جو اس کی اطلاع کی تردید کر دے تو وہ شخص مومن نہیں ہوگا، یہ ایک بہت بڑا اصول ہے جس کا جاننا ضروری ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول حصہ اول ص۱۰۱

"دین اسلام سے یہ بات قطعی اور بدیہی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مخلوق پر رسول کی ایسی تصدیق و ایمان واجب ہے جو قطعی اور عمومی ہو جس میں کوئی شرط اور قید نہ ہو اور یہ کہ اس کی ہر اطلاع کی تصدیق کی جائے اور اس کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے اس کے خلاف جو بات بھی ہو گی وہ باطل ہو گی، جو شخص رسول کی اس بات کی تو تصدیق کرتا ہے جس کو اس کی عقل قبول کرتی ہے، اور اس کی اس اطلاع کو رد کر دیتا ہے، جو اس کی رائے اور عقل کے خلاف ہوتی ہے، اور رسول کی اطلاعات پر اپنی عقل کو مقدم رکھتا ہے، اور یہ بھی کہے جاتا ہے کہ میں رسول کو سچا جانتا ہوں، تو وہ متناقض باتیں کرتا ہے، اور فاسد العقل اور ملحد ہے اور جو شخص کہتا ہے کہ میں اس وقت تک رسول کی اطلاع کی تصدیق نہ کروں گا جب تک کہ میں اس کو اپنی عقل سے سمجھ نہ لوں تو اس کا کفر کھلا ہوا ہے۔"[1]

عقل کے ہوائی قلعے

امام ابن تیمیہ اس کے بعد مدعیانِ عقل کے اس دعوی کا بھی جائزہ لیتے ہیں کہ عقل و نقل میں اکثر تعارض و تضاد ہوتا ہے، اور پیغمبروں نے جن چیزوں کو عقائد و حقائق کے طور پر پیش کیا ہے، وہ بعض اوقات صریح عقل و ہدایت کے خلاف ہوتے ہیں اور ان حقائق و مسلّمات سے متصادم ہوتے ہیں، جو ہزاروں برس کے غور و فکر کا نتیجہ اور فلسفہ کی بنیاد ہیں، وہ ثابت کرتے ہیں کہ جن عقلیات کو پیغمبروں کی اطلاعات اور کتاب و سنت کے نصوص کا معارض بتایا جاتا ہے وہ اکثر محض توہمات ہیں، اور غور کرنے کے بعد عقل کے ہوائی قلعے ثابت ہوتے ہیں، اگر ان کی علمی تنقید اور احتساب کیا جائے اور ان کو قریب سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ محض لفّاظی اور ہوا بندی تھی، ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"بہت سے وہ عقلیات جن کا یہ مدعیانِ عقل دعوی کرتے ہیں، اور ان کو نصوص کا مخالف بتلاتے ہیں، تنقید اور امتحان کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ ان میں کوئی حقیقت نہیں تھی، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچوں کو یا بچوں کی طرح ناواقف آدمی کو خالی سوکھی ہوئی مشکیں ہلا ہلا کر اور بجا بجا کر ڈرائے، جب بھی معقولات پر پورا غور

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول، حصہ اول ص۱۰۱

کیا جاتا ہے، اور ان پر گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود رسول کی اطلاعات کی صداقت کے لئے دلائل و براہین کا کام دیتی ہیں اور یہ کہ اس کی اطلاعات سے جو کچھ لازم آتا ہے، وہ سب صحیح ہے، اور جس شخص نے اس کی نفی کی ہے، وہ محض حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر اور ظاہری اور باطنی طور پر مرعوب ہو کر، بالکل جیسے کوئی شخص معبودانِ باطل سے ڈر جائے اور سمجھے کہ وہ اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں یا کوئی شخص اپنے ضعفِ ایمان کی وجہ سے دشمنِ اسلام سے جو خود کمزور ہو، ہراساں زدہ اور سراسیمہ ہو جائے۔"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہ لوگ جو فلسفہ کے مہیب و پرشکوہ الفاظ سے ان کی حقیقت کے جانے بغیر مرعوب ہو گئے ہیں ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی نامرد دشمن سے محض ان کا لباس اور پوشاک دیکھ کر مرعوب ہو جائے اور اس کو ان کی حقیقت حال دریافت کرنے کی نوبت نہ آئے لیکن جو شخص ان کی حقیقت دریافت کرے گا وہ دیکھے گا کہ وہ خود انتہائی ضعیف و عاجز ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ	ہم جلد ہی ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں ہیبت
بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا۔[2]	کیونکہ انھوں نے شریک جانا اللہ کا جن کی اللہ نے کوئی
(آل عمران - ۱۵۱)	سند نہیں اتاری۔

اہلِ دانش کی بے دانشی

وہ کہتے ہیں کہ ان اقوال و تدقیقات پر غور کیا جائے جن پر ان کو بڑا ناز ہے اور جن کو انھوں نے الٰہیات کا نام دیا ہے، اور جن کو ان کے پیرو انبیاء علیہم السلام کے کلام کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں، نظر انصاف سے دیکھا جائے کیا اس میں اور دیوانوں کی بے سر و پا باتوں میں کچھ فرق معلوم ہوتا ہے:۔

---

[1] بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول، حصہ چہارم ص ۱۵۳ [2] ایضاً ص ۱۵۴

"صاحبِ عقل ان لوگوں کے کلام کو غور سے دیکھے جو بڑی مہارت اور تحقیق کے مدعی ہیں اور اپنی عقل و دانش سے انبیاء علیہم السلام کے کلام کو رد کرتے ہیں فلسفہ کی چوٹی پر پہونچ کر اور عقل و حکمت کے بلند ترین مقام سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو دیوانوں کی باتوں سے بالکل ملتی جلتی ہیں، جو صحیح و حق بات بداہتہً ثابت ہے اس کو رد کرتے ہیں اور جو بے بنیاد اور بے اصل بات جس کا ابطلان بالکل بدیہی اور ظاہر ہے اس کو اپنے تلبیس آمیز کلام سے مقبول بناتے ہیں[1]"

صریح عقل اور صحیح نقل میں کبھی تعارض نہیں ہوتا

لیکن امام ابن تیمیہ عقل کا پورا احترام کرتے ہیں، ان کے نزدیک قرآن مجید میں جا بجا عقل سے کام لینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کی گئی ہے، ان کے نزدیک صحیح عقل اور صحیح نقل میں کبھی تعارض نہیں ہو سکتا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے وسیع مطالعہ و طویل غور و فکر میں کبھی عقل و نقل میں تعارض و تضاد نہیں دیکھا، لیکن شرط یہ ہے کہ عقلِ سلیم ہو، اور نقل صحیح و محفوظ ہو، اس موضوع پر انھوں نے ایک مستقل ضخیم کتاب "بیان موافقۃ صریح المعقول لصحیح المنقول" تصنیف کی ہے[2] جس میں انھوں نے مفصّل و مدلل طریقہ پر ثابت کیا ہے کہ معقول و منقول میں پوری موافقت ہے اور جو باتیں وحی و نبوت کتاب و سنت سے ثابت ہو چکی ہیں صحیح و کامل عقل ان سب کی تصدیق کرتی ہے عقل ہمیشہ ان نصوص و منقولات کی تائید و تصدیق کرتی رہی، اور جب بالغ نظری اور دقّتِ نظر سے کام لیا جائے گا، عقل کو ان منقولات کی تائید و تصدیق ہی میں دیکھا جائے گا، وہ لکھتے ہیں:۔

"صحیح و واضح عقلی دلائل جن میں کوئی شک نہیں ہے بلکہ یقینی فطری علوم سب کے سب انبیاء علیہم السلام کی اطلاعات کے موافق ہیں، مخالف نہیں اور صحیح عقلی دلائل تمام تر نقل و روایت (سمع) کے مطابق ہیں ذرا بھی اس کے خلاف نہیں، الحمد للہ میں نے مختلف فرقوں کا کلام اور ان کے مسائل پر غور کیا ہے اور اسی بات کو صحیح پایا ہے[3]"

---

[1] ایضاً حصہ سوم ص۲۴۲ [2] یہ کتاب "منہاج السنۃ" کے حاشیہ پر چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ [3] حصہ اول ص۲۴۷

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"منقول صحیح کا کبھی معقول صریح معارض نہیں ہوتا، میں نے اختلافی مسائل میں بھی اس اصول کی تحقیق کی اور میں نے یہی دیکھا کہ صحیح و صریح نصوص کے خلاف جو کچھ بھی پیش کیا جاتا ہے، وہ محض فاسد شبہات ہوتے ہیں، جن کا بطلان عقل سے ثابت ہوتا ہے بلکہ عقل سے ان شبہات کے بالکل خلاف اور شرع کے بالکل موافق ثابت ہوتا ہے، میں نے بڑے بڑے اصولی مسائل توحید و صفات، مسائل قدر و نبوات وغیرہ کو بھی اس نظر سے دیکھا اور یہی پایا کہ جو صراحۃً عقل سے ثابت ہوتا ہے کبھی سمعیات و منقولات ان کے مخالف نہیں ہوتے، بلکہ وہ نقل و روایت جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صریح عقل کے خلاف ہے، تحقیق سے یا تو موضوع حدیث ثابت ہوتی ہے، یا اس کی روایت ضعیف ہوتی ہے، اس لئے وہ دلیل بنانے کے قابل نہیں ہوتی ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اُن چیزوں کی اطلاع نہیں دیتے، جو عقلاً محالات میں سے ہیں، بلکہ ان چیزوں کی اطلاع دیتے ہیں، جن میں عقل حیران و سرگشتہ ہوتی ہے، وہ اس چیز کی اطلاع نہیں دیتے جس کی عقل نفی کرتی ہے، بلکہ اس چیز کی اطلاع دیتے ہیں جس کی حقیقت سمجھنے سے عقل عاجز رہتی ہے۔[1]"

وہ دعویٰ سے کہتے ہیں (اور ان کا دعویٰ بڑا وزن رکھتا ہے) کہ ایک حدیث یا نقل بھی عقل کے مخالف نہیں، اور اگر ایسی کوئی حدیث ہے تو وہ اہلِ فن کے نزدیک ضعیف یا موضوع ہے۔

قرآن میں بہترین عقلی دلائل ہیں

ان کو متکلمین و فلاسفہ کے اس دعویٰ کے تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا صحیفہ ہے، جس کی بنیاد محض نقلیات و سمعیات پر ہے، انھوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں بہترین عقلی دلائل ہیں، اور دلائل ایسے محکم، مدلّل اور واضح الثبوت ہیں جن کو فلاسفہ اور متکلمین کے دلائل جو بحث و تنقید کے بعد تارِ عنکبوت ثابت ہوتے ہیں، پہنچ نہیں سکتے، وہ فرماتے ہیں :۔

---

[1] حصہ اول ص ۸۳

"اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے عقلی دلائل بیان فرمائے ہیں، جن کی اس علم میں ضرورت ہے، اور یہ فلاسفہ و متکلمین ان کا پورا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، یہ جن دلائل و نتائج کو پیش کرتے ہیں، قرآن مجید نے ان کا خلاصہ بہترین طریقہ پر پیش کر دیا ہے"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اثبات صانع اور اس کی صفات و افعال کی معرفت کے سلسلہ میں دنیا کے سامنے جو کچھ پیش کیا وہ صریح عقل کے مطابق ہے، اور عقلاء کی بڑی سے بڑی عقلی بلند پروازیوں سے بلند ہے، ان اگلے پچھلے فلاسفہ و متکلمین کو جن دلائل پر بڑا ناز ہے وہ قرآن مجید میں کہیں ضمناً آجاتے ہیں، لیکن یہ فلاسفہ حق و باطل کی تلبیس کے عادی ہیں، اس لئے اس کو سیدھے سیدھے طریقہ پر بیان نہیں کرتے"[2]

رسول کی تعلیم میں التباس نہیں

فلاسفہ و متکلمین اور ان کے ہمنواؤں کے گروہ میں بہت سے لوگ اس بات کے قائل تھے کہ رسول نے ذات و صفات کے بارے میں پوری تفصیل و تشریح سے کام نہیں لیا، بلکہ ان چیزوں کو مجمل و مبہم طریقہ پر بیان کیا گیا ہے، قرآن مجید کا بہت سا حصہ شرح کا محتاج ہے، اور خدا نے پچھلے دور میں متکلمین کو یہ توفیق دی کہ وہ اس کی شرح و تفصیل کریں اور عقائد و حقائق دینی کو مفصل و مدلل طریقہ پر امت کے سامنے پیش کریں، وہ کہتے ہیں کہ رسول کو بلاغ مبین کا حکم تھا، آپ نے ہر اس چیز کی تفصیل و تشریح کی جس کی تفصیل و تشریح دین کے لئے ضروری تھی، عقائد و اصول دین کی بنیادیں اور خدا کی ذات و صفات جس کے بغیر معرفت اور انسان کی سعادت و نجات ممکن نہیں، کیسے مجمل و مبہم چھوڑے جا سکتے تھے، جس کتاب کے سمجھنے اور سمجھ کر پڑھنے اور اس پر غور و تدبر کی جا بجا دعوت دی گئی ہے، وہ اس اجمال و ابہام کی حالت میں کیسے چھوڑی جا سکتی تھی، وہ لکھتے ہیں:۔

"رسول نے تبلیغ کا حق ادا کیا، اور مکمل و واضح طریقہ پر خدا کی بات پہنچائی، اور اس کے مراد و منشأ

---

[1] حصہ اول ص ۱۴۷ [2] حصہ سوم ص ۶۸

کو واضح کیا، قرآن و حدیث میں اگر کوئی لفظ ایسا ہے جس کے ظاہری معنی نہیں لئے جا سکتے تو یہ ضروری بات ہے کہ رسول نے دوسرے لفظوں سے اس کے معنی و مراد کی تعیین کی، یہ ممکن نہیں کہ آپ ایسے لفظ بولیں جس کا ظاہری مفہوم و مدلول باطل ہو، اور آپ اُس کی صحیح مراد بیان نہ کریں، اور یہ بات بھی کسی طرح عقل میں نہیں آتی کہ آپ لوگوں سے کلام کے اس مطلب کے سمجھنے کا مطالبہ کریں جس کی آپ نے ان سے تشریح نہ کی ہو اور جس کی رہنمائی نہ فرمائی ہو محض اس وجہ سے کہ لوگ اس کو اپنی عقل سے سمجھ سکتے ہیں، یہ حقیقت میں اس رسول پر بہت بڑا اعتراض ہے جس نے خدا کی بات بے کم و کاست پہنچائی"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے رسول کو بلاغ مبین کا حکم دیا، اور آپ سے بڑھ کر اپنے رب کا کوئی فرمانبردار اور تابعدار نہیں تھا، تو یہ ضروری بات ہے کہ آپ نے یہ بلاغ مبین پہونچایا، اس بلاغ مبین کے ساتھ آپ کے بیان میں التباس و تلبیس نہیں ہو سکتی، باقی جن آیات کے متعلق قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ متشابہات ہیں، جن کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا تو یہاں تاویل سے مراد تفسیر نہیں بلکہ ان کی حقیقت ان کے وقوع کی شکل اور ان کا مآل ہے"[2]

امام ابن تیمیہ کی دعوت اور ان کا کارنامہ

غرض یہ کہ امام ابن تیمیہ نے اس بات پر پورا زور دیا ہے کہ عقائد کا ماخذ وحی و نبوت اور کتاب و سنت کو بنایا جائے اور انہی کے نصوص کو اس بارے میں معیار کا درجہ دیا جائے، انھوں نے ساری عمر اس کی دعوت دی اور مشکل سے ان کی کوئی تصنیف اس سے خالی نظر آئے گی، اس طرح انھوں نے فکر اسلامی کو طاقت و تازگی بخشی، جو فلسفہ و علم کلام اور عجمی روح سے بہت کچھ مجروح و مضمحل ہو گئی تھی۔

---

[1] حصہ سوم ص۱ [2] حصہ اول ص۱۶۷ امام ابن تیمیہ نے اپنی مختلف تصنیفات میں تفصیل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ تاویل کے تین معنی ہیں، ایک اصطلاح قرآنی جس سے مراد حقیقت و مآل ہے، ایک اصطلاح متقدمین جس سے مراد تفسیر ہے، اور ایک اصطلاح متاخرین و متکلمین جس سے مراد کسی لفظ کے وہ معنی مراد لینا جو ظاہری طور پر نہ نکلتے ہوں کسی خاص وجہ سے۔

دورِ تقلید سے پہلے

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے پیشتر کسی ایک امام یا کسی ایک مذہب (فقہی) کی تقلید کا رواج نہیں ہوا تھا، لوگ کسی ایک عالم کی تقلید یا کسی ایک مذہب کی تعیین اور التزام کے بغیر عمل کرتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ شریعت پر عمل کر رہے ہیں، اور براہِ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر رہے ہیں، اسی طرح سے ضرورت کے وقت کسی معتبر عالم سے مسئلہ دریافت کر لیتے تھے، اور عمل کرتے تھے، چوتھی صدی میں بھی کسی ایک مذہب کی تقلیدِ خالص اور اس کے اصول و طریق پر فقہ حاصل کرنے اور فتویٰ دینے کا دستور عام نہیں تھا، شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:۔

"چوتھی صدی میں بھی امت کے دو طبقوں کا معاملہ الگ الگ تھا، عوام ان مسائل میں جو اجماعی ہیں اور جن میں مسلمانوں کے درمیان یا جمہور مجتہدین میں کوئی اختلاف نہیں صاحبِ شرع (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہی کی تقلید کرتے تھے، وہ وضو، غسل اور نماز و زکوٰۃ کا طریقہ اپنے والدین یا اپنے شہر کے اساتذہ و مربیوں سے سیکھ کر اسی کے مطابق چلتے رہتے تھے، اگر کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیش آتی تو اس کے بارے میں کسی مفتی سے جو ان کو میسر آتا، استفتاء کرتے تھے، اس میں کسی مذہب کی شرط نہ تھی۔

خواص میں سے جن کا اشتغال حدیثِ نبوی سے تھا، ان کو صحیح احادیث اور آثارِ صحابہ کی موجودگی

میں کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی، کوئی مشہور صحیح حدیث جس پر بعض فقہاء نے عمل کیا ہے، اور جس پر عمل نہ کرنے کا کسی کے پاس کوئی عذر نہیں، یا جمہور صحابہ و تابعین کے اقوال جو ایک دوسرے کے مؤید ہوتے تھے، ان کے لئے کافی تھے، اگر مسئلہ میں ان کو کوئی ایسی چیز نہ ملتی جس سے قلب مطمئن ہوتا، اس وجہ سے کہ روایات متعارض ہیں، یا ترجیح کی وجہ ظاہر نہیں ہے، یا اسی طرح کا کوئی اور اشکال پیش آتا تو فقہائے متقدمین میں سے کسی کے کلام کی طرف رجوع کر لیتے، اگر اس مسئلہ میں دو قول ملتے تو ان میں جو زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا، اس کو اختیار کرتے، خواہ وہ اہلِ مدینہ کا قول ہو، یا اہلِ کوفہ کا۔

جو ان میں سے اہلِ تخریج ہوتے، وہ ایسے مسئلہ میں جس میں کوئی صراحت نہ پاتے تخریج اور اجتہاد فی المذہب سے کام لیتے اور ان اہلِ تخریج کی ان مذاہب کی طرف نسبت کی جاتی (جس میں وہ تخریج سے کام لیتے) اور کسی کو شافعی اور کسی کو حنفی کہا جاتا، خود محدثین میں سے جس کا کسی مذہب کی طرف زیادہ میلان ہوتا، اور وہ اکثر مسائل میں اس سے اتفاق کرتا، ان مذاہب کی طرف نسبت کی جاتی چنانچہ نسائی اور بیہقی کو شافعی کہا جاتا ہے، اس وقت قضا و افتاء کے منصب پر انہی لوگوں کا تقرر ہوتا، جو مجتہد ہوتے، اور فقیہ اس کو کہا جاتا جو اجتہاد کی قابلیت رکھتا تھا۔"[1]

تقلید کی ابتداء اور اس کے اسباب

چوتھی صدی کے بعد سے کچھ تو علماء کے اختلافات اور بحث و مناظرہ کی وجہ سے کچھ ان کے دینی و اخلاقی معیار کے پست ہو جانے کی وجہ سے کچھ علمی انحطاط اور پست ہمتی اور کم محنتی کی وجہ سے اس کی ضرورت پیش آئی، اور اسی میں عافیت و حفاظت سمجھی گئی کہ پیشرو ائمہ مجتہدین اور مذاہب مدوّنہ کی تقلید اختیار کر لی جائے، اور معاصرین کے بجائے متقدمین کے فتوی پر عمل کیا جائے، لیکن عرصہ تک اس میں وہ تعیین و التزام اور تقلید شخصی کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول ص ۱۲۲ باب حکایت حال الناس قبل المأیۃ الرابعۃ و بعدہا۔

وہ پابندی نہیں پیدا ہوئی تھی، جو بعد کی صدیوں میں نظر آتی ہے، رفتہ رفتہ تعیین والتزام اور تقلید شخصی کو اختیار کیا گیا، لیکن اس کی حیثیت بھی تشریعی نہیں، بلکہ انتظامی تھی، انتشار اور اتباع ہویٰ سے بچانے کے لئے، نیز عملی سہولت کی بنا پر ایک مذہب کی تقلید عملاً رائج ہوگئی، اور ایسا ہونا ایک قدرتی امر اور واقعات کے عین مطابق تھا، خصوصاً تاتاری یورش کے بعد عالم اسلام پر جو عالمگیر فکری انحطاط اور علمی زوال طاری ہوا، اور ایسی بلند شخصیتوں کا عام فقدان ہوا، جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتی ہوں، اور فرقوں اور فتنوں کی گرم بازاری ہوئی تو اسی میں عافیت سمجھی گئی کہ جن مذاہب کا کتاب وسنت کے مطابق ہونا ثابت ہے، اور جو بحث ومباحثہ کے منازل طے کر چکے ہیں، اور ان کی تدوین مکمل ہو چکی ہے، ان پر عمل کیا جائے، یہ خصوصیات مذاہبِ اربعہ میں پورے طور پر پائی جاتی تھیں، اس لئے عام طور پر انہی کو اختیار کیا گیا۔

تقلید کی حیثیت

لیکن اس تقلید کی حیثیت بھی صرف یہ تھی کہ تقلید کرنے والا اس امام پر مذہب معیّن کی تقلید یہ سمجھ کر کرتا تھا کہ وہ دراصل کتاب وسنت پر عمل کر رہا ہے، اور صاحبِ شریعت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کر رہا ہے، امام اس کے اور پیغمبر کے درمیان اسی طرح واسطہ ہے، جیسے کوئی معاصر استاد، اس کی حیثیت محض ترجمان یا شارح کی ہے، مطاع یا شارع کی نہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کے الفاظ ہیں:۔

لایدین الابقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم	وہ مقلد صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کا پابند
ولایعتقد حلالاً الاما احلہ اللہ ورسولہ	ہے، حلال اسی کو سمجھتا ہے جس کو اللہ اور رسول حلال کہیں،
ولاحراماً الاما حرمہ اللہ ورسولہ لکن	اور حرام اسی کو مانتا ہے جس کو اللہ ور رسول حرام فرمائیں لیکن
لما لم یکن لہ علم بما قالہ النبی صلی اللہ علیہ	چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کا اس کو براہِ راست
وسلم ولابطریق الجمع بین المختلفات من	علم نہیں اور آپ سے جو مختلف حدیثیں روایت کی جاتی ہیں

کلامہ ولا بطریق الاستنباط من کلامہ اتبع عالماً راشداً علیٰ انہ مصیب فی ما یقول ویفتی ظاھراً متبع سُنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان خالف ما یظنّہ اقلع من ساعتہ من غیر جدال ولا اصرار۔[1]

ان میں تطبیق کی اس کو لیاقت نہیں اور نہ آپ کے کلام سے مسئلہ ثابت کرنے کا اس کو ملکہ ہے اس لئے اس نے ایک حقار شد عالم کی اس بنا پر پیروی کی ہے کہ وہ ظاہری طور پر صحیح فتویٰ دے رہا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پیرو ہے، اگر اس کے اس گمان کے خلاف نکلے گا تو وہ اسی وقت بغیر کسی بحث و اصرار کے اس فتوی اور مذہب کی پیروی سے ہٹ جائے گا (اور حدیث پر عمل کرے گا)۔

ظاہر ہے کہ اس طرح کی تقلید پر (جو محض سنت کی پیروی کی ایک عملی شکل ہے) کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا ایسے عامی آدمی کو اجتہاد یا استنباط مسائل کا مکلّف قرار دینا تکلیف مالا یطاق اور بداہت کا انکار ہے، اس طرح کی تقلید یا کسی غیر معین یا معین فقیہ یا مجتہد کی طرف رجوع کا دستور ہر زمانہ میں رہا ہے، یہ رجوع خواہ احیاناً ہو خواہ دائمی، قابلِ اعتراض نہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:۔

"استفتاء اور افتاء کا دستور مسلمانوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی سے چلا آرہا ہے، اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی معین شخص سے ہمیشہ استفتاء کرے، یا کبھی ایک سے کرے اور کبھی دوسرے سے کرے ایسی حالت میں کہ اس کے خیال میں وہی بات ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے (یعنی یہ کہ اصل پیروی جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے) اور اس میں کیا اشکال کی بات ہے جب کہ ہم کسی بھی فقیہ پر اس طرح کا ایمان نہیں رکھتے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کی طرف علم فقہ کی وحی کی ہے اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے اور یہ کہ وہ معصوم ہے ہم اگر ان فقہا یا ان ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کی اقتداء کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہے، اور اس کا قول یا تو کتاب و سنت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول ص۱۲۴

کے کسی صریح کلام پر مبنی ہوگا، یا ان دونوں میں سے مستنبط ہوگا، یا اس نے قرائن سے یہ سمجھا ہو گا کہ فلاں صورت میں جو حکم شرعی ہے، وہ فلاں علت کے ساتھ متعلق ہے، اور اس کا قلب اس پر مطمئن ہو گیا ہے اور اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہاں کہیں یہ علت پائی جائے وہاں حکم یہ ہوگا، اور یہ مسئلہ جس کو مجتہد نے قیاس کیا ہے، وہ اسی عموم کے تحت میں آتا ہے، تو درحقیقت سب کی نسبت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوئی لیکن بہر حال اس کے طرق میں کچھ ظنی چیزیں ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا، اور بات بالکل صراحتاً اور نصّاً ثابت ہوتی) تو کوئی صاحب ایمان کبھی کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا، اب اگر ہم کو رسول معصوم کی جن کی اطاعت ہم پر اللہ نے فرض کی ہے کوئی حدیث صحیح سند سے ایسی پہنچ جائے جو اس مذہب کے خلاف دلالت کرتی ہے، اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس (فقہ کے قیاس) کی پیروی کریں جو ظنی ہے اور ایک اندازہ پر مبنی ہے تو ہم سے زیادہ ظالم کون ہوگا اور کل روز قیامت ہم خدا کو کیا جواب دیں گے۔"[1]

پچھلی صدیوں کا غلو وانحراف

لیکن رفتہ رفتہ عوام میں جہالت نے اثر کیا، اور کہیں کہیں ائمہ کی حیثیت وسائط و وسائل کے بجائے مقصود اور ایک طرح سے شارع اور مطاع کی پیدا ہو گئی، لوگوں کو ان مذاہب سے بالذات دلچسپی اور ان کی اس درجہ عصبیت پیدا ہو گئی کہ وہ کسی حال میں ان کے ایک شوشہ یا نقطہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے، اس سلسلہ میں عوام تو زیادہ قابل الزام نہیں کہ انھوں نے ان مذاہب کو سنت کی پیروی سمجھ کر اختیار کیا تھا، اور ان کے لئے ترجیح کے اسباب معلوم کرنا اور ان کے مطابق ترک مذہب یا ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف انتقال مشکل بھی تھا، اور خطرناک بھی لیکن بہت سے علماء کی یہ حالت تھی کہ ان کو اگر اپنے امام یا مذہب کے کسی مسئلہ کا حدیث و سنت کے خلاف ہونا ثابت ہو جائے اور اس کا قطعی علم حاصل ہو جائے کہ اس مسئلہ میں اپنے امام کا مسئلہ مرجوح اور دوسرے امام یا مذہب کا مسئلہ راجح اور حدیث

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول ص ۱۲۵

وسنت کے مطابق ہے اور اپنے مذہب اور عمل کے خلاف کیسی ہی صحیح وصریح احادیث ملیں تب بھی وہ اس مسئلہ کو ترک کرنے اور احادیث پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ان کی طبیعت اس کے لئے منشرح نہیں ہوتی، ایسے ہی لوگوں کے متعلق ساتویں صدی کے مشہور شافعی عالم شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام لکھتے ہیں :۔

ومن العجيب العجيب ان الفقهاء المقلدين	حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض فقہائے مقلدین کو اپنے امام
يقف احدهم على ضعف ماخذ امامه بحيث	کی دلیل کے ایسے ضعف کا علم ہو جاتا ہے جس کا کوئی جواب
لايجد لضعفه مدفعا وهو مع ذلك يقلده	نہیں اور وہ اس کے باوجود اس مسئلہ میں اسی کی تقلید کرتے ہیں
فيه ويترك من شهد الكتاب والسنة	اور ان کا مذہب چھوڑ دیتے ہیں جن کی تائید میں کتاب وسنت
والأقيسة الصحيحة لمذهبهم جمودًا على	اور صحیح قیاسات ہیں محض اس لئے کہ ان کو امام کی تقلید سے
تقليد امامه بل يتحيل لدفع ظاهر الكتاب	انحراف گوارا نہیں بلکہ کتاب وسنت کے ظاہر مطلب کو دفع
والسنة ويتأولها بالتاويلات البعيدة	کرنے کے لئے وہ ہزار تدبیریں کرتے ہیں اور اپنے امام کی مدافعت
الباطلة نضالًا عن مقلده۔[1]	میں ہر طرح کی بعید اور بے بنیاد تاویلوں سے انکو احتراز نہیں ہوتا۔

اسی طرح سے عوام کی ایک جماعت تھی، جو اپنے امام کو معصوم عن الخطاء سمجھتی تھی، اور جس کے قلب میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ اس کو امام کی تقلید کسی حال میں نہیں چھوڑنا ہے حضرت شاہ ولی اللہ اسی طرح کے عوام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وفى من يكون عاميا ويقلد رجلا من الفقهاء	(ابن حزم کا یہ کہنا کہ تقلید حرام ہے) اس عامی کی تقلید کے
بعينه يرى انه يمتنع من مثله الخطا وان ما	بارے میں صحیح ہے جو کسی ایک معین فقیہ کی تقلید کرتا ہے اور
قاله هو الصواب البتة واضمر فى قلبه ان	اس کا اعتقاد ہے کہ خطا اس سے ناممکن ہے اور جو کچھ اس نے
لايترك تقليده وان ظهر الدليل على خلافه	کہہ دیا وہ مطلقاً و یقیناً صحیح ہے اور جس نے دل میں یہ عزم اور
وذلك ما رواه الترمذى عن عدى بن حاتم	فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امام یا عالم کی تقلید نہیں چھوڑے گا،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۴

انہ قال سمعتہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" قال انھم لم یکونوا یعبدونھم ولکنھم کانوا اذا احلوا لھم شیئًا استحلوہ واذا حرموا علیھم شیئًا حرموہ۔[1]

اگرچہ دلیل اس کے خلاف ثابت ہو جائے اسی طرح کی تقلید کے متعلق وہ حدیث وارد ہوئی ہے جو حضرت عدی بن حاتم نے روایت کی ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے (سورۂ توبہ کی) یہ آیت تلاوت فرمائی "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" (ان یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء ومشائخ کو خدا کو چھوڑ کر اربابًا من دون اللہ بنا لیا) آپ نے فرمایا کہ وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے ان کا معاملہ صرف یہ تھا کہ جس چیز کو یہ علماء ومشائخ حلال کر دیں اس کو حلال سمجھ لیتے تھے اور جس کو وہ حرام کر دیں اس کو حرام بنا لیتے تھے۔

امام ابن تیمیہ کی رائے تقلید واجتہاد کے بارے میں

اس طرح کی غیر مشروط وغیر مقید تقلید پر جو اتباع واطاعت رسول کے متوازی وبالمقابل ہے ہر زمانہ کے محققین اور علمائے راسخین نے اعتراض وانکار کیا ہے، وہ نہ تو ابن حزم اور بعض دوسرے غالی علماء کی طرح تقلید کی حرمت کے قائل ہیں نہ ایسی غیر مشروط تقلید کی اجازت دیتے ہیں جس میں اور رسول کی اتباع واطاعت میں کوئی فرق نہ ہو، ان علماء میں جن کی رائے اور تحریر اس مسئلہ میں بڑی متوازن اور معتدل ہے متقدمین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور متاخرین میں شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں، حافظ ابن تیمیہ ایک طرف تو اس واقعہ کا اظہار واقرار کرتے ہیں کہ عوام اور غیر مجتہد علماء کے لئے فقہاء ومجتہدین کی طرف رجوع کرنے اور ان کی تقلید سے چارہ نہیں اور یہ کہ ائمہ کی حیثیت وسائل اور وسائط کی ہے اور مذاہب کی پیروی ایک عملی ضرورت اور قدرتی امر ہے چنانچہ ایک جگہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صـ۱۲۴ ج ۱

تحریر فرماتے ہیں :۔

"اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حلال کیا اس کو حلال سمجھنا اور جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام سمجھنا، اور جس کو اللہ اور اس کے رسول نے واجب قرار دیا اس کے ساتھ واجب کا سا معاملہ کرنا تمام انس و جن پر واجب ہے اور ہر شخص پر ہر حال میں سرًّا و علانیۃً فرض ہے لیکن چونکہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے اس لئے لوگوں نے اس بارے میں ان لوگوں کی طرف رجوع کیا جو ان کو ان کی تعلیم دیں، اس لئے کہ وہ رسول کی تعلیم سے زیادہ واقف ہیں اور اس کی منشاء و مراد سے زیادہ باخبر ہیں پس ائمۂ مسلمین کی جن کی مسلمانوں نے پیروی کی ہے حیثیت وہی ہے، جو وسائل و رابطوں کی، اور ان رہنماؤں کی ہے، جو لوگوں کو رسول تک پہنچاتے ہیں، اس کے کلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اپنے اپنے اجتہاد و استطاعت کے مطابق آپ کی مراد سمجھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک عالم کو ایسا علم و فہم عطا فرماتا ہے، جو دوسرے عالم کو حاصل نہیں، اس دوسرے عالم کے پاس کسی دوسرے مسئلہ میں ایسا علم ہوتا ہے، جو پہلے عالم کے پاس نہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ۙ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا " (الانبیاء ۔ ۷۸ ۔ ۷۹)

دیکھو داؤد و سلیمان دونوں خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے، دونوں نے ایک مقدمہ میں فیصلہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک (حضرت سلیمانؑ) کو اس مقدمہ میں خصوصی فہم عطا فرمایا لیکن دونوں کی تعریف فرمائی، علماء بھی انبیائے کرام کے وارث ہیں، علماء کا اجتہاد احکام کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسے مختلف لوگ (اندھیرے یا کسی نامعلوم جگہ پر، دلائل) و قرائن سے کعبہ کی سمت متعین کریں اگر چار آدمی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے گروہ کے ساتھ ایک ایک سمت کی طرف نماز پڑھتا ہے اور ہر ایک یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ صحیح سمت یہ ہے جس طرف وہ نماز پڑھ رہا ہے تو چاروں کی نماز صحیح ہے اگرچہ جس نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی ہے وہ ایک ہی ہوگا، اور یہی وہ اجتہاد کرنے والا ہوگا، جس کو دُہرا اجر ملے گا جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے،

"اذا اجتهد الحاکم فاصاب فلہٗ اجران وان اجتہد فاخطأ فلہ اجر" (جب فیصلہ کرنے والا اجتہاد کرتا ہے، اور صحیح فیصلہ پر پہونچ جاتا ہے تو اس کو دو اجر ملتے ہیں، اور اگر اجتہاد کرتا ہے، اور اجتہاد میں غلطی واقع ہوتی ہے تو وہ ایک اجر سے محروم نہیں رہتا[1])

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ کسی خاص مذہب یا فقہ پر کسی شخص کا نشو و نما ہونا اور کسی خاص طریقہ کے مطابق عبادات و احکام شریعت کو بجا لانا ایک قدرتی امر ہے، اور ایسا قدیم زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے، لیکن مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے کو اصلاً خدا اور رسول کا مطیع و فرمانبردار سمجھے، اور اس کے لئے تیار رہے کہ جو کچھ کتاب و سنت سے ثابت ہو جائے گا، وہ بلا تردد اس کی پیروی اختیار کر لے گا:۔

"انسان عام طور پر اپنے والدین یا آقا یا اہلِ شہر کے دین و مذہب پر پلتا، اور بڑھتا ہے جیسے کہ بچہ دین کے بارے میں اپنے والدین، سرپرستوں اور ہم وطنوں کی پیروی کرتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ انسان جب بالغ ہو اور ہوش سنبھالے تو اس وقت اللہ اور رسول کی اطاعت کی پابندی اختیار کرے، خواہ وہ پابندی کسی چیز میں ہو، اور ان لوگوں میں نہ ہو جن کے متعلق ارشاد خداوندی ہے "وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا" (اور جب ان سے کہا گیا کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے، اس کی پیروی کرو تو انھوں نے صاف جواب دیا کہ نہیں ہم تو اسی راستہ پر چلتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے) پس جو شخص اللہ و رسول کی اطاعت کے بجائے اپنی اور اپنے والدین کی عادت اور اپنی قوم کے رسم و رواج کی پابندی کرے گا تو وہ ان ہی اہلِ جاہلیت میں سے ہوگا، جو وعیدِ خداوندی کے مستحق ہیں اسی طرح سے جس کے لئے کسی مسئلہ میں وہ صحیح راستہ اور حکم شرعی واضح ہو گیا جس کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول کو مبعوث فرمایا ہے، پھر اس نے اس کو قبول نہیں کیا، اور اپنی عادت کی طرف رجوع کیا تو وہ قابلِ مذمت اور مستحق عقاب ہے[2]"

ایسے عالم کے متعلق جو تحقیق و استدلال کی صلاحیت رکھتا ہو، اور یہ معلوم کر سکتا ہو کہ اس مسئلہ میں

---

[1] فتاویٰ شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۲۰۱-۲۰۲ [2] ایضاً ص ۲۰۲

راجح قول کس کا ہے، وہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

امّا القادر علی الاستدلال فقیل یحرم علیہ التقلید مطلقا، وقیل یجوز مطلقا وقیل یجوز عند الحاجۃ کما اذا ضاق الوقت عن الاستدلال وھٰذا القول اعدل۔[1]	جو شخص استدلال پر قدرت رکھتا ہو اس کے بارے میں ایک قول تو یہ ہے کہ اس کے لئے تقلید مطلقاً حرام ہے دوسرا قول یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے تیسرا قول یہ ہے کہ ضرورت کے وقت جائز ہے مثلاً وقت میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ وہ براہ راست تحقیق کر سکے، اور دلیل سے مسئلہ نکال سکے، اور یہی قول زیادہ منصفانہ اور قرین صواب ہے۔

البتہ جس کو اجتہاد تام پر قدرت حاصل ہو اس کے لئے ان کا فیصلہ ہے کہ اگر کسی جانب اس کو نصوص نظر آئیں اور ان نصوص کا مقابلہ کرنے اور ان کو دفع کرنے والی کوئی وجہ نہ ہو تو اس کو نصوص کی پیروی لازم ہے فرماتے ہیں:-

اما اذا قدر علی الاجتہاد التام الذی یعتقد معہ ان القول الآخر لیس معہ ما یدفع بہ النّص فھٰذا یجب علیہ اتباع النصوص، وان لم یفعل کان مُتبعًا للظنّ ومَا تھوَی الانفُسُ وکان من اکبر العصاۃ ِللّٰہ ولرسولہٖ۔[2]	البتہ اگر اس کو ایسے اجتہادِ تام پر قدرت حاصل ہے کہ اس کو یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ فلاں مسئلہ کی کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے نص کو دفع کیا جا سکے تو اس پر نصوص کی پیروی واجب ہے اگر ایسا نہ کرے گا (اور مخالف نص قیاس یا مسئلہ پر تقلیداً قائم رہے گا) تو وہ اِن یَّتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَھوَی الاَنفُسُ (وہ گمان اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں) کی وعید قرآنی میں آئے گا، اور اللہ و رسول کا بڑا نافرمان اور عاصی کہلائے گا۔)

---

[1] فتاویٰ شیخ الاسلام جلد ۲ صـ۳۸۴
[2] ایضاً صـ۳۸۵

امام ابن تیمیہ کا عمل اور ان کا فقہی مرتبہ

جہاں تک ان کے عمل کا تعلق ہے انھوں نے بیشتر مسائل میں امام احمد بن حنبل کے مذہب و اصول پر فتویٰ دیا ہے، اکثر مسائل میں ان کی رائے اور فتویٰ ائمۂ اربعہ یا ائمۂ ہدیٰ میں سے کسی نہ کسی امام کے اجتہاد و فتویٰ کے مطابق ہے، اور بعض مسائل میں انھوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے، اور کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں انھوں نے فتویٰ دیا ہے، ان سب صورتوں کا موازنہ کرتے ہوئے ان کے متعلق صحیح یہ ہے کہ وہ مذہب حنبلی کے مجتہد منتسب[۱] تھے[۲]۔

امام ابن تیمیہ کی دعوت اور اس کا اثر

امام ابن تیمیہ کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے جس طرح کتاب و سنت کو عقائد کا ماخذ بنانے کی پرزور دعوت دی اور خود کامیابی کے ساتھ اس پر عمل کیا، اسی طرح کتاب و سنت کو فقہیات و احکام کا ماخذ بنانے اور ان کو حق کا معیار قرار دینے کی طاقتور دعوت دی، اور اپنے زمانہ میں اس پر عمل کرکے دکھایا اور "فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ"[۳] پر عمل کا نمونہ پیش کیا، ان کی اس دعوت نے ان فقہی دائروں اور امت کے علمی حلقوں میں جن میں عرصہ سے نئے غور و فکر اور احکام و مسائل کے کتاب و سنت سے مقابلہ کرنے کا کام بند ہو گیا تھا اور اجتہاد و استنباط کا سلسلہ عرصہ سے مسدود تھا نئی علمی و فکری حرکت اور براہِ راست کتاب و سنت کی طرف رجوع کی تحریک پیدا ہوئی، اس طرح سے انھوں نے اس صحیح اسلامی فکر کا احیاء کیا جو قرونِ اولیٰ میں پائی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد تھی، اور وہ اپنے ان تمام علمی و عملی کارناموں کی بنا پر تاریخ اسلام کی ان چیدہ شخصیتوں میں سے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی تجدید و احیاء کا کام لیا "ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ"[۴]۔

---

[۱] مجتہد منتسب جو فروع و اصول میں مجتہد ہو لیکن اپنے طریق استدلال و طریق استنباط میں کسی امام کے ساتھ متفق ہو اور عام طور پر اس کے دائرہ سے نہ نکلتا ہو۔ [۲] امام ابن تیمیہ کی فقہ کی حیثیت اور ان کی مجتہدانہ درجہ کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو "ابن تیمیہ" از محمد ابو زہرہ صفحہ ۳۵۰-۴۵۲ [۳] النساء - ۵۹ [۴] الجمعہ - ۴

تلامذہ و منتسبین

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کے تلمیذ رشید اور جانشین

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تلامذہ و مستفیدین کی تعداد بہت بڑی ہے، ان کی مصروف اور داعیانہ زندگی اور ان کی موثر و بلند شخصیت کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ پر قوت کے ساتھ اثرانداز ہوں، اور ان کے گرد تلامذہ اور معتقدین کا ایک بڑا گروہ جمع ہو جائے، لیکن ان کے تلامذہ میں سے ان کے مایۂ ناز شاگرد اور ان کے علوم کے مرتّب و ناشر حافظ ابن قیم کو جو امتیاز و خصوصیت حاصل ہے، وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی، وہ زندگی بھر اپنے استاد کے شریک حال اور آخری لمحہ تک ان کے رفیق رہے، اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے مسلک و مشرب پر قائم اور ان کی محبت و عقیدت میں سرشار رہے، ان کی علمی خدمات، ان کی جلالتِ قدر اور ان کے کمالات اس کے مستحق ہیں کہ ان پر مستقل کتاب لکھی جائے، اور ان کی تصنیفات اور علمی تحقیقات پر مفصل تبصرہ ہو، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں، ان کے باکمال و نامور شاگرد حافظ ابنِ رجب حنبلی نے طبقات الحنابلہ کے ذیل میں ان کے جو کچھ حالات لکھدیئے ہیں، زیادہ تر وہی نقل کئے جاتے رہے ہیں، درحقیقت انھوں نے اپنی زندگی اور شخصیت کو اپنے استاذ اور شیخ کی زندگی میں ایسا گم کر دیا کہ ان کا کوئی مستقل وجود اور شخصیت نظر نہیں آتی، یہاں ان کے وہ حالاتِ زندگی درج کئے جاتے ہیں، جو مل سکے۔

نام ونسب

محمد نام، ابو عبداللہ کنیت، شمس الدین لقب، زُرعی نسبت، والد کا نام ابوبکر بن ایوب تھا، دمشق میں پیدا ہوئے، وہیں عمر گذری، اور وہیں مدفون ہوئے، ان کے والد مدرسہ جوزیہ کے مہتمم تھے، اس کی نسبت سے وہ ابن قیم الجوزیہ اور اختصاراً ابن القیمؒ کہلاتے ہیں، ابنِ رجب کا بیان ہے کہ وہ ۶۹۱ھ میں پیدا ہوئے الشہاب النابلسی العامر قاضی تقی الدین سلیمان، فاطمہ بنت جوہر، عیسیٰ بن مطعم، ابوبکر بن عبد الدائم، وغیرہ اساتذۂ وقت سے حدیث کی سماعت کی، اور مذہب حنبلی کی فقہ میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ کا کام شروع کیا، پھر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا دامن ایسا پکڑا کہ مرتے وقت تک ان سے جدا نہ ہوئے، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب حافظ ابنِ تیمیہ ۷۱۲ھ میں مصر سے واپس آئے تو حافظ ابن قیم نے ان کی ایسی صحبت اور رفاقت اختیار کی کہ انتقال تک ساتھ نہیں چھوڑا۔[1]

علمی مرتبہ

حافظ ابنِ رجب لکھتے ہیں کہ تمام علوم اسلامیہ میں دخل تھا، لیکن تفسیر میں ان کی نظیر نہیں تھی، اصول دین میں بھی وہ درجۂ کمال پر پہونچے ہوئے تھے، حدیث، فقہ حدیث اور دقائق استنباط میں ان کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا، فقہ اور اصول فقہ اور عربیت اور علم کلام میں بھی کمال حاصل تھا، علم سلوک اور اہلِ تصوف کے اشارات ودقائق پر بھی وسیع نظر تھی، میں نے قرآن وسنت کے معانی اور حقائق ایمانی کا ان سے بڑا عالم نہیں پایا، وہ معصوم تو نہیں تھے، لیکن میں نے ان خصوصیات میں ان کا جیسا آدمی نہیں دیکھا۔

علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابنِ القیم کو متون حدیث ورجال حدیث کی طرف بڑی توجّہ تھی، وہ فقہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۴ ص ۲۳۴

کے مطالعہ میں ہی مشغول رہتے تھے، اور اس کے مسائل کو بڑے شرح وبسط سے لکھتے تھے، نحو کی تدریس اور اصولِ حدیث میں بھی اچھی مہارت تھی۔

زہد وعبادت

حافظ ابنِ رجب کا بیان ہے کہ وہ کثیر العبادت اور بڑے شب بیدار تھے، ان کی نماز بڑی طویل اور پرسکون ہوتی تھی، وہ ہر وقت ذاکر شاغل رہتے تھے، اور ان میں محبتِ الٰہی کا ایک جوش اور انابت کی ایک خاص کیفیت تھی، ان کے چہرے پر بارگاہِ خداوندی کی طرف فقر واحتیاج اور عجز وانکسار کا نور نظر آتا تھا، اس کیفیت میں میں نے ان کو بالکل منفرد پایا، انھوں نے کئی حج کئے، اور عرصہ تک مکہ معظمہ میں قیام کیا، اہلِ مکہ ان کی کثرتِ عبادت اور کثرتِ طواف کے ایسے حالات سناتے ہیں جو موجب حیرت ہیں۔

علامہ ابنِ کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "حافظ ابنِ قیم بڑی محبت کے آدمی تھے، نہ کسی سے حسد رکھتے نہ کسی کو ایذا پہنچاتے، اور نہ کسی میں عیب نکالتے، میں ان کا بڑا رفیق اور محبوب تھا، مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے زمانہ میں دنیا میں ان سے زیادہ کوئی عابد اور کثیر النوافل تھا، وہ نماز بڑی طویل پڑھتے تھے، اور رکوع وسجود بڑا لمبا کرتے تھے، بعض اوقات ان کے احباب ان کو ملامت بھی کرتے، لیکن وہ اس کو ترک نہیں کرتے تھے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے اپنے امور واحوال میں ان کی نظیر کم ہوگی۔"[1]

ابتلاء وآزمائش

اپنے استاذ وشیخ کی طرح وہ بھی ابتلاء وآزمائش اور مجاہدات کی منازل سے گذرے، آخری بار جب ان کے شیخ ابن تیمیہ قلعہ میں قید کئے گئے تو وہ بھی محبوس ہوئے اور ان سے علیحدہ رکھے گئے، شیخ کے انتقال کے بعد ان کی رہائی

---

[1] البدایۃ والنہایہ۔ ج ۱۴ ص ۲۳۴-۲۳۵

ہوئی، اس پوری مدتِ اسارت میں وہ تلاوتِ قرآن اور اس کے معانی و تدبر و تفکر میں مشغول رہے، ابن رجب لکھتے ہیں:۔

ففتح علیہ من ذالک خیر کثیر وحصل لہ جانبٌ	اس سے ان کو بڑا نفع حاصل ہوا، ان کو اذواق و
عظیمٌ من الاذواق والمواجید الصحیحۃ	مواجید صحیحہ کا ایسا حصہ ملا جس سے اہلِ معارف
وتسلّط بسبب ذالک علی الکلام فی علوم	کے علوم اور ان کے غوامض و دقائق کا سمجھنا اور
اھل المعارف والدخول فی غوامضھم	سمجھانا ان کے لئے آسان ہو گیا، ان کی تصنیفات
وتصانیفہ مُمتلئۃ بذالک۔	ان مضامین سے لبریز ہیں۔

ان کے تلامذہ اور معاصرین کا اعتراف

علماء کی ایک بڑی جماعت نے امام ابن تیمیہ کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد ان سے علم حاصل کیا اور استفادہ کیا، فضلائے عصر ان کی بڑی عزت کرتے تھے، اور ان کے تلمذّ کو شرف سمجھتے تھے، ان کے تلامذہ میں ابن عبدالہادی اور ابن رجب جیسے اکابر ہیں، قاضی برہان الدین زرعی کا ان کے متعلق مقولہ ہے کہ "اس وقت آسمان کے نیچے ان سے زیادہ وسیع العلم آدمی نظر نہیں آتا"۔

تدریس و تصنیف

حافظ ابنِ قیم نے عرصہ تک مدرسہ صدریہ میں درس دیا، جوزیہ کی امامت مدّت تک ان کے سپرد رہی، انھوں نے اپنے قلم سے بکثرت کتابیں لکھیں، ابنِ رجب کہتے ہیں کہ ان کو کتابت و مطالعہ و تصنیف اور کتابوں کی خریداری کا بڑا شغف تھا، اس شوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ایک بڑا کتبخانہ جمع کر لیا جس میں بہت سی کتابیں ان کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی تھیں۔

ان کی تصنیفات کی خصوصیت

ان کی تصنیفات حسن ترتیب اور تالیفی سلیقہ میں اپنے شیخ حافظ ابن تیمیہؒ کی تصنیفات سے بھی ممتاز ہیں،

اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں تصوّف کی حلاوت، عبارت کی سلاست اور دل آویزی زیادہ پائی جاتی ہے، یہ غالباً ان کے مزاج کا نتیجہ ہے، جس میں جلال سے زیادہ جمال ہے۔

اہم تصنیفات

ان کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے ان میں سے اہم کتابیں حسب ذیل ہیں "تهذيب سنن ابی داؤد" "مدارج السالكين بين منازل اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (یہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی کی "منازل السائرین" کی شرح ہے اور تصوف وسلوک کی بہترین کتابوں میں ہے) زاد المعاد فی هدی خیر العباد (ہم اس پر مفصل تبصرہ کریں گے) "جلاء الافهام فی الصلوٰة والسلام علی خیر الانام" "اعلام الموقّعين عن رب العالمين" (یہ فقہاء و اہل فتوی وحدیث سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے معلومات کا گرانقدر خزانہ اور ان کی بہترین تصنیفات میں سے ہیں) الكافية الشافية فی الانتصار للفرقة الناجية، الصَّواعق المرسلة على الجهمية والمعطّلة، حادی الارواح الى بلاد الافراح (جنت کے وصف اور حالات میں "اعلام الموقّعین" کے حاشیہ پر) کتاب الداء والدّواء، مفتاح دار السعادة، اجتماع الجيوش الاسلامية على غزو المعطّلة والجهمية، عدّة الصابرين وذخيرة الشاكرين، بدائع الفوائد، الكلم الطّيب والعمل الصّالح، تحفة الودود باحكام المولود، كتاب الروح، شفاء العليل فی مسائل القضاء والقدر والحكمة والتعليل، نفحة الارواح وتحفة الافراح، الفوائد، الطرق الحكمية فی السّياسة الشرعية، الجواب الكافی لمن سأل عن الدواء الشافی، روضة المحبين ونزهة المشتاقين، إغاثة اللهفان فی مكائد الشيطان، طريق الهجرتين وباب السعادتين۔

وفات

۲۳ رجب ۷۵۱ھ میں چہار شنبہ کے دن رات کو انتقال کیا، اگلے روز ظہر کی نماز کے بعد جامع مسجد میں

نماز جنازہ پڑھی گئی، اور الباب الصغیر کے مقبرہ میں دفن ہوئے رَحمہ اللہ ورفع درجاتہ۔

"زاد المعاد"

حافظ ابن قیم کثیر التصانیف علماء میں سے ہیں، کثرتِ تصنیف اور حسنِ تصنیف دونوں ان کی خصوصیات میں سے ہیں، ان کی تصنیفات میں سے متعدد کتابیں اس کی مستحق ہیں کہ ان کا مفصل تعارف کرایا جائے، اور ان کے مضامین اور فوائد کی تلخیص کی جائے، لیکن اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے، اور اس کا صحیح محل حافظ ابن قیمؒ کی مستقل سیرت وسوانح ہے، ان کی تصنیفات میں سے علمی حیثیت سے اعلام الموقعین اور ذوقی واصلاحی لحاظ سے "مدارج السالکین" یا "اغاثۃ اللھفان" اس کی مستحق ہے کہ اس پر اس طرح سے تبصرہ اور اس کا مفصل تعارف کرایا جائے جس طرح ہم نے اس کتاب میں امام ابن تیمیہ کی الجواب الصحیح اور الرد علی المنطقیین کا کیا ہے لیکن ہم یہاں تعارف وتبصرہ کے لئے ان کی جلیل القدر اور شہرۂ آفاق تصنیف زاد المعاد فی ھدی خیر العباد کو منتخب کرتے ہیں، اس لئے کہ ان کی اکثر تصنیفات کی خصوصیات کی جامع اور بہ یک وقت سیرت، حدیث، فقہ، علم کلام اور تصوف واحسان کی کتاب ہے عمل واصلاح کے لئے "احیاء العلوم" کے بعد شاید کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی تحقیق واستناد اور کتاب وسنت سے مطابقت کے لحاظ سے اس کو "احیاء العلوم" پر بھی ترجیح حاصل ہے ...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ایک ایسی کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا ہے، جو بڑی حد تک دینیات کے کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے، اور ایک مربّی، مرشد اور فقیہ ومحدّث کا کام دے سکے، جن لوگوں پر حدیث کا ذوق غالب رہا ہے، اور جن کو سنن وآداب نبوی کے اتباع کی حرص، اور اہتمام رہا ہے، ان کو اس کتاب سے بڑا شغف رہا ہے، اور انھوں نے اس کو اپنا چراغِ راہ، رفیقِ طریق اور زادِ سفر سمجھا ہے[1]، یہ کتاب ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۲۹۸ھ اور مصر سے ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوئی، ہندوستانی اڈیشن بڑے سائز کے

---

[1] مشہور متبع سنت اور متورع عالم مولانا سید عبد اللہ غزنوی کی سیرت میں ہے کہ "زاد المعاد" کی طلب میں دل کے جوش سے زاری کرتے تھے، اور فرماتے تھے، یا ارحم الراحمین "زاد المعاد" کو میری آخرت کا توشہ بنا" (ص ۲۴)

۹۳۷ صفحے اور مصری اڈیشن باریک ٹائپ کے ۹۲۶ صفحات میں ختم ہوا ہے کتاب کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے:-

"یہ چند مضامین ہیں جن کی واقفیت ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جس کو اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی معرفت آپ کی سیرت، اور آپ کے اخلاق و عادات سے واقف ہونے کا ذرا بھی اہتمام ہو، یہ ایسی حالت میں لکھے گئے ہیں کہ دل تھکا ہوا ہے، اور علم کی پونجی قلیل ہے، اس کی تحریر کی نوبت قیام کے بجائے سفر کی حالت میں پیش آئی ایسی حالت میں کہ قلب منتشر و پراگندہ، جمعی مفقود، کتابیں جن سے رجوع کیا جاسکے ناپید، اور ایسے اہل علم جن سے علمی استفادہ و مذاکرہ کیا جاسکے، نایاب ہیں"[1]

مصنف کا یہ بیان اگر کتاب کی ابتداء اور بعض ابواب و فصول کے متعلق ہے تو چنداں موجب حیرت نہیں لیکن اگر پوری کتاب کے متعلق ہے تو یہ نہایت حیرت انگیز بات ہے، اس لئے کہ کتاب میں حدیث کے متون و اسانید اور رجال کی جو مفصل بحثیں سیرت و تاریخ کی جو جزئیات اور مسائل و احکام میں جو محدثانہ و فقیہانہ کلام ہے اس سے ایک عام ناظر بھی اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ کتاب ایک نہایت وسیع و عظیم الشان کتب خانہ میں بیٹھ کر تصنیف کی گئی ہے اگر یہ صحیح ہے کہ ساری کتاب حالت سفر میں لکھی گئی ہے، تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے مصنف کو علوم اسلامیہ بالخصوص حدیث و فقہ پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا، اور علوم دینیہ کا کتب خانہ ان کے سینہ میں محفوظ تھا، اور وہ اپنی قوت حفظ و استحضار میں محدثین متقدمین کی یادگار اور اپنے باکمال و نادرۂ روزگار استاذ کے صحیح جانشین و نمونہ تھے، حافظ ابن قیمؒ نے اس کتاب کے شروع میں بعثت نبوی اور مراتب وحی کی تفصیل بیان کی ہے، مراتب وحی اور انواع وحی کے سلسلہ میں انھوں نے جو استیعاب کیا ہے وہ سیرت کی عام کتابوں میں نہیں ملتا،[2] پھر وہ مدارج بیان کئے ہیں، جن سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام گذری، اسمائے مبارک اور ان کے معانی اور نکات پر انھوں نے حسب معمول وسیع و لطیف بحث کی ہے اس پورے سلسلہ میں اپنی اور اپنے شیخ کی عادت کے مطابق بکثرت

---

[1] زاد المعاد۔ حصہ اول ص۱۵ (نظامی) [2] ایضاً ص۱۸

فقہی ونحوی مسائل ونکات اور بعض وجدانی اور ذوقی مسائل لکھ دیئے ہیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے سیرت کے عام معلومات اور ذاتِ نبویؐ سے تعلق رکھنے والی تفصیلات وجزئیات جمع کردی ہیں، اور اخلاق و شمائل، عادات ومعمولات کا اچھا ذخیرہ جمع کردیا ہے[1]، اس کے بعد انھوں نے آپ کی عبادات ہیئت صلوٰۃ اور اس کے سنن اور عادات کی دقیق تفصیلات پیش کی ہیں، جو ان کے وسیع ودقیق مطالعۂ حدیث کا خلاصہ اور ان کے علم کا نچوڑ ہے، اس سلسلہ میں ان کا محدثانہ رنگ اور محققانہ طرز صاف جھلکتا ہے، اس ضمن میں اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کی بعض نازک بحثیں[2] اور فنِ رجال کی بعض قیمتی معلومات بھی آگئی ہیں[3]، کتاب کے یہ ابواب جو عبادات اور ارکانِ اربعہ سے متعلق ہیں، محض کتاب الاحکام یا فقہ وخلاف کی کتاب بن کر نہیں رہ گئے ہیں، ان میں جابجا مصنف نے بڑے وجد انگیز اور ایمان آفریں ذوقی ووجدانی مضامین اور لطیف علمی نکات شامل کردیئے ہیں، زکوٰۃ وصدقہ کے باب میں انھوں نے لکھا ہے کہ "آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ منشرح الصدر، مطئن النفس اور مسرور القلب تھے، اس لئے کہ صدقہ اور حسن سلوک کو شرحِ صدر کے باب میں بڑا دخل ہے، اللہ تعالےٰ نے نبوت ورسالت اور ان کے خصائص و توابع کے لئے آپ کا سینۂ مبارک پہلے ہی کھول دیا تھا، اور حسّی طور پر آپ کا شرح صدر فرمایا تھا، اور سینۂ مبارک سے شیطان کے حصّہ کو بالکل خارج کردیا تھا، ان اخلاق (سخاوت وبذل وایثار) سے اس شرح صدر میں اور اضافہ ہوا" اس کے بعد وہ تفصیل سے سیرت نبوی پر اس لحاظ سے نظر ڈالتے ہیں، اور شرحِ صدر کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"شرحِ صدر کے بہت سے اسباب ہیں، اور وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بدرجۂ کمال وتمام حاصل تھے، شرح صدر کا سب سے قوی واہم سبب توحید ہے، وہ جس قدر کامل اور قوی ہوگی، اتنی ہی شرحِ صدر زیادہ ہوگا، اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے" أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ

---

[1] زاد المعاد حصہ اول ص۲۵ تا ۴۹ (نظامی) [2] ایضاً ص ۶۹ و ۱۰۵ [3] ایضاً ص ۲۳ و ۹۹

لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ[۱]" (بھلا جس کا سینہ کھول دیا، اللہ نے اسلام کے لئے تو وہ اجالے میں ہے اپنے رب کی طرف سے) نیز ارشاد ہے" فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّہٗ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ[۲]" (سو جس کو چاہے اللہ کہ راہ دے، کھول دے اس کا سینہ فرمانبرداری کے لئے، اور جس کو چاہے کہ راہ سے بھلا دے اس کا سینہ تنگ کر دے، تنگ، بند، گویا زور سے چڑھتا ہے آسمان پر) پس ہدایت اور توحید شرحِ صدر کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے، اور شرک و گمراہی سینہ کی تنگی اور کشمکش اور تکدّر کا بہت بڑا سبب ہے اسی طرح شرحِ صدر کا ایک سبب وہ نور ہے، جو اللہ تعالیٰ بندہ کے دل میں داخل فرما دیتا ہے، اور وہ نور ایمان ہے، جو سینہ کو وسیع اور منشرح اور قلب کو شاداں اور فرحاں رکھتا ہے جب یہ نور بندہ کے دل سے غائب ہو جاتا ہے تو دل میں تنگی اور انقباض پیدا ہو جاتا ہے، اور بندہ کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ ایک تنگ و تاریک قید خانہ میں گرفتار اور ایک تکلیف دہ شکنجہ میں کسا ہوا ہے، ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ" اذا دخل النور القلب انفسح وانشرح قالوا وما علامۃ ذالک یا رسول اللہ قال الانابۃ الی دار الخلود والتجافی عن دار الغرور والاستعداد للموت قبل نزولہ" (جب نور دل میں داخل ہوتا ہے تو دل کھل جاتا ہے، اور منشرح ہو جاتا ہے، صحابۂ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کی علامت کیا ہے، فرمایا دار بقا کی طرف شوق اور کشش اور دار فنا سے بے رغبتی اور وحشت اور موت کی آمد سے پہلے موت کی تیاری) انسان کو جس قدر اس نور کا حصہ ملتا ہے، اسی کے بقدر وہ شرح صدر کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، اسی طرح حسّی نور سے بھی شرح صدر اور حسّی ظلمت سے ضیق صدر اور دل میں تنگی اور انقباض پیدا ہوتا ہے، اور ان ہی اسبابِ شرح صدر میں ایک علم بھی ہے، وہ سینہ کو منشرح اور وسیع کرتا ہے، یہاں تک کہ عالم کا سینہ دنیا سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے اس کے بالمقابل جہل سے دل میں تنگی اور انقباض پیدا ہوتا ہے جس قدر بندہ کا

---

[۱] الزمر-۲۲ [۲] الانعام-۱۲۶

علم وسیع ہوتا ہے، اسی قدر اس کا سینہ فراخ اور قلب منشرح ہوتا ہے، لیکن یہ دولت ہر عالم کے نصیب میں نہیں، یہ صرف اس علم کی خاصیت ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بطریق وراثت چلا آرہا ہے اور وہ علم نافع ہے، جن لوگوں کو یہ علم نافع حاصل ہوتا ہے، وہ سب سے زیادہ منشرح، وسیع القلب، خوش اخلاق اور خوش عیش ہوتے ہیں، ایک سبب انابت الی اللہ ہے، یعنی پورے دل سے اس کے ساتھ محبت کرنا، اس کی طرف توجہ اور رجوع اور اس کی عبادت سے لطف حاصل کرنا، واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی چیز انشراح اور سرور پیدا کرنے والی نہیں، اگر تم کو کبھی یہ دولت نصیب ہو تو تمہاری زبان سے بے اختیار نکل جائے گا کہ اگر جنت میں بھی یہی حالت نصیب ہوئی تو بڑا عیش ہے، محبت کو شرح صدر، اطمینان نفس اور عیش قلبی میں بہت بڑا دخل ہے، اس کا اندازہ اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی اس کا لطف اٹھایا ہو، جس قدر محبت قوی اور شدید ہو گی، سینہ فراخ اور منشرح ہو گا، دل اسی وقت تنگ اور مکدر ہو گا، جب بیکاروں اور اس دولت سے محروم لوگوں پر نظر پڑے گی، ان کی دید آنکھ کی کھٹک اور ان کی صحبت روح کا بخار ہے، اسی کے بالمقابل انقباض و تکدر کا ایک بہت بڑا سبب اللہ تعالےٰ سے اعراض اور اس کی غیر اللہ کے ساتھ گرفتاری اور اسیری اور ذکر اللہ سے غفلت اور ماسوی اللہ سے محبت ہے، اس لئے کہ جس کو جس ماسویٰ سے محبت ہوتی ہے، اسی کے ہاتھوں اس کو دکھ دیا جاتا ہے[1]، اور اس کا دل اس غیر کی محبت میں برابر مقید اور گرفتار رہتا ہے، اور دنیا میں کوئی شخص اس سے زیادہ بدبخت، اس سے زیادہ بدمزہ اور بے لطف، اس سے زیادہ محروم و بے نصیب اور اس سے زیادہ خستہ دل اور تفتہ جگر نہیں ہوتا ہے، حقیقت میں محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک محبت وہ ہے، جو دنیا کی جنت، نفس کا سرور، قلب کی لذت، روح کا عیش، اس کی غذا اور دوا بلکہ اس کی زندگی اور اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اور وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی پورے دل کے ساتھ محبت، میلان و ارادہ کی تمام

---

[1] فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (التوبہ ـ ۵۵)

قوتوں کا اس کی طرف انجذاب اور کشش ہے، اور ایک محبت وہ ہے، جو روح کا عذاب نفس کی کلفت، قلب کا جیل خانہ اور سینہ کی تنگی، اور درد و حرمان، کلفت و تعب کا سبب ہے، اور وہ ماسوی کی محبت ہے، شرحِ صدر کا ایک سبب ہر حالت اور ہر موقع پر دوامِ ذکر ہے، ذکر کو انشراح صدر میں عجیب دخل ہے اور اس سے دل کو عجیب اطمینان و سرور حاصل ہوتا ہے، اسی طرح غفلت کو دل کی تنگی، انقباض، اور کلفت و اذیت میں بڑا دخل ہے، ایک سبب مخلوق پر احسان اور مال وجاہ، بدن، اور انواع احسان سے نفع پہنچانے کی طبیعت ہے کریم اور محسن انسان بڑا منشرح الصدر مطمئن النفس ہوتا ہے اور اس کو بڑا قلبی سرور اور سکون حاصل ہوتا ہے، وہ بخیل جس میں احسان کا مادّہ نہیں ہے بڑا دل تنگ، بدحال، اور مغموم رہتا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے والے صاحبِ ایثار کی مثال دی ہے کہ ایک شخص پر لوہے کی دو زرہیں ہیں، وہ جب صدقہ کا ارادہ کرتا ہے زرہ کھل جاتی ہے اور پھیل جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کپڑے زمین پر لوٹتے ہیں، اور اس کے قدموں کے نشان مٹتے چلے جاتے ہیں، اور بخیل کا حال یہ ہے کہ زرہ کی ہر کڑی اس کے جسم سے چمٹ جاتی ہے، اور اس میں کوئی وسعت و فراخی نہیں پیدا ہوتی، شرحِ صدر کا ایک سبب شجاعت ہے، مردِ شجاع بڑا منشرح الصدر فراخ حوصلہ اور وسیع القلب ہوتا ہے، اس کے بالمقابل بزدل بڑے چھوٹے دل کا ہوتا ہے جس کو فرحت و سرور اور لذّت وعیش میں سے صرف اتنا حصہ ملتا ہے، جتنا حیوانات و بہائم کو نصیب ہے، باقی روحانی سرور و لذّت اور فرحت و مسرت سے بزدل بالکل ہی محروم ہوتا ہے، جیسے ہر بخیل، اللہ سے اعراض کرنے والا، اس کے ذکر سے غافل، اس کی ذات و اسماء و صفات اور اس کے دین سے بے خبر اور ماسوا اللہ کا گرفتار، اس دولت سے بے نصیب رہتا ہے، یہی عیش و سرور قبر میں جا کر باغ و بہار بن جاتا ہے، اور یہی دل تنگی اور انقباض وہاں پہونچ کر عذاب و جیل خانہ کی شکل میں نظر آتا ہے، انسان کا قبر میں وہی حال ہوگا، جو قلب کا سینہ میں یہاں حال ہے، یہاں کا عیش وہاں کا عیش، یہاں کا عذاب اور گرفتاری وہاں کا

عذاب اور گرفتاری، اور یہاں کی آزادی وہاں کی آزادی ہے، باقی عارضی طور پر اہلِ ایمان و یقین کو یہاں (کسی اتفاقی واقعہ یا خارجی سبب، فقر، مخالفت، امراض وغیرہ کی وجہ سے) جو ایک طبعی تکدّر و انقباض حاصل ہوتا ہے، اور اہلِ کفر و غفلت کو (دولت و حکومت اور حیوانی لذّتوں کی وجہ سے) جو وقتی سرور، لطف اور لذت حاصل ہوتی ہے اس کا اعتبار نہیں، اعتبار اس کیفیت کا ہے، جو ملکہ بن جائے اور قلب میں دائمی طور پر پائی جائے، ایک سبب قلب کا ان صفات مذمومہ سے پاک و صاف ہونا ہے جو دل کی تنگی اور قلبی تکلیف کا سبب ہوتی ہے، اور قلب کی شفاء اور عافیت سے مانع ہوتی ہے، انسان اگر شرحِ صدر کے اور اسباب پیدا کرے، اور ان اوصافِ مذمومہ کو قلب سے خارج نہ کرے تو اس کو شرحِ صدر کی دولت کا کوئی بڑا حصہ حاصل نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس کے اندر دو مادّے باقی رہیں گے جو وقتاً فوقتاً اس کے دل پر حملہ کرتے رہیں گے، ایک سبب یہ ہے کہ انسان غیر ضروری چیزوں کا دیکھنا، غیر ضروری کلام، غیر ضروری باتوں کا سننا اور بے فائدہ اور بے مقصد ملنا جلنا، کھانا پینا، سونا چھوڑ دے اس لئے کہ یہ زوائد قلب کے لئے آلام و مصائب بن جاتے ہیں جو اس کو تنگ اور منقبض کر دیتے ہیں، اور دل ان سے تکلیف پاتا ہے، دنیا اور آخرت کے عذاب کا بڑا حصہ انہی چیزوں کا نتیجہ ہے، سبحان اللہ جو شخص ان تمام وادیوں میں سرپٹ دوڑتا ہے، وہ کیسا بدحال، پراگندہ بال اور تنگ دل رہتا ہے، اس کے بالمقابل اس شخص کی خوشحالی اور خوش دلی کا کیا ٹھکانا ہے، جو خصائل محمودہ میں سے ہر خصلت سے متصف اور ان صفاتِ محمودہ کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھے، اسی گروہ کی شان میں "اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ" اور پہلے گروہ کی شان میں "وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ" وارد ہوا ہے، ان دونوں حالتوں کے درمیان بہت سے مراتب اور درجے ہیں، اور ان کے درمیان ایسا تفاوت ہے جس کا صحیح اندازہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس صفت میں جس سے شرحِ صدر، وسعتِ قلب، خنکیٔ چشم اور حیاتِ روح حاصل ہوتی ہے، مخلوقات

خداوندی میں سب سے زیادہ کامل، اور سب سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے، اسی کے ساتھ آپ کو حسی و جسمانی طور پر بھی وہ شرح صدر حاصل تھا جس میں آپ کا کوئی شریک نہیں،[1] مخلوقات میں جو شخص آپ کا جتنا زیادہ پیرو ہوگا، اور اتباعِ نبوی کی جس میں جتنی زیادہ شان نمایاں ہوگی، اتنی ہی زیادہ اس کو شرح صدر، لذت وانبساط کی دولت حاصل ہوگی، آپ[2] شرح صدر، رفع ذکر اور وضعِ وزر کے اعلیٰ ترین مقام اور نقطۂ عروج و کمال پر فائز تھے، آپ کے پیروؤں اور متبعین کو آپ کی پیروی اور اتباع کے بقدر اس دولت سے حصہ ملتا رہے گا۔"[3]

مصنف نے اس کا بھی اہتمام کیا ہے کہ عبادات وارکان واحکام کے مسائل بیان کرنے سے پہلے ان کی حکمت اور ان کے فوائد واسرار بھی بیان کر دیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے جامع اور دلنشین طریقہ پر حکمت تشریع اور ان عبادات وارکان کے حِکَم وفوائد اور ان کی تشریع کی تاریخ بیان کی ہے، اس کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، صوم کے متعلق لکھتے ہیں:-

"صیام (روزہ) سے مقصود نفس کا خواہشات نفسانی سے روکنا اور ان چیزوں سے رکنے کی عادت پیدا کرنا ہے، جن کا انسان خوگر ہے، اور جن سے وہ مانوس ہے، اور اس کی قوتِ شہوانی میں اتنا اعتدال پیدا کر دینا جس سے اس کے اندر ان چیزوں کے حصول کا جذبہ پیدا ہو جو اس کے لئے باعثِ سعادت اور عیشِ جاودانی کا سبب ہیں، اور ان چیزوں کے قبول کرنے کا جن سے اس کی صفائی اور ترقی ہو، اور جن میں اس کی حیات ابدی ہے، نیز بھوک اور پیاس کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرتا ہے، روزہ خالی معدوں کی یاد تازہ کرتا ہے، اور بتلاتا ہے کہ ان مساکین اور فاقہ کشوں پر کیا گزرتی ہے،

---

[1] واضح رہے کہ یہ شرحِ صدر، شقِّ صدر کا ایک لازمی نتیجہ ہے، جس کو تمام محققین اہلِ سنت اور علمائے سیرت تسلیم کرتے ہیں، اور جس کا تذکرہ حافظ ابن قیمؒ نے بھی "زاد المعاد" میں کیا ہے۔ [2] "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝" (کیا ہم نے نہیں کھول دیا، تمہارا سینہ، اور اتار دیا تم سے تمہارا بوجھ جس نے توڑ رکھی تھی پیٹھ تمہاری، اور اونچا کیا مذکور تمہارا) [3] صفحہ ۱۵۸ تا ۱۶۰ حصہ اول (نظامی) ص ۱۵۶-۱۵۵ (میمنیہ مصر)

جن کو معدوں کی آگ بجھانے اور اپنے جگر کو ٹھنڈا کرنے کے لئے سامان نصیب نہیں، روزہ کھانے پینے پر پابندی عائد کرنے اور اس کے استعمال کو محدود کر دینے کے ذریعہ شیطان کو انسان کی زندگی میں تصرّف کرنے اور من مانی کارروائی کرنے سے روک دیتا ہے، اور انسان اس کی برکت سے اپنی طبیعت کا ایسا تابع فرمان نہیں رہ جاتا کہ ہر دم اس کی پیروی کرتا رہے اور اپنے معاش و معاد کا کچھ خیال نہ کرے، وہ ہر عضو انسانی میں سکون پیدا کرتا ہے، بہیمی قوت اور سرکشی سے روکتا ہے، انسانی خواہشات کو لگام دیتا ہے، وہ متقین کی لگام نفس و روح کی معرکہ آرائی میں زرہ، اور سپر اور ابرار و مقربین کی ریاضت ہے، انسان کے تمام اعمال میں وہ ربّ العالمین کا حصۂ خاص ہے، ایک روزہ دار کرتا کیا ہے؟ یہی کہ اپنی خواہش اور اپنا کھانا پینا اپنے معبود کی خاطر چھوڑ دیتا ہے، اس لئے روزہ اللہ کی رضا و محبت اور نفس کے محبوبات اور نفسانی لذتوں کے ترک اور ایک ایثار و قربانی کا نام ہے، اور وہ بندہ اور اللہ کے درمیان ایک راز ہے جس پر کوئی دوسرا مطلع نہیں ہو سکتا، دوسروں کو اس کا تو پتہ چل سکتا ہے کہ روزہ دار نے روزہ توڑنے والی چیزوں کو ترک کر دیا، لیکن یہ کہ روزہ دار نے کھانا پینا، اور اپنی خواہشات اپنے معبود کی خاطر چھوڑی ہیں، یہ ایک قلبی کیفیت ہے، اور بندہ کا ایک راز ہے، جس پر کوئی انسان مطّلع نہیں ہو سکتا، اور یہی صوم کی حقیقت ہے، روزہ کو ظاہری جوارح اور باطنی قویٰ کی حفاظت میں عجیب دخل ہے، روزہ ان "مواد فاسدہ سے ایک پرہیز ہے، جو جب انسان پر پورا قبضہ اور استیلا حاصل کر لیتے ہیں تو اس میں فساد پیدا کر دیتے ہیں، اسی طرح وہ ان مواد ردیہ کو خارج کرتا ہے، جو نفس کی صحت میں مخل ہیں، پس روزہ ایک ہی وقت میں قلب و جوارح کی صحت کی حفاظت بھی کرتا ہے، اور اس کی اس کھوئی ہوئی صحت کو بھی واپس لاتا ہے، جو خواہشات کے انہماک میں ضائع کر دی گئی تھی، اس لئے وہ تقویٰ کا بہت بڑا معاون ہے، اور اسی لئے ارشاد ہے" یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ [1]" (اے ایمان والو حکم ہوا تم پر روزہ کا جیسے حکم ہوا تھا تم سے اگلوں پر

[1] البقرہ۔ ۱۸۳

شاید پرہیزگار بن جاؤ) اور اسی لئے حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الصَّوْمُ جُنَّۃٌ" (روزہ ایک ڈھال ہے) اور اسی لئے آپ نے ایسے شخص کو جس پر جنسی خواہش کا غلبہ ہو، اور اس کو نکاح کی مقدرت نہ ہو روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، روزہ کی مصلحتیں اور فوائد جب ایسے ظاہر و باہر ہیں کہ عقل سلیم اور فطرت مستقیم ان کا بآسانی مشاہدہ و احساس کر سکتی ہے تو اللہ تعالےٰ نے روزہ کو اپنے بندوں کے لئے رحمت و احسان اور ایک پرہیز اور محافظ و پہرے دار کی حیثیت سے مشروع فرمایا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا طریقِ عمل اس کے بارے میں بہترین اور مکمل ترین طریقِ عمل ہے، جو ایک طرف سب سے زیادہ سہل، دوسری طرف حصولِ مقصد کا سب سے بہتر ذریعہ ہے، چونکہ نفوسِ انسانی کا اپنے مالوفات و مرغوبات سے رکنا ایک بڑا دشوار کام ہے، اس لئے اس کی فرضیت میں جلدی نہیں کی گئی، بلکہ ہجرت کے بعد وسطِ اسلام میں اس کی فرضیت نازل ہوئی، جب کہ طبیعتیں توحید و نماز کی خوگر اور احکامِ قرآنی سے بخوبی مانوس ہو گئی تھیں، روزہ کی فرضیت ۲ھ ہجری میں ہوئی، اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں نو ایسے رمضان آئے جن میں آپ نے روزہ رکھا، اور اس کی فرضیت میں بھی تدریج و تیسیر سے کام لیا گیا، پہلے وہ اس طرح فرض ہوا کہ مسلمان کو اس کا اختیار تھا کہ چاہے وہ روزہ رکھے، چاہے ایک مسکین کو کھانا کھلاوے، پھر یہ اختیاری حالت جاتی رہی، اور روزہ قطعی طور پر فرض ہو گیا، اور فدیہ کا حکم صرف ایسے بوڑھے اور عورت کے لئے رہا جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے، یہ دونوں روزہ چھوڑ سکتے ہیں، اور ہر دن کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں[1]، مریض و مسافر کے لئے اس کی اجازت دی گئی کہ روزہ نہ رکھیں اور قضا کر لیں اور حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے بھی رخصت ہے اگر ان کو اپنے یا اپنے بچہ کی جان کا اندیشہ ہو[2]۔"

کتاب کا معرکۃ الآراء حصہ اور مصنف کے علمی تبحر، وسعتِ نظر اور استحضار کا روشن ثبوت حج کا باب ہے،

---

[1] تفصیلات و جزئیات کے لئے ملاحظہ ہوں کتب فقہ۔ [2] ص ۱۶۰-۱۶۱ نظامی

حج اور اس کے متعلقات اور حج نبوی اور اس کے احکام کے متعلق ایسی محققانہ مبسوط بحث اور ایسا بڑا علمی ذخیرہ کسی اور کتاب میں اس کوتاہ نظر کی نظر سے نہیں گزرا، یہ حصہ مصری ایڈیشن کے صفحہ ۱۸۰ سے صفحہ ۲۴۹ تک یعنی ۶۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس سلسلہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کی مفصل کیفیت اور مدینہ کے خروج سے لے کر واپسی تک کی مفصل و مسلسل روداد سفر پیش کردی ہے، اور وہ حدیث کے مختلف ذخیروں کا خلاصہ اور روایات صحیحہ اور جزئیات مختلفہ کا بہترین مجموعہ ہے[1]، اس باب میں انھوں نے حج کے بہت سے اختلافی مباحث اور مختلف فیہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور حدیث کی روشنی میں آزادانہ اور مجتہدانہ فیصلہ کیا ہے، اس میں وہ کسی ایک مذہب فقہی کے پابند نہیں معلوم ہوتے، مثلاً باوجود حنبلی ہونے کے وہ بڑے مدلل طریقہ پر ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نہ مفرد تھے، نہ متمتع، بلکہ قارن تھے[2]، پھر آپ کے حج قران کی کیفیت میں متقدمین ومتاخرین سے جو اختلافات اور اغلاط واقع ہوئے ہیں، ان کی نشاندہی کرتے ہیں، اور ان کا ماخذ اور عذر لکھتے ہیں[3]، نیز اکابر علماء کو حج نبویؐ کے بارے میں زمانہ قدیم وجدید میں جو اوہام پیش آئے ہیں، اور بڑے بڑے محققین وعلمائے متبحرین کو جو غلط فہمیاں واقع ہوئی ہیں، ان کو ظاہر کیا ہے، اور تحقیقی بات لکھی ہے، اس سلسلہ میں تابعین میں سے طاؤس، متقدمین میں سے طبری اور ائمہ متاخرین میں سے قاضی عیاض اور علامہ ابن حزم جیسے اساطین علم، اور مشاہیر رجال کی غلط فہمیوں اور اوہام کو ظاہر کیا ہے[4]، اس سے ان کے رسوخ فی العلم اور حیرت انگیز علمی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ محض حج کا باب اس کتاب کی عظمت اور اس کے مصنف کی امامت اور جلالت قدر کے ثبوت کے لئے کافی ہے، کتاب میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اور اپنے شیخ کے مذاق اور اپنی تحقیق اور وسعت نظر کے مقام کے مطابق کلامی مباحث اور عقائد پر بھی جابجا گفتگو کی ہے اور روح شریعت کی صحیح ترجمانی کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں توکل کی حقیقت اور توسل بالاسباب کے بارہ میں انھوں نے جو محققانہ بحث کی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے[5]۔

۱؎ ملاحظہ ہو ص ۲۲۶ تا ۲۴۶ ج ۱ (نظامی) ۲؎ ص ۱۸۵ تا ۱۹۰ ج ۱ (نظامی) ۳؎ ص ۱۹۸ تا ۲۰۴ ج ۱ (نظامی) ۴؎ ملاحظہ ہو فصل فی الاوہام ص ۲۴۹ تا ۲۵۱ ج ۱ (نظامی) ۵؎ ملاحظہ ہو ص ۲۶۴ تا ۲۶۶ ج ۱ (نظامی)۔

غزواتِ نبوی کا بیان شروع کرنے سے پہلے انھوں نے حقیقت جہاد اور مراتب جہاد پر حسب عادت محققانہ اور عارفانہ کلام کیا ہے[1]، پھر دعوتِ اسلام کی ابتداء، مکہ معظمہ کے حالات اور ہجرت مدینہ اور جہاد کی فرضیت اور جہاد، مال غنیمت، صلح وامان، جزیہ اور معاملہ اہل کتاب و منافقین کے احکام تفصیل سے لکھے ہیں[2]، جہاد کی مشروعیت اور فرضیت کے ذکر کرنے کے موقع پر انھوں نے جنت کی حقیقت اور اس کے مقابلہ میں جان کے بے قیمت ہونے کا تذکرہ بڑے ولولہ انگیز، اور دل آویز طریقہ پر کیا ہے، اور وہ ان کے زورِ تحریر اور قوتِ ایمانی کا بہت اچھا نمونہ ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"محبّت اور جنّت کا مہر یہ ہے کہ نفس و مال کو اس مالک کی راہ میں خرچ کر دیا جائے، جو ان دونوں کو اہلِ ایمان سے خرید چکا ہے، کسی بزدل، نا قدر و معرض تہی دست و بے بضاعت کا کیا جگر و حوصلہ کہ اس سودے کا مول تول کرے، قسم بخدا وہ کوئی ایسا گرا پڑا سودا نہیں کہ مفلس و فقیر اس کا مول تول کرنے لگیں اور نہ اس کی ایسی کساد بازاری ہے کہ تنگ دست اس کو قرض لینے کی خواہش کریں، یہ سودا قدر دانوں کے بازار میں فروخت کے لئے پیش کیا گیا تو مالک جان سے کم قیمت پر اس کو فروخت کرنے پر آمادہ نہیں ہوا، بیکار اور باتیں بنانے والے یہ سن کر پیچھے ہٹ گئے، اور عشّاق یہ دیکھنے کے لئے آگے بڑھے کہ کس کی جان اس کی قیمت ہو سکتی ہے، سودا برابر گردش میں رہا اور آخر کار ان لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر ٹھہر گیا، جو مومنین کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت تھے، جب محبّت کے مدعیوں کی کثرت ہوئی تو دعوی کی صحت پر ان سے دلیل مانگی گئی، اس لئے کہ اگر ہر شخص کا دعوی تسلیم کر لیا جائے تو عاشق و مدعی میں اور غمزدہ اور بہروپیے میں کوئی فرق نہ رہ جائے، مدعیوں نے مختلف قسم کی گواہیاں پیش کیں، کہا گیا کہ یہ دعوی ثبوت کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا" قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[3] (اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو، خدا تمہارا محب بن جائے گا) یہ سن کر سب پیچھے ہٹ گئے، اور وہی لوگ اپنی جگہ پر قائم رہے، جو تمام اقوال و افعال عادات و اخلاق میں رسول کے سچّے پیرو تھے، اب ان سے

---

[1] ص ۲۹۱ تا ۲۹۴ / ۱ [2] ص ۲۹۵ تا ۳۳۲ / ۱ (نظامی) [3] آل عمران - ۳۱

ثبوت کے صحیح ہونے کا مطالبہ کیا گیا اور کہا گیا کہ اس ثبوت کی صحت و عدالت اس وقت تک تسلیم نہیں کی جا سکتی جب تک کہ وہ لوگ اس کا تزکیہ اور تصدیق نہ کریں جن کی شان میں ہے "یُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ" (اللہ کے راستہ میں ہر طرح کی کوششیں کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے) یہ سن کر محبت کے اکثر مدعی پیچھے ہٹ گئے، اور مجاہدین قائم رہے، ان سے کہا گیا کہ عشاق کی جانیں اور ان کے مال ان کی مِلک نہیں پس جس چیز کا سودا ہو گیا اس کو حوالہ کرو "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" (بیشک اللہ تعالیٰ مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید چکا ہے اس قیمت پر کہ ان کو جنت ملے گی) اور جب بائع و مشتری میں بیع و شراء ہو جائے تو ایک کے لئے مال کی سپردگی، اور دوسرے کے لئے قیمت کی حوالگی ضروری ہے، جب تاجروں نے خریدار کی عظمت و قیمت کی مقدار اور جس کے ہاتھ پر یہ سودا ہوا ہے اس کی عظمت و شان اور اس کتاب کی حیثیت دیکھی جس میں کہ اس معاملہ کا ذکر ہے تو سمجھ گئے کہ یہ مال بڑی عظمت و شان والا ہے، اس وقت انھوں نے اس میں بڑا نقصان اور گھاٹا سمجھا کہ اس کو وہ اونے پونے چند ایسے سکوں میں بیچ ڈالیں، جن کی لذت فانی اور جن کی حسرت اور وبال باقی ہے اس لئے ایسا کرنے والا بڑا نادان اور کوتاہ نظر ہے، اس وقت انھوں نے خریدار کے ساتھ اپنی رضا و اختیار سے بغیر ثبوت خیار کے بیعت رضوان کا معاملہ کیا، اور انھوں نے کہا کہ بخدا نہ ہم یہ قیمت واپس لیں گے اور نہ ہم اس سے اس بیع کو فسخ کرنے کی درخواست کریں گے، جب یہ بیع و شرا مکمل ہو گئی اور انھوں نے جنس حوالہ کر دی تو ان سے کہا گیا کہ تمہاری جانیں اور تمہارے مال ہمارے ہو چکے، اور ہم اب ان کو بہت بڑھا کر اور کئی گنا بنا کر تمہاری طرف واپس کرتے ہیں۔

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ"[1] (اور ان لوگوں کو جو اللہ کے راستہ میں مارے گئے، مردہ تصور نہ کرو، وہ تو اپنے رب کے یہاں زندہ ہیں، ان کو

[1] آل عمران - ۱۶۹

رزق دیا جاتا ہے) ہم نے تم سے تمہاری جانیں اور تمہارے مال نفع کی لالچ میں نہیں طلب کئے تھے، بلکہ ہمارے جود و کرم کا اظہار ہو کہ ہم کس طرح عیب دار چیز کو قبول کر کے اس پر بڑی سے بڑی قیمت دیتے ہیں، ہم نے تمہاری قیمت اور مال دونوں جمع کر دیئے اس موقع پر حضرت جابرؓ کا قصہ یاد کرو کہ ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اونٹ خریدا پھر ان کو پوری پوری قیمت دی، اور اس قیمت میں اضافہ کیا پھر وہ اونٹ بھی واپس دے دیا، ان کے والد غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس معاملہ سے ان کی توجہ اس طرف ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کے والد کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا، چنانچہ آنحضرت صؐ نے ان کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا، اور ان سے بلا حجاب گفتگو کی، اور کہا کہ اے میرے بندہ مجھ سے مانگ جو کچھ مانگنا ہے، خدا کے جود و کرم تک انسان کا علم کیا پہونچ سکتا ہے، اس نے مال بھی دیا، قیمت بھی دی، اور اس بیع و شراء کے معاملہ کے تکمیل کی توفیق بھی عطا فرمائی اور اس مال کو اس کے عیب و نقص کے باوجود قبول بھی فرمایا، اس پر بڑی سے بڑی قیمت عطا فرمائی، اور اپنے بندہ کو اس نے اپنے ہی دیئے ہوئے مال سے خرید لیا، اور پھر اس کی تعریف بھی کی، اور باوجود اس کے کہ خود ہی توفیق دی تھی، اس کی مدح فرمائی۔

خدا کے داعی نے خدا کی طرف اور دار السلام (جنت) کی طرف غیرت مندوں اور عالی ہمتوں کو بلایا، اور ایمان کے منادی نے کان رکھنے والوں کو سنایا، اور ہر زندہ ضمیر کو گرمایا جنت کے مسافروں اور رضائے الٰہی کے طالبوں میں ایک صدائے رحیل بلند ہوئی، اور ایک ہنگامۂ رستخیز برپا ہو گیا، اور لوگوں کو منزل پر پہونچے بغیر قرار نہ آیا،[1] اور کیوں نہ ہو؟ شاعر نے کہا ہے ؎

جان کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست

اس نویدِ جانفزا سے سر وبالِ دوش ہے

---

[1] ملاحظہ ہو صـــ۳۱۱ و ۳۱۲ (نظامی)

اس کے بعد انھوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مغازی اور بعوث اور مہمّات ترتیب و تسلسل کے ساتھ پیش کئے ہیں، پھر وہ چونکہ حدیث و سیرت پر بیک وقت نظر رکھتے ہیں، اور مورخ سے زیادہ نقاد و محدّث ہیں، اس لئے ان کی کتاب کا یہ حصہ سیرت کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتا ہے، اختلافی چیزوں میں ان کا قول قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے، ان مغازی اور واقعات کے سلسلہ میں وہ اپنے طرز خاص کے ساتھ آیات کی تفسیر اور ان کے لطائف و اسرار بھی بیان کرتے جاتے ہیں[1]، غزوات کا ذکر کرنے کے بعد ان کا معمول ہے کہ اس غزوہ کے متعلق جتنے فقہی احکام ہوتے ہیں، یا اس سے جو مسائل و احکام استنباط کئے جا سکتے ہیں، ان سب کا تذکرہ کر دیتے ہیں، مثلاً غزوۂ خیبر کے بعد انھوں نے مستقل فصل لکھی "فیما کان فی غزوۃ خیبر من الاحکام الفقہیۃ"[2] غزوۂ فتح کے بعد لکھتے ہیں: "فصل فی اشارۃ الی ما فی ہذہ الغزوۃ من الفقہ واللطائف"[3] غزوۂ حنین و اوطاس کے بعد لکھا ہے "فصل" الی اشارۃ ما تضمّنت ہٰذہِ الغزوۃ من المسائل الفقہیۃ والنکتِ الحکمیۃ"[4] وغیرہ وغیرہ ان میں وہ بہت قیمتی فقہی مواد جمع کر دیتے ہیں۔

ان غزوات و واقعات میں وہ متقدمین اہلِ سیر و مغازی کے مقلّد و ناقلِ محض نہیں ہیں، انھوں نے بعض مواقع پر بعض مشہور باتوں سے اختلاف کیا ہے، اور اپنے ذاتی مطالعہ اور فہم سے اپنی ذاتی تحقیق پیش کی ہے، مثلاً عام طور پر کتب سیر و تاریخ میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اور سمجھا جاتا رہا ہے کہ انصاری بچّیوں اور عورتوں کے خیر مقدمی اشعار

طلع البدرُ علینا — من ثنیاتِ الوداع
وجب الشکر علینا — ما دعا للہ داع
ایّہا المبعوث فینا — جئت بالامر المطاع

اس موقع پر پڑھے گئے تھے، جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں داخل ہو رہے تھے، مگر ان کو اس سے اختلاف ہے، ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اشعار غزوۂ تبوک (جو شام کی جانب ہے)

لہ ص۳۵۲ ج۱ (نظامی) ۲ہ ص۳۹۱ ۳ہ ص۴۰۰ ۴ہ ص۴۳۹

سے واپسی کے موقع پر پڑھے گئے، وہ لکھتے ہیں :۔

وبعض الرواة يهم في هذا ويقول انما كان ذلك عند مقدمه المدينة من مكة وهو وهم ظاهر فان ثنيات الوداع انما هي من ناحية الشام لا يراها القادم من مكة الى المدينة ولا يمر بها الا اذا توجه الى الشام۔[1]	بعض راویوں کو اس بارہ میں غلط فہمی ہوگئی ہے کہ یہ اشعار آپ کے مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ تشریف آوری کے موقع پر پڑھے گئے یہ ایک کھلا ہوا مغالطہ ہے اس لئے کہ ثنیات الوداع شام کی جانب ہے کہ مکہ سے آنے والا اس کو نہیں دیکھ سکتا، اور جب تک کہ شام کی طرف اس کا رخ نہ ہو، وہ ان کے پاس سے نہیں گزرتا۔

غزوۂ تبوک کے بعد بھی انھوں نے اس کے احکام و فوائد تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان میں بہت سی کارآمد باتیں، فقہی معلومات، لطیف استنباطات اور اجتماعی اور تمدنی احکام آگئے ہیں[2] مغازی و بعوث سے فارغ ہو کر انھوں نے وفودِ عرب کی آمد تفصیل سے بیان کی ہے[3]، اور آپ کے وفود و مکاتیب کا تذکرہ کیا ہے، جو آپ نے شاہانِ عالم اور امرائے عرب کو بھیجے تھے[4]۔

کتاب کی جلد ثانی کا ایک بڑا حصہ طبِّ نبوی سے مخصوص ہے اس میں انھوں نے طبِ نبوی کے اسرار و حکم اور ان کی طبّی توجیہات پیش کی ہیں، اس میں احکامِ طبّیہ، احکامِ فقہیہ اور مباحثِ حدیثیہ ساتھ ساتھ ہیں[5]، اس سلسلہ میں انھوں نے ایک بڑی محنت یہ کی ہے کہ حروفِ تہجی کے اعتبار سے ان تمام ادویہ و اغذیہ اور مفردات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، جن کے بارے میں کوئی صحیح یا ضعیف یا موضوع حدیث بیان کی جاتی ہے اور ان پر طبی حیثیت سے کلام کیا ہے اور ان کے خواص بیان کئے ہیں[6]، امراض و معالجات میں جہاں انھوں نے عشق و محبت کے مرض و علاج محبت کی حقیقت اور اس کے طبعی اسباب اس کے اقسام و درجات، پھر اس کے علاج و تدبیر کا تذکرہ کیا ہے وہاں ان کی نفسیات سے گہری واقفیت، زندگی کے وسیع مطالعہ اور امراضِ قلب سے آگاہی کا اندازہ ہوتا ہے[7]، اس طب نبوی

---

[1] ص $\frac{۴۶۶}{۱}$ (نظامی) [2] ملاحظہ ہو فصل فی الاشارۃ الی بعض ما تضمنتہ ہذہ الغزوۃ من الفقہ والفوائد ص ۴۶۹ تا ۴۸۲ (نظامی)

[3] ایضاً ص ۴۸۳ تا ۵۱۸ [4] ایضاً ص ۵۱۸، ص $\frac{۲-۱۴۱}{۲}$ [5] ملاحظہ ہو ص $\frac{۲-۱۴۱}{۲}$ [6] ص $\frac{۹۸}{۲}$ [7] ص $\frac{۹۲-۹۷}{۲}$

کے بارہ میں اگرچہ نکتہ کی بات وہی معلوم ہوتی ہے، جو شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھی ہے کہ "اس کی حیثیت تبلیغی و تشریعی نہیں ہے، اور وہ آپ کے اور اہلِ عرب کے تجارب و عادات پر مبنی ہے"[1]، تاہم ان لوگوں کے لئے جو ہر ارشادِ نبوی کو عظمت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ہر مشورہ پر یقین و محبت کے ساتھ عمل کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، بیش قیمت مواد یکجا جمع ہو گیا ہے۔

اس حصہ سے فارغ ہو کر انھوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں اور آپؐ کے اقضیہ و احکام کی طرف توجہ کی ہے، اس میں مختلف ابواب فقہیہ و معاملات پر ایک بڑا وسیع اور بیش قیمت ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اور گویا فقہ کی ایسی کتاب مرتب کر دی ہے، جو احادیث اور احکام و اقضیۂ نبوی پر مبنی ہے[2]، ان ابواب و فصول کے علاوہ اس کتاب میں بہت سے بیش قیمت تفسیری، نحوی، تاریخی، کلامی لطائف و نکات و تحقیقات ہیں، جو اس ایک ہزار صفحہ کی کتاب میں منتشر و متفرق ہیں۔

اس کتاب کا قابلِ تنقید پہلو صرف یہ ہے کہ اس میں سیرت، حدیث، فقہ، تاریخ، کلام، نحو و صرف اور تقریباً تمام علومِ اسلامیہ مخلوط ہیں، اور غالباً اس کتاب کی تالیف کے وقت ان پر ان کے شیخ کی نسبت غالب تھی، اس لئے وہ ذرا سی مناسبت سے کسی نحوی، کلامی مسئلہ کو چھیڑ دیتے ہیں، اور پھر پورے شرح و بسط کے ساتھ اس پر کلام کرتے ہیں، اگر اس میں سے سیرت و شمائل کو علیحدہ، مغازی و اہم واقعات کو علیحدہ، فقہ و احکام کو علیحدہ اور نحوی مباحث کو علیحدہ درج کر دیا جائے، تو اس سے استفادہ آسان ہو جائے[3]، لیکن اس کے باوجود وہ اسلام کی ان اہم تصنیفات میں سے ہے، جو ایک پورے کتب خانہ کی قائم مقام، اور اس کا وجود ایک متبحر و محقق کثیر الفنون عالم کی موجودگی کے مرادف ہے، اور اس سے ہزاروں طالبینِ راہِ خدا متبعینِ سنت نے دینی رہنمائی اور روحانی غذا اور ایمانی حلاوت پائی۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب بیان اقسام علوم النبی صلے اللہ علیہ وسلم ص ۱۰۲ جلد ا مصری [2] ص ۱۴۲ تا آخر کتاب [3] راقم سطور نے ۱۳۴۷ھ میں مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران میں اس کی تجرید تلخیص کا کام "خیر الزاد" کے نام سے شروع کیا تھا، افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گیا۔

ابن عبدالهادی

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے ان تلامذہ و منتسبین ہیں جن کو حدیث و سنت پر حیرت انگیز عبور تھا' اور جن کی عمر کا بیشتر حصہ علومِ سنت کی اشاعت اور خدمت اور اصلاح و دعوت میں گزرا حافظ ابن قیم کے علاوہ ابنِ عبدالہادی' ابنِ کثیر اور ابنِ رجب خاص امتیاز اور شہرت رکھتے ہیں۔

ابن عبدالہادی نے چالیس[۴۰] سال سے کم عمر پائی، اہلِ سیر و سوانح کا اندازہ ہے کہ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو وہ اکابر اہلِ عصر میں سے ہوتے' اور بڑے بڑوں سے بھی سبقت لے جاتے' صفدی کا قول ہے "لو عاش لکان آیۃً" (اگر زندہ رہتے تو عجائبِ روزگار میں سے ہوتے) علامہ ذہبی نے "معجم" میں ان کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے:-

هُوَ الفقيهُ البارعُ المقرئُ المجوِّدُ المحدِّث	وہ بڑے ماہر فقیہ، بہت اچھے قاری' محدث، حافظ
الحافظ النحوی الحاذق، ذُوالفُنُون	مبصر نحوی، صاحبِ علوم و فنون ہیں، انھوں نے مجھ سے
کتب عنّی واستفدت منہ۔[۱]	حدیث سنی اور کتابت کی اور میں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔

علامۂ وقت ابوالحجاج المزّی کا ان کے متعلق اعتراف ہے:-

ما التقیتُ بہ الا واستفدت منہ۔[۲]	جب کبھی ان سے ملنا ہوتا کوئی نہ کوئی فائدہ حاصل ہوتا۔

---

[۱] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۳۳۲ [۲] ایضاً ج ۳ ص ۳۳۲

یہی الفاظ علّامۂ ذہبی سے بھی منقول ہیں[1] صفدی کہتے ہیں :-

كنتُ اذا لقيتُهُ سألتهُ عن مسائل	میری جب ان سے ملاقات ہوتی تو میں ان سے
ادبية وفوائد عربية	مسائلِ ادبیہ اور عربیت کے متعلق علمی سوالات
فينحدر كالسّيل۔[2]	کرتا اور وہ سیلاب کی طرح رواں ہو جاتے۔

حافظ ابنِ کثیر (صاحبِ تاریخ وتفسیر) ان الفاظ میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں :-

حصّل من العلومِ مالا يبلغهُ الشيوخ	انھوں نے وہ علمی درجہ حاصل کیا جس تک بڑے بڑے
الكبار وتفنن في الحديث والنحو	معمّر علماء واساتذہ عام طور پر نہیں پہونچتے، حدیث
والتصريف والفقه والتفسير والاصلين	نحو، صرف، فقہ، تفسیر، اصولِ فقہ، اصولِ حدیث
والتاريخ والقرءات، ولهٗ مجاميع	تاریخ، قرأت تمام علوم میں ان کو کمال تھا، ان کے
وتاليفُ مفيدةٌ كثيرةٌ وكان	بہت سے مفید مجموعے اور تصنیفات ہیں، وہ اسمائے
حافظاً جيداً لِأسماء الرّجال وطرقِ	رجال وطرقِ حدیث کے بہت اچھے حافظ، جرح
الحديث عارفاً بالجرح والتعديل مُبصّراً	وتعدیل کے فن سے خوب واقف، عِلَلِ حدیث کے
بعلل الحديث حسن الفهم لهٗ جيد	مبصر اور اس کی بہت اچھی سمجھ رکھنے والے تھے
المذاكرة صحيح الذهن مستقيماً على	علماء کے ساتھ بہت اچھے طریقہ پر علمی مذاکرہ
طريقة السّلفِ واتّباع الكتاب والسّنة	کرتے، ذہن نہایت سلیم تھا، طریقۂ سلف پر
مثابراً على فعل الخيرات۔[3]	اللہ تعالےٰ نے ان کو استقامت عطا فرمائی تھی،
	اور کتاب وسنت کے اتّباع کی توفیق دی تھی،
	اعمالِ صالحہ پر صبر وثبات سے قائم رہے۔

---

[1] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۳۳۲ [2] ایضًا [3] البدایۃ والنہایہ ج ۱۴ ص ۲۱۰

مختصر حالات

شمس الدین محمد نام، العماد لقب، ابو عبد اللہ اور ابو العباس کنیت، عام طور پر ابن عبد الہادی کے نام سے مشہور ہیں، سلسلۂ نسب اس طرح ہے، محمد بن احمد بن عبد الہادی بن عبد الحمید بن عبد الہادی ابن یوسف بن محمد بن قدامہ، خاندان کا اصل وطن بیت المقدس تھا، پھر وہ دمشق منتقل ہوا، اور دمشق میں محلہ صالحیہ میں قیام اختیار کیا، جہاں ابن عبد الہادی کی ۷۰۴ھ میں پیدائش ہوئی[۱]، مختلف روایات سے قرآن مجید کی قرآت حاصل کی، حدیث اور درسی کتابوں کا بڑا حصہ قاضی ابو الفضل سلیمان ابن حمزہ ابو بکر بن عبد الدائم، عیسی بن مطعم حجّار، زینب بنت الکمال اور بہت سے اساتذہ اور علماء سے حاصل کیا، حدیث اور فنونِ حدیث سے خاص طور پر اشتغال کیا، اور فنِ رجال اور علل حدیث میں خاص مہارت اور بصیرت پیدا کی، اور مذاہب میں تفقہ حاصل کیا، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ میں بھی دستگاہِ کامل تھی، ابن رجب لکھتے ہیں:۔

ولازم الشیخ تقی الدین ابن تیمیہ مُدّۃ	شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی صحبت میں عرصہ تک
وقرأ علیہ قطعۃ من الاربعین فی	رہے، اور ان سے رازی کی کتاب "الاربعین فی
اُصول الدین للرّازی۔	اصول الدین" کا ایک حصہ پڑھا۔

فقہ میں ان کے خاص استاد شیخ نجم الدین حرّانی تھے، مشہور محدث و عالمِ رجال اور اپنے زمانہ کے عالم حدیث ورجال حافظ ابو الحجّاج المزّی کی صحبت میں دس برس رہے، علامہ ذہبی سے بھی تحصیل علم کی، اور علامۂ موصوف نے رجال و علل اور علوم میں ان کی مہارت اور تفوق کا اعتراف کیا، حسینی کے بیان کے مطابق عرصہ تک مدرسہ صدریہ و ضیائیہ میں درس دیا، اور صدر مدرس رہے[۲]۔

---

[۱] ابن رجب، ابن کثیر میں ۷۰۵ھ سنہ ولادت ہے۔ [۲] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۳۳۲

ان کے معاصر ابن کثیر ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ تین مہینے کے قریب پھوڑے اور سل کے بخار میں بیمار رہے، یہ تکلیف بہت بڑھ گئی، اور اسہال کی شدت ہوئی آخر بدھ کے روز ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷۴۴ھ میں عصر کی اذان سے پہلے انتقال کیا، ابن کثیر کہتے ہیں کہ ان کے والد نے مجھے بتلایا کہ آخری الفاظ جو ان کی زبان پر جاری ہوئے، وہ یہ تھے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِی مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" اگلے روز جمعرات کے دن جامع مظفری میں ان کی نماز جنازہ ہوئی جس میں شہر کے قضاۃ، اعیان و مشاہیر علماء و حکام اور تجار و عوام سب شریک ہوئے، ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

وکانت جنازتہ حافلۃ ملیحۃ علیہا ضوءٌ ونورٌ۔	ان کے جنازہ میں بڑا اژدحام اور ایک خاص طرح کی نورانیت اور رونق تھی۔

روضہ میں السیف بن المجد کے پہلو میں دفن ہوئے[۱]۔

تصنیفات

علامہ ابن عبدالہادی نے کم عمر پانے کے باوجود تصانیف کی ایک بڑی تعداد یادگار چھوڑی جو ضخامت اور صفحات کی تعداد کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہیں، اور حسن تصنیف اور مواد کے لحاظ سے بھی، ان میں سے متعدد کئی کئی جلدوں میں ہیں[۲]، حافظ ابن رجب نے "ذیل طبقات الحنابلہ" میں جن تصانیف کا حوالہ دیا ہے ان میں سے زیادہ اہم تصنیفات کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے "الاحکام الکبریٰ" ۷ جلد "المحرّر فی الاحکام ایک جلد" "کتاب العمدۃ فی الحفاظ" دو جلدیں" "تعلیقۃ للثقات دو جلدیں" "احادیث الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" ایک جلد" "الاعلام فی ذکر مشائخ الائمۃ الاعلام" "اصحاب الکتب الستۃ"

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ص ۲۱ ج ۱۴ [۲] اس بارے میں ان کو ہندوستان کے مشہور و مقبول عالم و مصنف مولانا عبدالحی لکھنوی سے مشابہت ہے جنھوں نے صرف ۳۹ سال عمر پائی اور تصانیف کا ایک بڑا اور مفید ذخیرہ یادگار چھوڑا۔

متعدد اجزاء، ایک ضخیم کتاب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارہ میں' تعلیقۃ علی سنن البیہقی ۲ جلدیں' ترجمۃ الشیخ تقی الدین ابن تیمیہ ایک جلد' منتقی من تہذیب الکمال للمزی پانچ جلدیں' منتخب من مسند الامام احمد ۲ جلدیں' منتخب من البیہقی، منتخب من سنن ابی داؤد، شرح الفیہ لابن مالک ایک جلد' امام ذہبی کی تصانیف پر تنقید و تعقبات متعدد اجزاء' الرد علی ابی حیان النحوی' اس کے علاوہ مختلف تعلیقات اور مختلف احادیث کے بارہ میں مستقل رسائل جن کی فہرست طویل ہے علامہ تقی الدین ابن السبکی نے مسئلہ زیارت پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تردید میں جب "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" کتاب لکھی تو علامہ ابن عبدالہادی نے الصارم المنکی فی الرد علی السبکی کے نام سے اس کا ناقدانہ و محدثانہ جواب لکھا جو ان کی علمی فضیلت اور حدیث و رجال پر وسعتِ نظر کا گواہ ہے۔[1]

---

[1] یہ کتاب پہلی بار ۱۳۱۹ھ ہجری میں مطبع خیریہ مصر میں شائع ہوئی۔
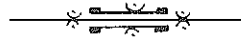
ابن کثیر

عماد الدین اسماعیل بن عمر نام، ابو الفداء کنیت، ابن کثیر کے نام سے شہرت پائی، قیسی الاصل تھے، شہر بُصری (شام) کے نواح میں مَجْدَل گاؤں جہاں ان کے والد خطیب تھے ۷۰۱ھ میں پیدا ہوئے، ۷۰۶ھ میں دمشق اپنے والد کے ساتھ منتقل ہوئے، شیخ برہان الدین الفزاری وغیرہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، ابن السویدی، ابو القاسم بن عساکر اور دوسرے شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت و روایت کی، علامہ مزّی سے تلمذ خاص تھا، اور ان کی دامادی کا شرف بھی حاصل تھا، بکثرت ان سے روایتیں ہیں، فتوی، تدریس مناظرہ سے اشتغال رہا، فقہ، تفسیر، اور نحو میں خاص دستگاہ تھی، رجال و علل حدیث میں نظر وسیع اور دقیق تھی، مدرسۂ ام الصالح میں مدرس رہے، اور علامہ ذہبی کے انتقال کے بعد مدرسہ تنکزیہ میں بھی درس دیا، علامہ ذہبی کے ان کے متعلق الفاظ ہیں:۔

هُوَ فقيهٌ متقنٌ ومحدّثٌ محقّقٌ ومفسّرٌ نقّادٌ ولهٗ تصانيف مُفيدَةٌ۔	وہ پختہ کار فقیہ، محقق محدث اور نقاد مفسر ہیں، اور مفید تصانیف رکھتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:۔

كَانَ كثيرَ الاستحضار وسارت تصانيفه في البلاد في حياته وانتفع بِهٖ الناس	بڑے حاضر العلم، کثیر المحفوظات تھے، ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں ملکوں میں پھیل گئی تھیں، اور لوگوں

بعد وفاتہ۔ نے ان کی وفات کے بعد بھی ان سے فائدہ اٹھایا۔

باوجود شافعی ہونے کے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بڑے گرویدہ اوران کی عظمت وامامت کے قائل تھے ان سے تلمذ بھی ہے ابن حجر کہتے ہیں "اخذ عن ابن تیمیۃ ففتن بحبہ وامتحن بسببہ" "البدایۃ والنہایۃ" میں ان کے حالات وواقعات زندگی بڑی تفصیل اور شغف واہتمام سے لکھے ہیں، اوران کی طرف سے پوری مدافعت کی ہے، ہماری کتاب میں شیخ الاسلام کے حالات وواقعاتِ زندگی کا بڑا حصہ اسی کتاب سے ماخوذ ہے، تصانیف میں سے التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل پانچ جلدوں میں، اور الھدی والسنن فی احادیث المسانید والسنن، تخریج ادلۃ التنبیہ، مسند الشیخین، علوم الحدیث، طبقات الشافعیہ، وغیرہ ان کی تصانیف ہیں، احکام میں ایک مبسوط کتاب لکھنی شروع کی تھی، لیکن مکمل نہیں ہوئی، مسند امام احمدؒ کو حروف پر مرتب کیا، اوراس میں طبرانی اور ابویعلیٰ کے زوائد بھی شامل کردیئے لیکن ان کا اصلی تصنیفی کارنامہ دو کتابیں ہیں، جن کو قبولِ عام حاصل ہوا، اورجن سے علمی حلقوں میں اس وقت تک استفادہ کیا جارہا ہے، ایک ان کی تفسیر جو ان تفاسیر میں جن کی بنیاد منقولات وروایات پر ہے، سب سے زیادہ مقبول اور قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے، علامہ سیوطی اس کے متعلق لکھتے ہیں "لہ التفسیر الذی لم یؤلف مثلہ" اس تفسیر سے پہلے اہلِ منقول نے جو تفاسیر لکھیں، ان میں محدثانہ احتیاط اور احادیث کے صحیح انتخاب کی بڑی کمی، اور ضعیف احادیث واسرائیلیات کی بڑی کثرت تھی، حافظ ابن کثیر ایک پختہ کار محدث تھے انھوں نے محدثانہ طریق پر یہ تفسیر مرتب کی اگرچہ وہ اس میں اس بلند محدثانہ معیار کو پورے طور پر قائم نہیں رکھ سکے جس کی ان سے توقع تھی، اور انھوں نے کسی قدر توسع سے کام لیا، اور اسرائیلیات کے ایک حصہ کو قبول کیا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ تفاسیر میں محدثانہ نقطۂ نظر سے یہ تفسیر سب سے زیادہ قابلِ اعتماد واستفادہ ہے، حال میں مصر کے نامور فاضل ومحقق استاد احمد محمد شاکر نے عمدۃ التفسیر عن الحافظ ابن کثیر کے نام سے اس کا خلاصہ شائع کیا ہے جس میں کتاب کی خصوصیات ومحاسن کو برقرار رکھتے ہوئے ضعیف احادیث

غیر مستند اسرائیلیات، مکرر اقوال، اور اسانید، اور طویل کلامی مباحث، فقہی فروع اور لغوی و لفظی مناقشات کو حذف کردیا ہے۔

ان کی دوسری اہم اور مقبول تصنیف "البدایہ والنہایہ" ہے، جو ۱۳۵۱ھ میں ۱۴ جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے، یہ عرب مورخین کے دستور کے مطابق ابتدائے آفرینش سے ۷۶۷ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، علامہ ابن اثیر کی مشہور و مقبول کتاب "الکامل" ۶۲۸ھ تک کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے، اس لئے اس کتاب میں ۱۳۹ سال کے حالات او تاریخ کا اضافہ ہے، تاتاری حملہ اور آٹھویں صدی کی اہمیت کی وجہ سے یہ زمانہ بڑا اہم اور پراز واقعات ہے، اس وجہ سے بھی اور تاریخی استناد و تفصیل کی وجہ سے بھی یہ کتاب اکثر مورخین کا مرجع و ماخذ ہے، شعبان ۷۷۴ھ میں حافظ ابن کثیر نے وفات پائی اور دمشق کے مشہور مقبرہ الصوفیہ میں دفن ہوئے۔[۱]

---

[۱] ذیل تذکرۃ الحفاظ (حافظ شمس الدین ابوالمحاسن الحسینی) ذیل طبقات الحفاظ (للسیوطی)
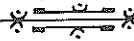
حافظ ابن رجب[1]

مختصر حالات

عبدالرحمٰن نام، والد کا نام احمد بن رجب، سلسلۂ نسب اس طرح ہے، عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب ابن عبدالرحمٰن بن الحسن محمد بن ابی البرکات مسعود، خاندانی وطن بغداد تھا، وہیں ربیع الاول ۷۳۶ھ میں پیدائش ہوئی، ۷۴۴ھ میں اپنے والد کے ساتھ صغر سنی میں دمشق آئے، محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن الخبّاز اور ابراہیم بن العطّار وغیرہ سے حدیث کی سماعت کی، مصر میں ابوالفتح المیدومی، ابوالحرم القلانسی وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ انھوں نے کثرت سے حدیث کی سماعت کی اور حدیث کے ساتھ اشتغال کیا، یہاں تک کہ فن حدیث میں مہارت حاصل کرلی، حافظ ابوالفضل تقی الدین ابن فہد مکی (م ۸۷۱ھ) نے "تذکرۃ الحفاظ" کے ذیل (لحظ الالحاظ) میں ان کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے،

"الامام الحافظ الحجۃ والفقیہ العمدۃ احد العلماء الزہاد والائمۃ العبّاد مفید المحدثین واعظ المسلمین"[2] وہ ان کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "وہ متورع وزاہد پیشوا تھے، اللہ تعالیٰ نے قلوب میں ان کی

---

[1] حافظ ابن رجب اگرچہ براہِ راست شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے شاگرد نہیں ہیں، اور وہ ان کی وفات کے ۸ سال بعد پیدا ہوئے مگر وہ حافظ ابنِ قیم کے شاگرد اور عام طور پر ابن تیمیہ وابن قیم سے متأثر ہیں، اور چند مسائل کے علاوہ عمومی طور پر وہ ان کے ہم مسلک اور ان کے رجال میں سمجھے جاتے ہیں۔ [2] صفحہ ۱۸۰

محبوبیت پیدا کردی تھی، اور تمام جماعتوں کا ان کی صلاح و فضیلت پر اتفاق تھا، ان کی مجالس وعظ عمومی اور بڑی مفید اور نہایت درجہ موثر تھیں[۱]۔ الشہاب بن حجی ان کی علمی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فن حدیث میں بڑے مبصر اور محقق تھے، اپنے معاصرین میں علل حدیث اور طرق حدیث کے سب سے زیادہ واقف تھے، اکثر ہمارے ہم عصر علمائے حنابلہ ان کے شاگرد ہیں"۔

ماہ رجب ۷۹۵ھ میں انتقال ہوا، اور الباب الصغیر دمشق میں دفن ہوئے[۲]۔ انتقال سے چند دن پیشتر ایک گورکن کے پاس آئے اور ایک جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہاں میرے لئے قبر کھودو، گورکن کا بیان ہے کہ میں نے قبر کھودی، وہ اس میں اترے اور لیٹے اور کہا کہ اچھی ہے، چند روز کے بعد ان کا انتقال ہوا، اور اسی میں دفن ہوئے[۳]۔

تصنیفات

تصنیفات میں ترمذی کی شرح اور بخاری کے ایک حصہ کی شرح کی ہے، بخاری کی شرح کا نام انھوں نے "فتح الباری" رکھا تھا، یہ شرح مکمل نہیں ہو سکی، ابن ابی یعلی کی "طبقات الحنابلۃ" کا ذیل لکھا[۴]، ایک کتاب "اللطائف فی وظائف الایام" وعظ کے طریقہ پر ہے، اور فوائد اور قواعد فقہیہ پر مشتمل ہے، امام نووی کی "اربعین" کی شرح کی جس میں بیالیس ۴۲ حدیثیں تھیں، اور آٹھ حدیثوں کا اضافہ کیا، یہ "جامع العلوم والحکم شرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم" کے نام سے ۱۳۴۶ھ میں مصطفیٰ البابی الحلبی کے مطبع سے شائع ہوئی ہے، حدیث "ماذئبان جائعان أرسلا فی غنم الخ" کی مستقل شرح کی ہے، ایک رسالہ "فضل علم السلف علی الخلف" ہے، یہ تینوں موخر الذکر کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں، ان کی تصنیفات میں حافظ ابن قیمؒ کی اصلاحی و

---

[۱] ص ۱۸۱ [۲] حاشیہ لحظ الالحاظ ص ۱۸۱ [۳] الدرر الکامنہ ص ۳۲۲/۲ [۴] ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں قلمی موجود ہے، چند سال ہوئے دمشق سے شائع بھی ہو گیا ہے۔

دعوتی روح وجذبہ اور ان کی تحریر کی حلاوت وسلاست نظر آتی ہے۔

ان تلامذہ وتلامذۂ تلامذہ کے علاوہ آٹھویں اور نویں صدی کے بعض ایسے جلیل القدر علماء، مصنفین اور مصلحین ہیں، جن کے متعلق یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو شیخ الاسلام یا ان کے کسی تلمیذ سے تلمّذ حاصل ہے، مگر ان کی تصنیفات میں واضح طریقہ پر شیخ الاسلام کا فکر، ان کی روح، ان کا علم، اور ان کی دعوت نظر آتی ہے، ان حضرات نے شیخ الاسلام کے تلامذہ یا تصنیفات سے استفادہ کیا ہو یا اس کی نوبت نہ آئی ہو، وہ اتحاد فکر وذوق کے لحاظ سے اسی دبستانِ فکر کے علماء ومصلحین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، ان شخصیتوں میں "الموافقات" کے فاضل مصنف علامہ ابو اسحاق شاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن کی کتاب "الاعتصام" اسی اصلاحی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے جس کی ابتداء اپنے زمانہ میں شیخ الاسلام نے کی، اور جو سنت وبدعت کے موضوع پر سب سے پُر مغز، مکمل، اصولی اور فاضلانہ تصنیف ہے[1]۔

---

[1] صفحات ۶۱۹ مطبوعہ مصر۔
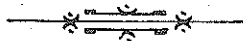
INDEX

اشاریہ

(تاریخ دعوت و عزیمت حصۂ دوم)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

الف

ب ـ پ

طبقات وقبائل ۔ اقوام وخاندان

کتابیات

مقامات

متفرقات

مدارس ومعاہد اور ادارے:

مذاہب وتحریکات ونظریات:

مذہبی و اصطلاحی الفاظ:

مساجد و معابد:

علوم:

مطابع :

جنگ، اہم وتاریخی واقعات وحوادث:

ادوار و عہود اور سلطنتیں:

مشاہد، مزارات و مقابر:

دیگر متفرقات: